MEMOIRS OF GAUR AND PANDUA

کا پہلا سلیس اردو ترجمہ

تذکرہ گور و پنڈوہ

آثار قدیمہ گور و پنڈوہ کی اطلاعات پر ایک شاہکار تحریر

تصنیف: خان صاحب عابد علی خان
تصحیح، ترمیم و اضافہ: ایچ، ای، اسٹیپلٹن ۔ آئی، ای، ایس
ڈائریکٹر آف پبلک انسٹرکشن، بنگال
ترجمہ و تحقیق: میزان الرحمٰن علائی

انتساب

پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام

گر قبول افتد زہے عز و شرف

بندۂ عاصی: میزان الرحمٰن علائی

نذر عقیدت

بصد احترام تمام مخدومانِ گوروپنڈوہ، مادر علمی مخدوم اشرف مشن اور والدین کریمین کے نام

کہ ایں کیمیائے ہستی قارون کند گدارا

بندہ ناچیز: میزان الرحمٰن علائی

شکر شکن شوند همه طوطیان هند
زیں قند پارسی که به بنگاله میرود
(حافظ شیرازی)

دوباتیں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میں مخدوم اشرف مشن، پنڈوہ شریف میں کلام پاک حفظ کرتا تھا۔ بعد نماز عصر ہمیں اجازت ہوتی تھی کہ ہم مخدومانِ پنڈوہ کے آستانوں پر فاتحہ پڑھ آئیں، یوں تھوڑی بہت تفریح بھی ہوجاتی تھی اور اکتسابِ فیوض و برکات کا سنہرا موقع بھی میسر آجاتا تھا۔ ہمارے اساتذہ حافظ علی حسن اور حافظ غلام رضا صاحبان کی جانب سے سخت ہدایات تھیں کہ ہم لوگ احاطہ درگاہ کے جانبِ شمال ایک قدم بھی آگے نہ بڑھائیں کیونکہ اُس طرف اجڑے ہوئے شہر کے سنسان کھنڈرات تھے اور ہم بچے کمسن، بنابریں شاید ہمارے اساتذہ کو یہ ڈر تھا کہ مبادا کہیں کوئی شر پسند ہمیں کسی طرح کی کوئی ایذا نہ پہنچائے، اُن کا یہ ڈر اُن دنوں کے حالات کو دیکھتے ہوئے بے جا بھی نہیں تھا۔ خیر! یہ ایک الگ مدعا ہے، پھر کبھی۔ تو میں یہ عرض کررہا تھا کہ ہمیں آستانہ کی حدبندی سے آگے جانے کی قطعاً اجازت نہ تھی تاہم کبھی کبھی چھٹی کے دنوں میں کسی ذمہ دار شخص کی نگرانی میں ہم لوگ آستانہ سے آگے گول گھر یعنی مقبرہ شاہ جلال الدین یا غیاث الدین، سونا مسجد یعنی مسجد قطب شاہی اور ادینہ مسجد وغیرہ گھومنے جایا کرتے تھے۔ چنانچہ میں جب جب اِن آیات و آثار کی زیارت کیلئے جاتا، نہ جانے کیوں میرا من مچل اٹھتا۔ کچے ذہن کے کچے آنگن میں ہزاروں سوالات پیدا ہوتے۔ سوچتا کہ آخر اتنی بڑی بڑی، اتنی خوبصورت اور اس قدر عالیشان عمارتیں کیسے وجود میں آئی ہونگی؟ انہیں کس نے بنایا ہوگا؟ کب بنایا ہوگا؟ کیسے بنایا ہوگا؟ اور بھی خدا جانے کیا کیا؟؟ ایک دن میرے ایک ہم عمر دوست نے مجھے جانکاری دیتے ہوئے بتایا کہ: میں نے کسی سے سنا ہے کہ ادینہ مسجد کو جنات نے بنایا ہے''۔ ہاں! یہ معقول بات ہے، یہ ہوسکتا ہے، اتنا بڑا کام جنات ہی کرسکتے ہیں، ایک جن کے بارے میں دادا سے سنا تھا کہ وہ الہ دیؔن کے عظیم الشان محل کو مکینوں سمیت ہوا میں اڑا کرلے گیا تھا۔ سو ہو نہ ہو، یہ کام بھی ضرور جنات ہی کا ہوگا۔ انہیں لوگوں نے رات کے وقت ہمارے سوجانے کے بعد اِسے بنایا ہوگا۔ اگر اس طرح کی تعمیرات انسانی بس کا روگ ہوتیں تو ہمارے گاؤں کے مکھیا نے بھی اپنے لئے اسی قسم کا کوئی مکان نہ بنالیا ہوتا؟

آپ ہنس سکتے ہیں ایسی خام خیالیوں پر، لیکن جناب عالی! میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ تاریخ گوروپنڈوہ بالخصوص باقی ماندہ آثار کے تئیں خطے کی اکثریت آج بھی اسی طرح کی خام خیالیوں اور بے سروپا تصورات کی شکار ہے۔ اس لئے خیالات میں ذرا پختگی آجانے کے بعد دل میں یہ خواہش جاگی تھی کہ عظمتِ رفتہ کی ان گنت کہانیاں بیان

کرنے والے اِن آثار کے تبیّں میں صحیح معلومات حاصل کروں لیکن اُن دنوں نہ تو میرے اندر شمسی سراج وغلام حسین کو سمجھنے کی صلاحیت تھی اور نہ ہی الٰہی بخش سے آشنا تھا۔ وہی بات تھی جو بڑے سیانے کہہ گئے ہیں کہ ’’زبان یار من ترکی و من ترکی نمی دانم‘‘۔ پھر ایک مدت کے بعد جب میں اپنے مادرعلمی جامعہ جلالیہ علائیہ اشرفیہ، عرف: مخدوم اشرف مشن پنڈوہ شریف میں تدریسی خدمات انجام دے رہا تھا، ایک دن خان صاحب عابد علی خان مرحوم کے پوتے توفیق احمد خان (عرف صاحب) نے مجھے خان صاحب کی حیات وخدمات کے بارے میں بتایا اور یہ بھی کہ اُن کے گھر میں ’’تاریخ گوروپنڈوہ‘‘ پرخان صاحب کی لکھی ہوئی ایک انگریزی کتاب موجود ہے۔ میں نے کتاب کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو وہ اگلے ہی دن اسے اپنے ساتھ لے کرآئے۔ جب میں نے کتاب کا سرسری طور پر ہی جائزہ لیا تو ماشاء اللہ دل باغ باغ ہوگیا۔ اُسی وقت میں نے تہیہ کرلیا کہ ان شاء اللہ اِس گراں قدر کتاب کوضرور اردو کا جامہ پہناؤں گا، تاکہ اردوداں طبقہ بھی اِس تاریخی نوشتہ سے محروم نہ رہے۔

۲۔ کہتے ہیں کہ ترجمہ تخلیق سے زیادہ ادق اور کٹھن ہوتا ہے، کیوں کہ تخلیق میں نہ تو الفاظ کی قید ہوتی ہے اور نہ ہی تراکیب کی بندش۔ فکر کا کینوس بھی تنگی داماں کا شکوہ نہیں کرتا۔ سوآپ تخلیق میں کلی طور پر اپنی مرضی کے شہنشاہ ہوتے ہیں، جبکہ ترجمہ میں ہرنیا لمحہ ایک نیا سوال کھڑا کرتا ہے۔ زبان، فکر، اسلوب، الفاظ، ترکیب، ادائے مطلب کا انداز، ہر چیز میں آپ مصنف کے تابع ہوتے ہیں۔ شاید اسی لئے مصنف کو اتنا زیادہ نہیں سوچنا پڑتا جتنا کہ مترجم کوسوچنا پڑتا ہے۔ چنانچہ ترجمہ نگاری کی دقتوں اور دشواریوں پر بات کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی رقمطراز ہیں کہ: ترجمے کا کام یقیناً ایک مشکل کام ہے۔ اس میں مترجم مصنف کی شخصیت، فکرواسلوب سے بندھا ہوتا ہے۔ ایک طرف اُس زبان کا کلچر جس کا ترجمہ کیا جارہا ہے، اُسے اپنی طرف کھینچتا ہے اور دوسری طرف اُس زبان کا کلچر، جس میں ترجمہ کیا جارہا ہے ۔ یہ دوئی خودمترجم کی شخصیت کوتوڑ دیتی ہے‘‘۔

کوئی شک نہیں کہ ترجمہ نگاری ہی ایک مشکل ترین فن ہے تاہم مشکلات میں اور اضافہ اُس وقت ہوجاتا ہے جب ترجمہ کسی ایسی زبان سے کیا جارہا ہو جس کی اصطلاحات، تراکیب، محاورے اور طرز اداوغیرہ ترجمہ کی زبان سے یکسر جدا ہوں۔ جیسے اردو اور انگریزی۔ ظاہر ہے کہ انگریزی کی لسانی جہات اور تعبیرات اردو سے کلیۃً الگ ہیں اس لئے بسا اوقات انگریزی کے سیدھے سادھے جملوں کو بھی اردو کا مناسب جامہ پہنانا ایک مشکل ترین مسئلہ بن جاتا ہے۔ چنانچہ جناب عبدالحق صاحب ناظم سررشتہ تالیف وترجمہ، عثمانیہ یونیورسٹی انگریزی اور اردو کے درمیان لسانی مغائرت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: اس میں اور ہماری زبان میں کسی قسم کا کوئی رشتہ یا تعلق نہیں ہے۔ اس کا

طرز بیان، ادائے مطلب کے اسلوب، محاورات وغیرہ بالکل جدا ہیں۔ جو الفاظ اور جملے انگریزی زبان میں بالکل معمولی اور روزمرہ کے استعمال میں آتے ہیں، اُن کا ترجمہ جب ہم اپنی زبان میں کرنے بیٹھتے ہیں تو سخت دشواری پیش آتی ہے، ان تمام دشواریوں پر غالب آنے کے لئے مترجم کو کیسا کچھ خون جگر کھانا نہیں پڑتا۔ ترجمہ کا کام، جیسا کہ عموماً خیال کیا جاتا ہے، کچھ آسان کام نہیں۔ بہت خاک چھاننی پڑتی ہے تب کہیں گوہر مقصود ہاتھ آتا ہے''۔

بے شک بہت خاک چھاننی پڑتی ہے اور اگر مترجم مجھ جیسا بے مایہ ہو تب تو پھر چھاننے کے ساتھ ساتھ شاید کبھی خاک کو پھانکنے کی بھی نوبت آسکتی ہے۔ خیر! میں نے اپنی بساط بھر پوری کوشش کی ہے کہ ترجمہ کے نام پر ترجمانی نہ ہو اور پوری صداقت شعاری و دیانتداری کے ساتھ ترجمے کی امانت کو آپ تک پہنچادوں۔ اب بھلا برا جیسا بھی ہے، آپ کے روبرو ہے۔ ویسے انسان ہوں اور انسان ہونے کے ناطے لغزش قلم کا احتمال تو ہر قدم پر ہے، اس لئے ارباب فکرو دانش سے گزارش ہے کہ اگر کہیں کوئی لغزش یا تساہل نظر آئے تو حرف گیری کی بجائے مجھے آگاہ فرمائیں، میں آپ کا مشکور رہوں گا یا پھر میری پردہ پوشی فرمائیں، اللہ کریم آپ کی پردہ پوشی فرمائے گا۔

۳۔ ۵۹۹ھ مطابق ۱۲۰۲ء میں محمد بختیار خلجی کے آغاز حکومت سے لے کر ۱۱۷۰ھ مطابق ۱۷۵۷ء میں پلاسی کی جنگ تک جنت البلاد بنگال میں ۵۷۱رسالوں تک مسلمانوں کی حکومت رہی۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک طویل مدت ہے اور جب مدت اتنی طویل ہے تو تاریخ بھی طویل ہی ہوگی، بنابریں زیر بحث تحریر کے اندر پوری تاریخ پر تفصیلی نظر تو ایک ناممکن سا امر تھا اسلئے خان صاحب نے تخت نشینان بنگال کے احوال اور اُن کے ادوارِ حکومت کا بہت ہی مختصر طور پر تذکرہ کرتے ہوئے اپنی بیشتر توجہ قدیم آثار و رسوم کی تحقیقات و تفصیلات پر مرکوز رکھی ہے۔ تاہم اس میں بھی کوئی شک نہیں دورِ مابعد میں ۵۷۱رسالوں کے تمام آثار و رسوم کا کلی احاطہ کسی بھی شخص کیلئے ممکن نہیں تھا۔ اس ضمن میں پہلی بات تو یہ ہے کہ قدیم ترین ادوارِ حکومت کی تمام تر تفصیلات بعد کے ادوار میں موجود ہی نہیں رہی ہیں اور تاریخی حوالوں کے نام پر آج جو کچھ موجود ہے وہ فقط چند ٹوٹے پھوٹے کتبات، دو چار انتہائی کمیاب وثائق، اڑتی پھرتی چند مذبذب اطلاعات اور گنتی کے چند کھنڈرات ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان محدود وسائل کے سہارے ۵۷۱رسالوں کی ایک طویل اور پرشکوہ تاریخ کو مرتب کر پانا جوئے شیر نکال پانے کے برابر ہے۔ دوسری بات یہ کہ آثار قدیمہ گوروپنڈوہ کا تحفظ متأخر حاکمان بنگال کا ایک قومی، اصولی اور اخلاقی فریضہ تھا لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ اِن بے پرواصاحبان حکومت نے نہ صرف آبا و اجداد کے آثار کی حفاظت کا کوئی بندوبست نہیں کیا بلکہ الٹے ان آثار کو صفحہ ہستی سے نیست و نابود کرنے کیلئے تمام تر راہیں بھی ہموار کردیں۔ چنانچہ گرانٹ نے اپنی رپورٹ کے صفحہ نمبر ۲۵۸ رمیں لکھا ہے کہ:

"The Nizamat Daftar of Murshidabad received Rs.8,000 annually from the local zamindars as fees for the privilege of demolishing the ruins and stripping from them their highly prized enamelled bricks and besalt stones".

نظامت دفتر مرشد آباد کو مقامی زمینداروں کی طرف سے، اُن کو انہدامِ آثار اور وہاں سے بیش قیمت مینا کردہ اینٹوں اور سنگہائے موسی کو برآمد کرنے کا خصوصی حق عطا کرنے کے بدلے میں فیس کے طور پر، سالانہ ۸۰۰۰/روپے موصول ہوتے تھے۔

اللہ اکبر! آسماں راحق بود گر خون ببارد بر زمین۔ ہوشمند اولاد ہمیشہ یہ کوشش کرتی ہے کہ آباءواجداد کی نشانیوں کو قائم رکھا جائے اور ان کے باقیات کی حفاظت کی جائے، کیونکہ یہی باقیات اور نشانیاں نسل جدید کی معتبر شناخت بھی ہوتی ہیں اور تاریخی عظمتوں کی امین بھی۔ لیکن ہائے رے بدنصیبی! نوابانِ مرشد آباد نے تو اپنے ہی ہاتھوں سے اپنی قومی شناخت کا گلا گھونٹ دیا۔ کتنی شرم کی بات ہے کہ جب برٹش امپائر تاریخ عالم کے افق پر اپنی قومی اور نسلی تفاخر و امتیاز کی ایک نئی داستاں لکھ رہی تھی، اُس وقت مرشد آباد کے یہ نواب زادے اپنے آباواجداد کی عظمتوں کو سر بازار نیلام کر رہے تھے۔ کیا ایسی پست حوصلہ اولاد سے یہ امید کی جا سکتی تھی کہ وہ اپنی قومی اور ملکی عزت و آبرو کی پاسبانی کے فرائض کو پورے طور پر ادا کر پائیگی؟ جواباً مرزا غالب کے لفظوں میں بس یہی کہتے بنتا ہے کہ: رہنے دو غالب کوئی عقل کی بات کرو۔

بہر حال! تجربہ ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ حکمرانوں کا کردار رعایا کیلئے مشعل راہ ہوتا ہے۔ یہ حکمراں طبقہ اپنی صبح وشام کی زندگی میں جو کچھ کرتا ہے اُس کا براہ راست اثر رعایا پر مرتب ہوتا ہے یعنی رعایا بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے حاکموں کی عادات واطوار کو نقل کرنے لگتی ہے۔ یہی کچھ آثار قدیمہ گورو پنڈوہ کے ساتھ بھی پیش آیا۔ جب تخت نشیں حضرات ہی محض چند سکوں کے عوض گورو پنڈوہ کی قدیم عالیشان عمارتوں کے انہدام کا ٹھیکہ دینے لگے تو پھر بھلا عوام کیسے پیچھے رہ جاتی؟ وہ بھی کلہاڑا و پھاوڑا لیکر کود پڑی میدان میں، اور پھر تو باقاعدہ منظّم غارت گری کا ایک طوفان کھڑا ہو گیا۔ گھر بنانا ہے؟ اینٹ پتھر حاضر ہے، آیئے، لیکر جایئے۔ خوبصورت کوٹھیاں تعمیر کرنی ہیں؟ آیئے، قدیم محلوں کو توڑیئے اور ضرورت کے اسباب اٹھالے جایئے۔ مزین فرش بندیاں کرانی ہیں؟ سنگہائے موسی کی یہاں کوئی کمی نہیں ہے۔ تشریف لایئے اور بصد شوق قبول کیجئے۔ تابوت سازی کیلئے سیاہ سنگ مرمر چاہیئے؟ آیئے، شاہانِ گور کی پرانی

قبریں مسمار کیجئے اوران پر پڑی ہوئی سیاہ سنگ مرمر کی مزین ومنقش سلوں کو اپنی تجارت کا حصہ بنایئے۔ گویا۱۸۹۹ء میں برطانوی حکومت کی جانب سے اِس انہدامی عمل پر قدغن لگائے جانے تک دیرینہ آثارورسوم کوتوڑنے اور تعمیراتی اسباب کولوٹ کرلے جانے کا ایک طوفان مچارہا۔ برسات کے موسم میں تو غارتگری کے اس شغل میں ناگہاں اچھال آجاتی تھی۔ چونکہ زمانہ ماضی میں گنگا سمیت کئی بڑی ندیاں اسی خطے سے ہوکر بہتی تھیں سو بڑی بڑی کشتیوں کو ان قدیم عمارتوں تک لانا آسان ہوجاتا تھا، اور اِس طرح آبی گزرگاہوں کے ذریعے یہاں کے مال میٹریل کلکتہ تک لے جائے گئے۔ اِن 'مالِ غنیمت' لوٹنے والوں بلکہ ڈاکوؤں کی غارتگری سے محض وہی عمارتیں خود کو بچانے میں کامیاب ہوپائیں جن پر کسی طرح کا کوئی مذہبی رنگ چڑھا ہوا تھا، مثلاً مساجد، مدارس، مقابر اور درگاہیں وغیرہ۔ بے شک دراندازوں نے اِن آثار کو صرف اِن کی تقدس مآبی ہی کی بنیاد پر چھوڑ دیا تھا، چنانچہ آج گوروپنڈہ کی سرزمینوں پر ''باقیات'' کے نام پر جو کچھ ہے وہ بس یہی چند تقدس مآب یادگاریں ہیں۔

اتنی تفصیلی توضیح کے بعد ماقبل میں پیش کیا گیا ہمارا یہ دعوی خود بخود واضح ہوجاتا ہے کہ ''دورِ مابعد میں ۱۷۵/ سالوں کے تمام آثارورسوم کا کلی احاطہ کسی بھی شخص کیلئے ممکن نہیں'' کیونکہ آج ہمارے سامنے اسلامیانِ بنگال کی تاریخ پر جتنی بھی معروف کتابیں موجود ہیں، لگ بھگ سب کی سب خطے کے زیادہ تر آثار مٹ جانے کے بعد ہی لکھی گئی ہیں (الا ماشاءاللہ) تو چونکہ یہ کتابیں ہی اُس وقت لکھی گئیں جب عظمت رفتہ کے یہ خوبصورت ترین آثار دراندازوں کے ہاتھوں اپنا وجود کھوچکے تھے تو پھر ایسی صورت حال میں ۱۷۵/سالوں کے تمام رسوم وآثار کا کلی احاطہ کسی بھی شخص کے لئے کیونکر ممکن ہوسکتا ہے؟ اسی لئے خان صاحب مرحوم کیلئے بھی اپنی کتاب میں محض انہی آیات وآثار کو زیر بحث لانا ممکن ہو پایا ہے جو اُن کے زمانے تک موجود تھیں۔

۴۔ زیرِنظر ترجمے کا انگریزی متن 'بنگال سیکرٹریٹ بک ڈپو، رائٹرس بلڈنگ، کلکتہ' کی جانب سے آج سے لگ بھگ ۸/دہائیاں قبل شائع ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ متن کی طباعت کو ایک لمبا عرصہ گزر چکا ہے اور شاید اِسی وجہ سے آج یہ کتاب علی العموم کتب خانوں میں دستیاب نہیں ہے۔ تلاش بسیار کے باوجود جب کتاب کی کوئی مطبوعہ کاپی مجھے دستیاب نہ ہوپائی تو میں نے جناب توفیق احمد خان کے پاس موجود مطبوعہ کتاب کی ایک فوٹو کاپی کرالی تھی سو اب میرے پاس فوٹو کاپی ہی ہے۔ کتاب کے دوسرے باب میں خان صاحب نے کچھ قدیم سکوں کے نمونے پیش کئے ہیں۔ بے شک یہ ایک ایسی بات ہے جو کسی بھی تاریخی ورک کی روح کہی جاسکتی ہے، مگر اِسے میری کم مائیگی ہی کہئے کہ میں مطبوعہ کتاب کی فوٹو کاپی میں موجود سکوں کے دھندلے نمونوں کو دیکھ کر اُن پر نقش کئے گئے حروف کو صحیح طرح سے پڑھ نہیں پایا، اس

لئے سکوں پر کندہ شدہ الفاظ اور عبارتوں کے حوالے سے مجھے کلی طور پر سکوں کی تصاویر کے نیچے خان صاحب مرحوم کی جانب سے انگریزی رسم الخط میں پیش کی گئی تفصیلات ہی پر انحصار کرنا پڑا ہے۔

۵۔کتاب میں شامل کتبات کے حوالے سے یہ عرض ہے کہ ایچ،ای،اسٹیپلٹن ڈائریکٹر آف پبلک انسٹرکشن، بنگال کے اس دعوی کے باوجود کہ'' The reproduction of inscriptions are the careful work of the survey of India '' شاید ہی کوئی ایسا کتبہ رہا ہو جس کی نقل آرائی یا کتابت میں عربی زبان وادب کی غلطیاں نہ در آئی ہوں۔ بندۂ ناچیز نے حتی الوسع کتبات کی اصلاح تو کر دی ہے تاہم یہ دعوی ہرگز بھی نہیں کرتا کہ اب ان میں کسی بھی قسم کی کوئی خطا کا امکان نہیں ہے۔ بے شک انسان ہوں اور بیشک تساہل اور خطا میری سرشت میں ہے سو بہت ممکن ہے کہ ہزار احتیاط کے باوجود کسی ایک یا کئی ایک قابلِ اصلاح مقامات پر میری نظر نہ پڑی ہو، ایسی کسی ممکنہ صورت میں حرف گیری کی بجائے براہ راست مجھے آگاہ فرمائیں۔

کتبات کے ترجمے کی بات کی جائے تو جو کتبات قرآنی آیتوں پر مشتمل ہیں، اُن کا ترجمہ میں نے اپنی جانب سے کر دیا ہے اور علاوہ ازیں جو عربی و فارسی کتبات ہیں، اُن کے تراجم بھی بندۂ ہیچ مداں نے خان صاحب یا مسٹر اسٹیپلٹن کے انگریزی تراجم کی پیروی نہ کرتے ہوئے اپنے نجی ذوق کے مطابق پیش کر دیئے ہیں۔

کتبات کے تئیں ایک اہم ترین بات یہ ہے کہ راقم سطور کے خیال میں بنگال کی تاریخ اسلامی پر اسٹڈی کے حوالے سے یہ کتبات کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر پوری محنت اور جدید تحقیقاتی اسلوب کے ساتھ متعدد مقامات پر موجود سارے کتبات کو از سر نو کھنگالا جائے اور ان کی مدد سے ۵۷۱ر سالہ مسلم دور حکومت کی جانچ پڑتال کی جائے تو بہت ممکن ہے کہ وہ تاریخی گوشے جو ہماری تن آسانی اور جمود و تعطل کے باعث اب پردۂ خفا کا حصہ بن چکے ہیں، دوبارہ منصۂ شہود پر آجائیں۔

۶۔ پیش نظر کتاب کے ترجمے کا کام آج سے تقریباً نو سال پہلے میں نے شروع کیا تھا لیکن آٹھ، دس صفحات کا ترجمہ کرنے کے بعد کسی وجہ سے یہ کام رک گیا؛ پھر ۲۰۱۸ء کے اواخر میں ایک عزیز کے یاد دلانے پر دوبارہ ترجمے کا یہ کام شروع کیا اور الحمد للہ کچھ ہی دنوں کے اندر ۵ر جمادی الاول ۱۴۴۰ھ مطابق ۱۲ر جنوری ۲۰۱۹ء کو یہ کام مکمل ہو گیا تاہم طباعت کی جو دقتیں ہر کتاب کو پیش آتی ہیں وہ اس ترجمے کو بھی تاہنوز لاحق ہیں۔ خیر! ترجمے کی کمپوزنگ یوں ہی کافی دنوں سے پڑی تھی کہ میرے چچا سسر حضرت علامہ مفتی محمد امجد حسین سمنانی مدظلہ العالی اور ہم زلف مولانا حیدر علی صاحب کی فرمائش پر آن لائن اشاعت کے لئے ترجمے کی یہ پی ڈی ایف تیار کر دی۔ اگر جماعت اہل سنت کا کوئی فرد

فی سبیل اللہ اس ترجمے کی اشاعت کرنا چاہے تو اسے مکمل اختیار ہے تاہم شرط یہ ہے کہ طباعت معیاری ہو اور نفس ترجمہ میں کسی قسم کی تحریف نہ کی جائے۔

۷۔ نیچے حاشیہ میں بطور تحقیق دو طرح کی تحریریں موجود ہیں۔ایک اسٹیپلٹن کی اور دوسری راقم کی۔دونوں تحاریر کے درمیان امتیاز کے لئے راقم کی ''کاوشوں'' کے آخر میں ''میزان'' اور اسٹیپلٹن کی تحقیقات کے آخر میں ان کا نام درج کر دیا ہے۔

۸۔اصل کتاب میں جا بجا متعدد تاریخی مقامات اور سکوں کی تصاویر پیش کی گئی ہیں۔چوں کہ میرے پاس کتاب کی فوٹو کاپی ہے اس لئے فوٹو کاپی سے جو تصاویر لے کر میں نے متعلقہ مقامات پر سیٹ کی ہیں وہ کچھ خاص صاف نہیں ہیں۔اگر آپ صاف تصاویر چاہتے ہیں تو اصل کتاب کی طرف رجوع کریں۔تاہم یہاں بات بھی یاد رکھیں کہ اصل کتاب میں بھی جو تصاویر پیش کی گئی ہیں وہ کوئی آج کے ڈیجیٹل کیمروں کے ذریعے اتاری گئی تصاویر کی طرح صاف اور دلکش نہیں ہیں۔

والسلام

میزان الرحمٰن علائی

۵/جمادی الاول ۱۴۴۰ھ مطابق ۱۲/جنوری ۲۰۱۹ء

mizanamjadi97@gmail.com

دیباچہ

’’آثارقدیمہ۔۔۔۔۔۔گوروپنڈوہ‘‘ کے شعبہ تحفظ واصلاح میں ایک سرکاری ملازم ہونے کے ناطے میں ایک ایسی کتاب شائع کرنا چاہتا تھا جوعلی وجہ الاختصار اِن آثارقدیمہ کے باب میں تمام ضروری اطلاعات کا احاطہ کرلے اور جوکتاب ماہرین آثارقدیمہ،معزززائرین اور عام قارئین کیلئے یکساں طور پر مفید ہو۔۔۔اب جبکہ کتاب قارئین کی خدمت میں حاضر ہے، میں یہ حقیقت واضح کردینا چاہتا ہوں کہ زیربحث تاریخی ضلع کے ایک علاقائی باشندہ ہونے اور ان آثارقدیمہ میں برسوں اپنے فرائض منصبی ادا کرنے کے نتیجے میں جو مخصوص سہولتیں مجھے حاصل تھیں وہ شاید کسی اور کے لئے ممکن نہ ہو پاتیں، کیونکہ یہ سارا مواد میں نے محض کتابوں اور حکومت کی جانب سے نشر کی گئی اطلاعات ہی سے حاصل نہیں کیا ہے بلکہ اس مواد کا ایک اہم ترین ماخذ وہ علاقائی لوگ بھی ہیں جن کو میں اپنے بچپن ہی سے جانتا تھا۔ خوشی ہے کہ اِن کرم فرماؤں نے خوشی بخوشی اپنی قیمتی معلومات مجھ تک بہم پہنچائیں۔

اس کتاب کی تالیف کا میرا اولین مقصد یہ ہے کہ میں مختصر طور پر اِن آثارقدیمہ کے موجودہ بنیادی خط وخال اور تاریخ کوعیاں کردوں تاکہ زائرین کیلئے اِن آثار کے حقائق تک پہنچنے کا ایک آسان ذریعہ مہیا ہوجائے۔

فروری ۱۹۰۲ء میں جب گورنر جنرل آف انڈیا لارڈ کرزن مالدہ دورے پر آئے تو اُس وقت گوروپنڈوہ کے آثارقدیمہ کی زیارت کے دوران بڑی عجلت کے ساتھ پیش نظر تالیف کی ایک ٹائپ شدہ کاپی تیار کرکے لارڈ کرزن کے سامنے پیش کردی گئی،اس طرح ۱۹۰۲ء میں وائسرائے کے دورۂ مالدہ کے موقع پر کتاب کا پہلا ڈرافٹ تیار ہوا۔ عالی جاہ نے کافی انہماک کے ساتھ کاپی کوملاحظہ فرمایا اور اس طرح سے انہوں نے عملی طور پر میری حوصلہ افزائی بھی فرمائی، چنانچہ آگے چل کر میں نے ٹائپ شدہ کاپی کی نظرثانی کی اور قدرے ترمیم واضافے کے بعد ۱۹۱۲ء میں ایک کتابچہ کی شکل میں یہ کاپی شائع کردی۔۔۔۔۔ابھی، اِس وقت ایک بار اور تالیف کی نظرثانی کی، اور اب کی بار مزید نفع بخش الحاقات اور تشریحات کے ساتھ یہ کتاب مقامی حکومت کے تعاون سے شائع کی جارہی ہے۔امید ہے کہ یہ ایڈیشن شائقین کے معیارشوق پر کھرا اترے گا۔

کتاب چار ابواب پر منقسم ہے۔۔۔پہلا باب تعارفی ہے۔دوسرا باب شاہانِ گوروپنڈوہ کی مختصر اسرگزشت پیش کرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان فرمارواؤں کے عہدحکومت میں رونما ہونے والے اہم حالات اور واقعات کو بھی بیان کرتا ہے جبکہ خصوصی طور پر آثارقدیمہ اور دیگر اہم ترین مقامات کے بارے میں شرح وبسط کے ساتھ آخر کے دونوں بابوں میں گفتگو کی گئی ہے۔

میں تہ دل سے شکر گزار ہوں اُن مصنفین کا جن کے علمی کاموں کی طرف میں نے بار بار رجوع کیا اوران کے اقتباسات اپنی اس تالیف میں بکثرت درج کئے۔ بالخصوص آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا رپورٹ، ج: ۱۵، از: میجر جنرل کیوننگھم اور ''گور-ایر-اتہاس'' از: میرے دیرینہ رفیق، متوفی بابوراجانی کانتہ چکرورتی، پنڈت: ضلع اسکول مالدہ، پر کافی زیادہ انحصار کیا۔ میں دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتا ہوں متوفی ڈاکٹر ڈی، بی اِسپونر، شعبہ آثار قدیمہ کا بھی، جنہوں نے نومبر ۱۹۱۶ء میں قدیم آثار، گوروپنڈوہ کی وزٹنگ کے دوران کتاب کے قلمی نسخے کو جانچا اور کچھ تفصیلات کی تصحیح بھی فرمائی۔

ایک بات اور، وہ یہ کہ شائقین کی دلچسپی کیلئے ضمیمے میں گوروپنڈوہ کی تاریخی اطلاعات پر مشتمل کتابوں کی ایک فہرست دے دی گئی ہے، آپ اسے وہاں دیکھ سکتے ہیں اور ساتھ ہی ایک تاریخ وار ٹیبل بھی دیا گیا ہے جس میں دہلی اور بنگال کے بادشاہوں کے نام درج ہیں۔

ایم، عابد علی خان (یوسف زئی)

انگریز آباد، مالدہ

بتاریخ: ۲۵/اکتوبر ۱۹۲۴ء

پیش لفظ

گوروپنڈوہ کی اس تاریخی سرگزشت پر، جوان قدیم دارالحکومتوں کے باقی ماندہ آثاراور کتبات سے عبارت ہے، پیش لفظ لکھتے ہوئے سب سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کی تاریخی جانچ پڑتال کے حوالے سے ایک مختصر سا بیانیہ پیش کردیا جائے۔۔۔ ۱۹۰۲ء میں جب لارڈ کرزن نے اپنے ''تحفظ آثارقدیمہ منصوبہ'' کے تحت ضلع مالدہ کا دورہ کیا تو اُس وقت کتاب کے مصنف، جو شعبہ تعمیرات عامہ (P.W.D) کے ایک کارپرداز افسر تھے، نے وائسرائے آف انڈیا کے لئے یہاں کے آثارقدیمہ کی تاریخی سرگزشت پرایک تشریحی نوٹ تحریر کیا جس کے صلے میں مقامی حکومت نے ۱۹۰۳ء سے پہلے ہی انہیں سوروپے کا ایک انعام عطا کیا اور ساتھ ہی یہ ذمہ داری بھی قبول کر لی کہ ٹائپ شدہ کاپی کی نظرثانی کے بعد مقامی حکومت ہی اسے اپنے اخراجات پر شائع کرے گی۔اب اِس موڑ پر معتبر مآخذ اور مراجع کے بغیر نظرثانی کے عمل کو انجام تک پہنچا پانا مصنف کے لئے ایک مشکل مسئلہ بن گیا، تاہم ارکان شعبہ آثار قدیمہ کی دوستانہ رہنمائی اور تعاون سے یہ کام اپنے انجام تک پہنچ گیا اور ۱۹۲۶ء تک کتاب ایک ضخیم شکل میں تیار ہوگئی۔اِس طرح مزید تشریحات اور اطلاعات کے ساتھ آخرکار مصنف نے منظوری کے لئے اپنی کتاب کو حکومت کے پاس جمع کردیا۔

ایک طویل عرصہ گزرجانے کے بعد جبکہ اصلی مراسلات بھی ضائع ہوچکے تھے اور تاہنوز کتاب کی موصولہ نظرثانی کردہ کاپی کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ بھی نہیں لیا گیا تھا، ایک دن حکومت کو یہ اطلاع ملی کہ ۱۴رنومبر ۱۹۲۶ء کو مصنف کا انتقال ہوگیا ہے۔۔۔اب، جب اس نظرثانی کردہ ڈرافٹ کی باریکی کے ساتھ جانچ پڑتال کی گئی تو پتہ یہ چلا کہ اِس میں ابھی بھی مزید نظر کئے جانے کی شدید ضرورت ہے۔چنانچہ ۱۹۲۸ء کے آخر میں مجھ سے یہ درخواست کی گئی کہ میں مسودہ کو بہتر بنانے کے لئے اس میں تمام طرح کی اضافی تجاویز کو روا رکھوں اور پھر تصحیح شدہ کاپی کو پریس کے حوالے کردوں۔

اس خصوص میں مصنف کے بیانات کی چھان بین کرتے ہوئے ۱۹۲۹ء میں، میں نے ایک بار پھر مالدہ کا دورہ کیا۔اس موقع پر ٹائپ شدہ نسخہ کی جانچ پڑتال نے اس بات کو یقینی بنا دیا کہ کتاب کی نظرثانی، بالخصوص مصنف کے پیش کئے گئے حوالات کی تصحیح اور غیرضروری تکرار کے اخراج کی شدید ضرورت ہے۔۔۔ چنانچہ تصحیح و تنقیح کا یہ عمل تین مرحلوں میں انجام پذیر ہوا، دوبار ٹائپ اسکرپٹ میں اور ایک بار گیلی پروف میں۔اِس طرح نتیجے کے طور پر جو کتاب

آپ کے سامنے ہے، وہ اُس کتاب سے بڑی حد تک مختلف ہے جو ۱۹۲۵ء میں حکومت کی تحویل میں جمع کی گئی تھی۔

کتاب کا آخری باب، اسی طرح پنڈوہ والا حصہ بھی یا تو مکرر تھا یا غیر ضروری طور پر پھیلا ہوا۔۔۔ بہر دو صورت، مصنف کی وفات کے بعد تازہ امور کے سامنے آجانے کی وجہ سے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ مرحوم خان صاحب نے جس طریقے پر اپنی کتاب کو پیش کیا ہے، اب اُس سے زیادہ عمدہ اور بہتر طریقے پر پیش کیا جائے۔ چنانچہ اس ضمن میں پہلے کے دونوں ابواب میں قابل لحاظ ترمیمات بھی کی گئیں، کیونکہ اِن ترمیمات کے بغیر اسے قبول کیا جانا بہر حال ناممکن تھا۔۔۔ خواہ اِکدالا اور نادیہ کے محل وقوع کے حوالے سے خان صاحب کا اپنا اخذ کیا ہوا نتیجہ ہو (جسے انہوں نے گور کے ساتھ نشاندہی کی ہے) یا پھر ۱۴۱۵ عیسوی کے قریب تاریخ بنگال کے دور شاہی کے تئیں ان کی اپنی تفہیمات کا خلاصہ، جس کے مطابق اُس زمانے میں راجہ کانس کے راج گھرانے کا کوئی فرد ایک مختصر مدت کے لئے بنگال کے پایہ تخت پر براجمان ہوا تھا۔۔۔۔ تاہم کتاب کا اوریجنل فریم ورک بدستور اپنی جگہ پر قائم ہے، کیونکہ ظاہر ہے کہ محض تصحیح و تنقیح اور جزئی ترمیم واضافہ کے ذریعے کسی بھی کتاب کے ڈرافٹ کو مکمل طور پر نہیں بدلا جاسکتا۔۔۔۔ کتابیات کی جو فہرست مصنف نے کتاب کے آخر میں مہیا کرائی تھی، اس میں البتہ خاطر خواہ اضافہ کر دیا گیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ جغرافیائی اطلاعات پر مشتمل کتبات بھی شامل کر دیئے گئے ہیں۔۔ وہ مقامات جن کا ذکر کتاب میں کیا گیا ہے، دو دو بار وہاں جا کر تصدیق وتفتیش کی گئی ہے۔۔۔ اس طرح اب یہ امید کی جارہی ہے کہ یہ کتاب اپنی حتمی شکل میں تاریخی اور جغرافیائی اطلاعات کے اعتبار سے بلاشبہ معتبر ومستند قرار دی جائیگی۔

(۲) مصنف کے فائنل ڈرافٹ میں ضمیمہ کے طور پر ان کی ایک آٹو بیا گرافی بھی پائی گئی تھی، لھٰذا اب اُن کی ناوقت موت کے پیش نظر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مندرجہ ذیل اقتباس کو اِس ''تعارف'' میں شامل کر لیا جائے۔

خان صاحب لکھتے ہیں کہ: میں ۱۸۷۲ء میں آڑھی ڈانگا گاؤں میں پیدا ہوا۔ یہ آڑھی ڈانگا گاؤں، ہیڈ کوارٹر، ضلع مالدہ کے شمال مغربی حصے میں تقریباً سولہ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ میرے والد کا نام حاجی تراب خان (مرحوم) ہے۔ وہ ضلع مالدہ کے ایسے پہلے مسلمان تھے جس نے اپنے بیٹوں کو انگریزی میں تعلیم دلائی۔ میں نے بچپن میں سب سے پہلے اپنے گاؤں ہی کے اسکول میں علاقائی زبان میں ابتدائی تعلیم حاصل کی، پھر اس کے بعد ترتیب وار ضلع اسکول، مالدہ اور کلکتہ مدرسہ میں انگریزی تعلیم سے خود کو آراستہ کیا۔ انجینئرنگ لائن میں بہار اسکول آف انجینئرنگ، بانکی پور اور سیب پور کالج سے ٹریننگ حاصل کی۔ اس کے بعد تقریباً پانچ سال تک ''انڈین محمڈن ٹریڈنگ کمپنی'' بانکی پور میں بحثیت منیجر ملازمت بھی کی۔

میں پی، ڈبلیو، ڈی میں ۱۸۹۹ء میں داخل ہوااور مجھے گوروپنڈوہ کے آثارقدیمہ کی خصوصی اصلاح کی ذمہ داری سونپی گئی۔ اُس وقت میں، مجھے سونپی گئی ذمہ داری کو بخوبی نبھانے کے علاوہ، ڈپارٹمنٹ کے دیگر کاموں میں بھی ہاتھ بٹایا کرتا تھا، سومیرے کام کی ستائش کرتے ہوئے ۱۹۱۷ء میں حکومت نے خوش ہوکر مجھے ''خان صاحب'' کا معزز لقب عطا کیا۔

نسبی طور پر میرا تعلق گور کے پٹھان حکمرانوں کے ایک قدیم کنبے سے ہے۔ میرے آباءواجداد سلطان فیروز شاہ کے ساتھ دہلی سے گور آ کر آباد ہوئے تھے، لیکن جب آگے چل کر مغل فرمارواؤں کے بحال کردہ گورنروں نے میرے آباواجداد کو ہراساں کرنا شروع کیا اور نتیجے کے طور پر خطے میں اُن کی تعداد آئے دن گھٹتی گئی تو خاندان کے باقی ماندہ لوگوں نے اپنے لئے ایک محفوظ پناگاہ کے طور پر بسان کوٹ، چرخی اور بٹنہ کے درمیان ایک ''ہائی لینڈ'' کو منتخب کیا، تاہم شومئی قسمت سے کچھ ہی دنوں کے بعد یہ جگہ جنگلات اور آلودگیوں کا مرکز بن گئی۔ اس لئے خاندان والوں نے وہاں سے نقل مکانی کر کے آڑھی ڈانگا میں اپنا مسکن بنالیا۔۔۔۔۔لگ بھگ گزشتہ تیس برسوں سے میں اور میرے دو بھائی انگلش بازار میں آباد ہیں، اور سب سے بڑے بھائی خان صاحب، عبدالعزیز خان بی، ایل نے انگلش بازار میونسپلٹی کے چیئرمین کی حیثیت سے کئی سالوں تک گرانقدر خدمات بھی انجام دی ہے۔۔۔۔۔ہم لوگ ''پٹھان قبیلے'' کی ''یوسف زئی'' شاخ سے تعلق رکھتے ہیں، ہمارے گھربار اور پاس پڑوس میں بولی جانے والی زبان اردو ہے، ہماری طرز تکلم اور لسانی تعبیرات بڑی حد تک دہلی کی موجودہ لسانی جہات سے ہم آہنگ ہیں۔ شادی بیاہ کی رسوم وروایات بھی دہلی کے شاہی گھرانہ کی ریت رواج کے ساتھ بعض حد تک میل کھاتی ہیں۔

آثارقدیمہ، گوروپنڈوہ پر میرے تحریری ورک کے علاوہ مسلم نوجوانوں کی رہنمائی وافادہ کے لئے مندرجہ ذیل کتابیں بھی میری نوک قلم سے نکل چکی ہیں اور اِن ساری کتابوں کی مارکیٹ میں زبردست مانگ ہے۔ نیچے دی گئی فہرست میں موجود پہلے، تیسرے اور چوتھے نمبر کی کتابیں بہار اور آسام کی ''ٹیکسٹ بک کمیٹی'' سے بھی منظور شدہ ہیں۔ ''پریئر بک فار مسلمس'' کی تو بیرون ممالک مثلاً ترینی داد، سیرالیون، سنگاپور، ہانک کانگ اور سیلون وغیرہ میں بھی بڑی ڈیمانڈ چل رہی ہے:۔

(۱) پریئر بک فار مسلمس (انگریزی اور عربی)۔ (۲) گلشن ہند (ایک شعری مجموعہ۔ اردو اور فارسی)۔ (۳) مبتدیوں کے لئے اردو کی پہلی کتاب۔ (۴) مبتدیوں کے لئے بنگلہ کی پہلی کتاب۔

(۳) ایک اہم بات، جس کی طرف اِس نوعیت کی ایک تاریخی سرگزشت کے ''تعارف'' میں اشارہ کیا جانا انتہائی

ضروری ہے، وہ گور و پنڈوہ کے قدیم پایائے تخت کے ذریعے پیش کیا گیا جغرافیائی مسئلہ ہے۔مصنف کی وفات کے بعد ایروپلین فوٹوگرافس کے استعمال نے آج اس بات کو اچھی طرح منکشف کر دیا ہے کہ شہر پنڈوہ اپنی تاریخ کے ابتدائی مرحلے میں شہر گور کی بنسبت رقبہ کے لحاظ سے کسی بھی طرح کم نہ تھا، کیونکہ ایروپلین فوٹوگرافس میں شہری حدبندی کے خطوط ہر چہار جانب پانچ پانچ میلوں پر پھیلے ہوئے صاف طور پر دیکھے جاسکتے ہیں،اور ساتھ ہی ''ادینہ مسجد'' کے جنوب مشرقی حصے میں کافی بڑا اندرونی قلعہ بھی دیکھا جا سکتا ہے۔۔۔۔حدبندی کے اندر موجود تمام وسیع تر جھیلیں شمال اور جنوب میں بہہ رہی ہیں،اس لئے غالب گمان یہ ہے کہ ایک انتہائی قدیم شہر ہونے کے بارے میں پندوہ کی مقامی روایات نہ صرف یہ کہ صحیح ہیں بلکہ اِس سابق ہندو دارالحکومت کی پامالی کے بعد یہیں سے گور کی عمارتوں اور مسلم دور حکمرانی کی تعمیرات کے لئے خشت وسنگ بھی حاصل کئے گئے تھے۔۔۔۔ابھی تو خیر اس طرح کے ایک عظیم الشان ہندو پایہ تخت کے جزئیات پر بھی بحث کی جانی ہے تاہم، جیسا کہ بہت جلد اشارہ کیا جائیگا، زیر نظر دونوں قدیم شہر گور و پنڈوہ کے قیام ومحل وقوع کے حوالے سے پیدا شدہ جغرافیائی مسئلے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ گنگا اور بعض دوسری ندیوں کی آبی گزرگاہیں، جن کے کنارے یہ دونوں شہر آباد ہوا کرتے تھے، برابر بدلتی رہی ہیں۔۔۔۔۔یہ ندیاں بنگال کے اِس حصے میں اب تک موجود ہیں۔

متعلقہ نقشہ جات کو دیکھتے ہوئے اس سلسلے میں چار ندیاں شمار کی جاسکتی ہیں جن میں سے تین ندیاں مغرب سے بہتی ہیں اور ایک شمال سے۔(۱) گنگا۔(۲) کالندری: جس کے قدیم تلے پر، گور کے سابق محل وقوع کے جنوب مغربی حصے میں، کئی میل کے فاصلے پر، اب انگلش بازار آباد ہے۔(۳) بھاگیرتھی: یہ ندی گور کے مغربی حصے میں اب ایک چھوٹے سے نالے کی شکل میں بہہ رہی ہے۔(۴) مہانندا: یہ ندی اب اولڈ مالدہ جنکشن کے نزدیک، انگلش بازار کے شمالی حصے میں چار میل کے فاصلے پر کالندری کے ساتھ آکر متصل ہوجاتی ہے، اور پنڈوہ یہاں سے شمال کی طرف ۸رمیل کی دوری پر واقع ہے۔

یہ جو کہا جاتا ہے کہ: کالندری اور بھاگیرتھی دونوں ندیاں گنگا کے سابق تلوں پر بہہ رہی ہیں، کالندری گنگا کے وہ والے تلے پر بہہ رہی ہے جب گنگا گور کے موجودہ محل وقوع کے مشرق اور شمال میں بہا کرتی تھی اور بھاگیرتھی گنگا کے اُس تلے کی نمائندہ ہے جب گنگا نے آگے چل کر اپنے بہاؤ کا راستہ مغرب اور جنوب کی طرف موڑ لیا تھا'' یہ بیانات محل نظر ہیں۔کیونکہ غالبِ گمان یہ ہے کہ قدیم وقتوں میں گنگا صرف خطے کے شمالی اطراف میں بہتی تھی اور۔۔۔۔ویسے اشارتی اطلاع کے طور پر ادینہ مسجد کے جنوب مغربی حصے میں واقع 'مورالی گھاٹ' نامی گاؤں کا ''نام'' پیش کیا جاسکتا

ہے۔۔۔۔پنڈوہ کا قدیم شہر اِسی بہتی گنگا کے شمالی کنارے پر واقع ہوا کرتا تھا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گنگا اُن دنوں پنڈوہ کے قریب سے گزرتے ہوئے راج شاہی ڈویژن کے موجودہ پورے جنوبی حصے کو، اسی طرح ڈھاکہ اور سنارگاؤں کی طرف بہنے والی ''اترائی ندی'' کے حالیہ جنوبی تلے کو بھی، محیط ہوتی تھی؛ نتیجے کے طور پر شمالی اور مشرقی بنگال کی سرخ سیلابی مٹیاں گنگا کے شمالی حصے میں آکر جمع ہو جاتی تھیں۔[1] مہانندا آج ہی کی طرح اُس وقت بھی پنڈوہ کے مغربی حصے کے نزدیک سے ہو کر گزرتی تھی، اس طرح تاریخ کا یہ عظیم ترین شہر دو ندیوں کے سنگم پر واقع تھا۔اور ہاں، خطے کے شمالی اور شمال مشرقی حصوں میں آباد ہندوؤں کے لئے یہ جگہ (پنڈوہ) نہ صرف ایک تجارتی مرکز تھی بلکہ گنگا کے شمال میں پھیلی ہوئی اس ریاست کی حفاظت و نگرانی کے لئے فوجی چھاؤنی کا بھی کام دیتی تھی۔شمالی بنگال میں آنے والے بھاری سیلابوں کی وجہ سے غالباً مہانندا نے غضبناک ہو کر اپنے بہاؤ کا راستہ کافی آگے بڑھا لیا ہوگا جس کے نتیجے میں گنگا کا اصلی تلا ہی غائب ہو گیا، پھر اپنے وجود کو بحال کرتے ہوئے گنگا اولاً جانبِ جنوب کالندری کے موجودہ تلے میں مڑ گئی۔تاہم مہانندا کا قہر ابھی بھی نہیں تھما اور وہ رفتہ رفتہ اپنی موجوں کی روانی کو پھیلاتی چلی گئی اور یوں پنڈوہ کا شہر بھی گنگا سے کئی میل کی دوری پر پڑ گیا۔مہانندا کی اس مسلسل سیلانی وسعت نے آگے چل کر گنگا کی آبی گزرگاہ کو مزید جنوب مغربی حصے کی طرف دھکیل دیا اور اسی کے نتیجے میں گور کے حالیہ محل وقوع نے گنگا کے ایک جزیرے کے طور پر تشکیل پائی، جس کا مغربی حصہ بھاگیرتھی کے موجودہ تلے میں گنگا کے پانی سے ہر دم نہاتا رہتا۔

(۴) گور کے قدیم نام لکھنوتی یا راماوتی پر غور کیا جائے تو اتنی بات تو پکی ہی ہو جاتی ہے کہ یہ نام ''راماپالا'' کے زمانے یعنی ۱۱۰۰ء سے پہلے ہی کا ہے، تاہم متوفی مسٹر یو، سی، باتو پال آئی، سی، ایس مجسٹریٹ آف مالدہ نے خالم پور الیاس خولی یعنی عالم پور جو مسلم حکومت والے گور کے مشرقی حصے میں چھ میل کے فاصلے پر 'وسیع تر چھاتیہ بھاٹیہ دلدل' کے سمت مخالف میں ایک چھوٹا سا گاؤں تھا، سے ۱۸۹۳ء میں زمینی منظوری سے متعلق تانبے کی ایک پلیٹ دریافت کی تھی جس پر بدھسٹ راجہ دھرماپالا (تقریباً ۸۰۰ء) کے دورِ حکومت کے بتیسواں سال کی تاریخ درج ہے،

1۔اِن سرخ سیلابی مٹیوں کو آپ آج بھی پنڈوہ میں دیکھ سکتے ہیں۔ذرا سی بارش ہو جائے تو کچی راہوں پر چلنا مشکل ہو جاتا ہے، کپڑوں پر کیچڑ کی چھینٹیں پڑ جائیں تو اُن کے دھبے بغیر کسی کیمیکل کی مدد سے نکلنے کا نام ہی لیتے، ان باتوں کا مجھے ذاتی تجربہ ہے۔(میزان)

اس سے ایسا لگتا ہے کہ گنگا کے مذکورہ بالا جزیرہ ''گوڑ'' میں راما پآلا کے دورحکومت سے بھی کم از کم تین سو سال پہلے آبادی کی شروعات ہو چکی تھی[1]۔

خیر! بات چل رہی تھی گور کے نزدیک سے گزرنے والی گنگا کی، تو اِس حوالے سے یہ عرض ہے کہ گنگا نے آگے چل کر ایک بار اور، غالبًا اسلامی دورحکومت میں، اپنے بہاؤ کا رخ موڑ لیا۔ اس بار اُس کی دھارائیں خطہ کے مغربی حصے یعنی تقریبًا راج محل کے نزدیک سے گزرنے والی اُس کی 'موجودہ گزرگاہ' ہی کی طرف مڑ گئیں۔۔۔۔ خطہ میں موجود بھاگیرتھی کی حالیہ تنگ پاٹ کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ بھاگیرتھی کسی ندی کی بجائے ایک مصنوعی نہر ہے۔ اِس بارے میں ایسا قیاس کیا جانا ممکن ہے کہ گنگا کی آبی روانی میں مذکورہ بالا آخری تبدیلی کے فوری بعد ہی گور کے راجاؤں نے شمال میں واقع کالندری اور جنوب میں واقع گنگا کے درمیان باہمی ربط وضبط کا ایک ذریعہ بناتے ہوئے یہ قدم اٹھایا تھا کہ انہوں نے بیچ میں ایک نہر کھدوالی تاکہ گور کے مغربی حصے سے آب رسانی کا مسئلہ آسانی کے ساتھ حل ہو جائے۔

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ اہم ترین آبی گزرگاہوں، بالخصوص گنگا کی گزرگاہ میں تبدیلی خطے میں آباد لوگوں کی صحت کیلئے بہرحال کافی نقصاندہ ثابت ہوتی تھی جس کی طرف خان صاحب نے بھی اپنی اس کتاب میں اشارہ کیا ہے، اسی لئے ریاست کے حکمرانوں کو مسلسل اپنی راج گدیاں الگ الگ جگہوں پر منتقل کرنی پڑیں۔۔۔۔ یہ بات خاص طور پر مسلم بادشاہوں کے پورے دورحکومت میں ایک نمایاں خصوصیت کے طور پر نوٹ کی جاسکتی ہے۔

(۵) آخر میں۔۔دل کی گہرائیوں سے میں شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں شمس العلماء ڈاکٹر ہدایت حسین، پرنسپل: کلکتہ مدرسہ کا، جنہوں نے مسودے کی اصلاح ونظرثانی اور پروف ریڈنگ میں کافی مدد فرمائی۔ مولوی مقبول احمد، شعبہ عربی: پریسیڈینسی کالج کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ حوالوں کی تلاش میں مجھے ان کا خصوصی تعاون حاصل رہا۔ مسٹر ایم، او، کارٓٹر آئی، سی، ایس، سیٹلمنٹ افسر، مالدہ کا بھی شکرگزار ہوں جنہوں نے متعلقہ عنوان پر ان گنت استفسارات کے جوابات عطا کئے، بالخصوص 'موزا میپ' میں پنڈوہ کے پریمیٹر والز کی پلاٹنگ میں کافی تعاون کیا۔ اسی طرح این، کے،

1.Vide Journal of the Asiatic Society of Bengal, Vol.LXIII (1894), pp. 39-62. The original plate is now in the Museum of the Varendra Research Society, Rajshahi. collotype reproduction of both sides of the plate are given in Mr.Batavyal's paper.

بھٹا سالی، کیوریٹر: ڈھاکہ میوزیم کا بھی شکرگزار ہوں کہ انہوں نے نہ صرف ''اولین پروف'' پرتنقیدی نگاہ ڈالی بلکہ اپنی ''Coins and Chronology of the Early Independent Sultans of Bengal'' سے تشریحات کے لئے سکوں کے بلاکس بھی عطا کئے۔ اسی طرح جان اسٹون اور ہوفمین صاحبان کا بھی شکریہ ادا کرتے ہوئے کہنا چاہتا ہوں کہ گور و پنڈوہ سے متعلق اپنے مجموعہ تصاویر کی اشاعت ثانی کے لئے انہوں نے جو اجازت دی، اس کیلئے حکومت ان دونوں کی قرضدار رہے گی۔ اسی طرح شکریہ کے حقدار ہیں کلکتہ ہسٹوریکل سوسائٹی کی مجلس منتظمہ کے ارکان بھی، کہ جن بلاکس کو ماضی میں ڈبلیو، کے فرمنگر نے ''Bengal; Past and Present (Vol. viii-1914-pp.121-125'' میں مالدہ، گور اور پنڈوہ کے حالات کی عکاسی کرتے ہوئے استعمال کیا تھا، اُنہیں اِن حضرات نے مجھے دوبارہ استعمال کرنے کی اجازت عطا کی۔۔۔۔۔ کتاب میں شامل تینوں میپ، ادینہ مسجد کا پلان اور کتبات کی ازسرنونقل واشاعت ''دی سروے آف انڈیا'' کا محتاط ورک ہے۔

ایچ، ای اسٹیپلٹن۔

رائٹرس بلڈنگ، کلکتہ۔ ۱۵/نومبر ۱۹۳۰ء

نقشہ شمالی ومشرقی بنگال

پلیٹ نمبر ا

﴿باب اول﴾

گوراور پنڈوہ کی تاریخی حیثیت پر ایک نظر

محمد بختیار خلجی کی فتح بنگال

گور۔۔۔۔۔۔۔راماوتی اور لکشمناوتی کے نام سے موسوم غالبًا پال اور سین راجاؤں کا شاہی دارالحکومت تھا۔تاہم اس کی قلمبند تاریخ کا آغاز ۵۹۹ھ مطابق ۱۲۰۲ء میں والئی دہلی قطب الدین ایبک کے ایک فوجی افسر محمد بختیار خلجی کے ذریعے مغربی اور شمالی بنگال (راڑھ اور ورِیندرا) کی فتح کے بعد ہی سے ہوتا ہے۔رائے لکشمن سین (جو لکھن سین کے نام سے زیادہ معروف ہے اور جس نے اپنے نام پر ''گور'' کا نام ''لکشمناوتی'' رکھا تھا) اُس وقت بنگال کا راجہ تھا جب محمد بختیار خلجی نے بہار کے شمال مشرقی راستے سے تیزی کے ساتھ پیش قدمی کرتا ہوا بھاگیرتھی ندی کے کنارے (کرشنانگر کے مغرب میں تھوڑی ہی دوری پر واقع یہ جگہ اب ''بند ویپ'' کے نام سے معروف ہے) پہنچا اور لکھن سین پر اُس کے دارالحکومت ''نادیہ'' ہی کے اندر یکا یک چڑھائی کردی۔لکھن سین فرار ہوگیا، پہلے وہ اپنے دوسرے دار الحکومت لکشمناوتی پہنچا پھر وہاں سے مغربی بنگال کی ایک اور جگہ سنار گاؤں چلا گیا جہاں اس کے جانشیں ایک اور صدی تک حکومت کرتے رہے۔محمد بختیار نے لکشمناوتی تک اس کا تعاقب کیا۔یہ لکشمناوتی آگے چل کر بنگال میں بختیار حکومت کی مرکزی سیٹ بنی اور اپنے قدیم نام کی ایک مخفف شکل ''لکھنوتی'' سے پہچانی جانے لگی۔

گور اور شمالی بنگال میں سین حکومت کے کچھ نشانات اب بھی باقی ہیں، اس ضمن میں لکھن سین کے باپ ''بلّال سین'' کا نام بلّال باڑی یا باغ باڑی کے نام سے آج بھی زندہ ہے جو گور کے شمالی اطراف میں ایک قلعہ بند علاقہ کو کہا جاتا ہے۔(ملاحظہ فرمائیں: پلیٹ نمبر۲)

کہا جاتا ہے کہ لکھن سین اپنی فرماں روائی کے علاقوں میں بڑی شان وشوکت کا راجہ تھا۔جب مسلمانوں نے اس کی ریاست پر حملہ کیا تو اُس وقت اس کی عمر ۸۰ر سال تھی۔اس کی دو بیویاں تھیں، باسودیوی اور بلّا وادیوی، جن سے تین بیٹے ہوئے۔مادھوسین، کشاب سین اور بسوَ روپ سین۔اس کے وزیر کا نام ہالایودھا مِسرا تھا۔

راجہ لکھن سین کے نجومی:

''طبقات ناصری'' میں ہے کہ کچھ نجومی اور صلاح کار راجہ کے پاس گئے (صاحب کتاب نے یہاں پر راجہ سے

مراد رائے لکھمنیہ کو لیا ہے) اور اسے بتایا کہ ہمارے قدیم بزرگوں کی کتابوں میں اس بات کی پیشنگوئی کی گئی ہے کہ یہ ملک ایک دن مسلمانوں کے ہاتھوں میں چلا جائیگا۔اور یہ کہ، جب یہ وقت آئے تو اُس وقت کا حکمراں راجہ سوائے اِس کے کچھ نہ کر سکے گا کہ وہ اپنی رعایا کے ساتھ کہیں بھاگ جانے پر راضی ہوجائے تا کہ وہ لوگ ایک گندے آدمی کی دست اندازی اور چھیڑ چھاڑ سے حتی المقدور بچ جائیں[1]۔پیشن گوئی کے بارے میں سن کر راجہ نے نجومیوں سے پوچھا کہ کیا کتاب میں مسلم فوج کے سالار کے بارے میں کوئی نشانی بھی بتائی گئی ہے؟ نجومیوں نے جواب دیا، ہاں!اسلامی فوج کے سالار کی نشانی یہ ہوگی کہ جب وہ سیدھا کھڑا ہواور اپنے ہاتھوں کو نیچے لٹکتا چھوڑ دے تو اس کی انگلیاں گھٹنے سے آگے بڑھکر اس کی پنڈلیوں تک پہنچ جائیں گی۔اب بتائی گئی نشانی کی تفتیش کے لئے لکھن سین نے کچھ بھروسے مند لوگوں کو بھیجا،ان لوگوں نے جب محمد بختیار کے اندر مذکورہ خصوصیات اور نشانیاں دیکھ لیں تو واپس آ کر راجہ کو اس کے بارے میں آگاہ کر دیا۔

محمد بختیار کی بآسانی فتح بنگال:

دربار ی نجومیوں کے بیان نے ملک کے برہمنوں، دانشوروں، افسروں اور سرداروں کے درمیان بڑی بے چینی پھیلادی تھی جس کے نتیجے میں وہ لوگ سَنکانات کے ضلعوں (اغلب طور پر شمالی بنگال کا علاقہ)،مشرقی بنگال کے شہروں وقصبوں اور آسام میں کامروپ کی طرف بہت جلد کوچ کر گئے۔تاہم رائے لکھمنیہ تاہنوز اپنی مملکت کو چھوڑنے پر تیار نہیں تھا،لیکن اس کے بعد کچھ یوں ہوا کہ آئندہ سال ہی محمد بختیار نے ایک زبردست فوج آراستہ کی اور بہار کے راستے سے پیش قدمی کرتا ہوا اچانک شہر ''نادیہ'' میں آدھمکا۔بختیار نے اتنی تیزی کے ساتھ پیش قدمی کی تھی کہ صرف اٹھارہ گھوڑ سوار ہی اس کا ساتھ دے سکے تھے، باقی فوج بہت پیچھے رہ گئی تھی۔بغیر کسی مزاحمت کے وہ شہر میں داخل ہوا اور، جیسا کہ ماقبل میں بتایا جاچکا ہے، اُس نے ۱۲۰۲ عیسوی میں شہر پر قبضہ کرلیا۔طبقات ناصری کے مطابق، شہر میں محمد بختیار کی آمد کے وقت رائے لکھمنیہ اپنے ایوان کے داخلی حصے میں سونے چاندی کی پلیٹوں میں کھانا لئے بیٹھا تھا۔

1۔ یہ بتانے کی چنداں ضرورت نہیں کہ مسلمانوں کے حوالے سے نجومیوں اور راجہ کے درباری صلاح کاروں کی یہ منفی سوچ محض عناد اور عداوت کا نتیجہ تھی، ورنہ اسی کتاب کے اوراق پر آپ مسلم حکمرانوں کی سیر چشمی، بیدار مغزی، پرہیزگاری، دیانت داری، کشادہ ظرفی، شیریں زبانی، راست گوئی، شگفتہ روئی اور دریادلی کے نمونے جابجا دیکھ سکتے ہیں۔از: میزان

محمد بختیار کی ناگہاں یورش نے اس کے دل میں اس قدر دہشت پیدا کردی کہ وہ ننگے پاؤں ہی بھاگ نکلا[1]۔ پیچھے اس کا خزانہ، حرم، ہاتھی اور نوکر چاکر سب کچھ حملہ آوروں کے ہاتھ لگ گئے۔ اس کے بعد محمد بختیار نے اپنے حاکم اعلیٰ قطب الدین ایبک کے نام کا خطبہ پڑھنے اور سکوں پر اس کا نام کندہ کرنے کا حکم دیا۔ بنگال کی فتح کے بعد محمد بختیار نے علاقے میں مسجدیں بنوائیں، درسگاہیں قائم کیں اور درویشوں کے لئے آرام گھر تعمیر کروائے۔ اس نے لکھنوتی کو اپنا دارالحکومت قرار دیا۔

۱۲۰۵ عیسوی میں بختیار نے تبت میں فوج کشی کی لیکن یہ مہم بری طرح ناکام رہی اور اسے بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔ اپنے بہت سے سپاہیوں اور اعلیٰ افسروں کو کھونے کے بعد وہ گنگا رام پور (دیناجپور کے جنوب میں ۱۸ میل کے فاصلے پر یہ جگہ واقع ہے۔ از: مصنف۔۔ یہ تفصیل کافی پہلے کی ہے، آج کی تاریخ میں گنگا رام پور ضلع دکھن دیناجپور کا ایک اہم شہر ہے جو بنیاد پور اور بالور گھاٹ کے بیچ میں واقع ہے۔ از: میزان) کے قریب دیوکوٹ میں واقع اپنے شمالی کیمپ میں واپس آ گیا۔

دیوکوٹ واپسی کے بعد بختیار بیمار پڑ گیا اور خاموش رہنے لگا۔ باہر گلی کوچوں اور سڑکوں میں بھی وہ بہت کم نکلتا تھا کیونکہ وہ جب بھی باہر نکلتا، تبت کی بدقسمت مہم میں کام آ گئے سپاہیوں اور فوجی افسروں کی بیوائیں اور بچے اسے کوسنے اور گالیاں دینے لگتے۔ آخرکار بنگال میں ایک گورنر کی حیثیت سے تین سال تک کام کرنے کے بعد محمد بختیار کی موت واقع ہوگئی۔ یہاں کچھ لوگوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ دراصل علی مَردان نے خفیہ طور پر اُسے قتل کر دیا تھا۔

بنگال کی آئندہ تاریخ:

محمد بختیار خلجی (۱۲۰۲ء۔۔۱۲۰۵ء) کے زمانے سے لے کر قبر خان (۱۳۲۵ء۔۔۱۳۳۸ء) کے وقت تک ہی بنگال دہلی حکومت کا تابع اور زیر اثر رہا۔ ۱۳۳۸ء میں قبر خان کے انتقال کے بعد بنگال نے اپنی خودمختاری حاصل کر لی اور یہاں کے حکمراں سلاطین دہلی کے اثر سے بالکل ہی آزاد ہو گئے۔

1۔ مسٹر سُریندر ناتھ گنگولی، کلکتہ نے ایک بہت ہی دلچسپ ڈرائنگ بنائی تھی جس میں انہوں نے راجہ لکھن سین کے یادگار فرار کی عکاسی کی ہے۔ ڈرائنگ کا منظر یہ ہے کہ صرف ایک عدد چادر کے ذریعے اپنے آدھے جسم کو ڈھانپ کر ایک لاٹھی کا سہارا لئے ہوئے، عزت مآب فرماں روا بمشکل چلتے ہوئے سیڑھیاں اتر رہے ہیں۔ سیڑھیوں کے ٹھیک نیچے ہی ایک کشتی انہیں لے جانے کے لئے تیار کھڑی ہے، کشتی کا سرا مور کے سر کی شکل کا بنا ہوا ہے۔

آزاد بنگال:

۱۳۳۸ء کے بعد چودہ سال کے اندر ہی حاجی الیاس نے تمام ملک کو اپنے زیرِنگیں کرلیا اور پنڈوہ کو، جو لکھنوتی کے شمال مشرق میں بیس میل کے فاصلے پر ہندوؤں کا ایک قدیم شہر تھا، مسلم بنگال کا دارالحکومت قرار دیا۔ دارالحکومت کی اِس منتقلی کے بعد حاجی الیاس نے فیروز شاہ دہلی کی طرف سے ۱۳۵۴ء میں اِکدالا پر کئے گئے زبردست حملے کا ثابت قدمی کے ساتھ مقابلہ کیا۔ اکدالا مٹی کا ایک بہت بڑا قلعہ تھا جس کی حفاظت دیواروں سے متصل کیچڑ اور دلدل پیدا کر کے کی جارہی تھی۔ ممکن ہے کہ یہ جگہ آج کا مورچہ گاؤں ہو جو مہانندہ- کالندری سنگم کے جانبِ مخالف ۱۴ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔۔۔۔الیاس شاہ کے بیٹے سکندر شاہ اول نے بھی پنڈوہ کو اپنا دارالحکومت قرار دیا اور اس طرح تخت نشینی کا یہ شاہی سلسلہ تقریباً ۱۴۱۰ء تک حاجی الیاس ہی کے وارثوں کے درمیان جاری رہا۔ یہاں تک کہ راجہ کانس (یا، گنیش) نے سیف الدین ہمزہ شاہ (ہمزہ شاہ کے نام پر وہی حکومت کرتا تھا) کے بعد کٹھ پتلی راجاؤں کی وراثت کا ایک مختصر سلسلہ استوار کیا۔ راجہ کانس کا بیٹا جلال الدین محمد (الیاس جادو) جو اسلام کی آغوش میں آچکا تھا، ۱۴۱۵ء میں پہلی بار بنگال کے تخت پر متمکن ہوا اور پنڈوہ ہی میں اپنا دربار جمایا۔ اُس کا مقبرہ 'اِک لاکھی مقبرہ' کے نام سے آج بھی اِس اجڑے دیار میں ایک نہایت ہی حسین اور دلکش یادگار بن کر قائم ہے۔

دارالحکومت کی تبدیلیاں:

محمد بختیار سے لیکر قادر خان تک تمام نائبین سلطنت (وائسرائے) نے اپنا دارالحکومت لکھنوتی ہی کو بنایا، تاہم جب بنگال کے حکمرانوں نے خودمختاری حاصل کر لی تو ان لوگوں نے اپنا دارالحکومت فیروزآباد (پنڈوہ کا قدیم نام) کو قرار دے دیا۔ دارالحکومت کی اس منتقلی کا سبب تو ویسے کہیں بھی بیان نہیں کیا گیا ہے تاہم بدیہی غور وفکر کے مطابق دار الحکومت کی یہ منتقلی، ندی کی گزرگاہوں میں تبدیلی کی وجہ سے عمل میں آئی تھی جو لکھنوتی کی آب و ہوا کو بیمار اور ناقابل بود و باش ثابت کررہی تھی۔ دارالحکومت کی اِس منتقلی کے پیچھے مختلف خانہ جنگیوں، جن میں متعدد بار شہر کو بری طرح لوٹا گیا، کا بھی بڑا اہم رول رہا۔[1]

1.Vide Monmohan Chakravarty's " Note on Gaur" etc. (Journal and Proceeding of the Asiatic Society of Bengal, Voi. V-, No. 7,pp, 204- 234)

فیروز آباد (پنڈوہ) سے گور کی طرف دارالحکومت کی منتقلی غالباً محمود اول کی حکومت کے دوران (۱۴۴۲ء-۱۴۵۹ء) عمل میں آئی تھی۔ اِس منتقلی کا اہم سبب بھی اب فیروز آباد میں نامناسب آب وہوا کی وجہ سے جسمانی احوال وکوائف پر برے اثرات کا مرتب ہونا تھا۔ کافی اتار چڑھاؤ کے بعد ایسا محسوس کیا جانے لگا تھا کہ اب گنگا شہر گور کے مغربی حصے میں نسبتاً ایک پائیدار راستہ اختیار کر چکی ہے اور چونکہ اس کی آبی سطح شہر کے مشرقی حصے میں خطرے کے نشان تک اوپر اٹھ آئی تھی اس لئے شہر کے مشرقی اور مغربی حصے میں ایک مضبوط بند باندھ کر شہر کو محفوظ اور قابل نقل وحرکت بنایا گیا۔ شہر کے مغربی حصے میں ندی کی گہری گزرگاہ کی وجہ سے شہر میں تجارتی نقل وحمل کی راہیں بھی آسان تر ہوگئیں۔ دوسری طرف، ندی بتدریج پنڈوہ سے دور ہوتی گئی جس کے نتیجے میں وہاں کی آب وہوا غیر معتدل اور وہاں تک رسل ورسائل کے قدرتی ذرائع محدود تر ہوتے گئے۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ دارالحکومت کی منتقلی کے عمل کو شاہی خاندانوں کی تبدیلی نے بھی بڑی حد تک راستہ دکھایا ہے۔

۱۵۶۵ء میں سلیمان کرارانی نے دارالحکومت کو گور سے ٹانڈہ میں منتقل کر دیا۔ دیکھا جائے تو یہاں بھی گنگا کی گزرگاہوں میں تبدیلی اور اُس کے نتیجے میں پیدا شدہ گور کی بیمار آب وہوا اور باہمی ابلاغ وترسیل کی مشکلات انتقالِ دارالحکومت کی بنیادی وجوہات تھیں۔

خان خاناں مومن خان نے، جو خطے میں اکبر کا پہلا نائب السلطنت تھا، ۱۵۷۵ء میں دارالحکومت کو ٹانڈہ سے گور کی طرف دوبارہ منتقل کر دیا لیکن اُس سال ہوئی زبردست بارش نے گور میں ایک ایسی وبا پھیلائی جس سے لاتعداد لوگوں کی موت واقع ہوگئی، خود نائبِ سلطنت پر بھی جب اُس وبا کے منحوس اثرات مرتب ہونے لگے تو اس وقت فوری طور پر حکومت کے کاروبار کو ٹانڈہ منتقل کر دیا گیا۔

۱۵۹۵ء میں راجہ مان سنگھ تختِ سلطنت کو ٹانڈہ سے منتقل کر کے گنگا کی دوسری جانب راج محل لے گیا، یہاں بھی ندی کی گزرگاہوں میں اتار چڑھاؤ ہی منتقلی کا بنیادی سبب تھا۔ دارالحکومت کی منتقلی کے بعد ٹانڈہ رفتہ رفتہ ویران ہونے لگا اور پھر ۱۸۲۶ء کے سیلاب نے تو ٹانڈہ کو مکمل طور پر تباہ ہی کر دیا۔۔۔ جب اسلام خان بنگال کا صوبدار تھا، اس وقت ،تقریباً ۱۶۱۲ء میں، دارالحکومت کو ڈھاکہ منتقل کر دیا گیا۔ اس منتقلی کا بنیادی سبب عثمان کی زیر قیادت کھڑی ہونے والی ایک تازہ افغان بغاوت کو کچلنا تھا اور ساتھ ہی آراکنیز کی جانب سے ہونے والے حملوں کی روک تھام بھی کرنی تھی۔ لیکن اُس کے بعد شہزادہ شجاع کے زمانے میں راج محل ایک بار پھر بنگال کا دارالحکومت بن گیا۔

۱۶۶۰ء میں میر جملہ نے، جو خطے میں شاہ اورنگ زیب کا پہلا گورنر تھا، دارالحکومت کو دوبارہ ڈھاکہ کی طرف

منتقل کردیا۔ ۱۷۰۴ء میں مرشد قلی خان نے آخری بار کے طور پر دارالحکومت کوڈھاکہ سے منتقل کر کے مرشدآباد لے آیا، اور پھر یہ جگہ پلاسی کی جنگ تک مسلم حکومتکی راج گدی بنی رہی۔[1] یہاں تک کہ ۱۷۵۷ء میں کلکتہ آخرکار بنگال کا اور ۱۹۱۲ء میں ہندوستان کا دارالحکومت بن گیا۔

1۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ کیوننگھم کے مطابق (آرکیالوجیکل سروے رپوٹ آف انڈیا، ص:۴۱، اور ۱۱۳) ''گور'' کا نام غالبا لفظ ''گُڑ'' سے ماخوذ ہے جوراب یا گنے کے رس کے سخت قوام کے لئے استعمال کیا جانے والا ایک عام بنگالی لفظ ہے۔ قدیم صوبہ گور (جس کو وَریندوا کے نام سے بھی یاد کیا گیا ہے) کے پورے علاقے میں گنے کافی زیادہ مقدار میں اگائے جاتے تھے اور شہر گور میں ایک ایسا بازار بھی تھا جہاں شمالی ضلعوں کے تمام گنوں کو دور دراز مقامات میں ایکسپورٹ کرنے کے لئے جمع کیا جاتا تھا۔ (سو گنے سے بننے والے اسی گُڑ کے نام سے شہر کا نام ہلکی سی تبدیلی کے ساتھ گور رکھ دیا گیا۔ از: مترجم) اسی طرح پرگنہ کا نام ''اُودمبرا'' ۔۔۔ جہاں ٹانڈہ واقع ہوا کرتا تھا۔۔۔ غالبا گنے ہی کی ایک مشہور ورائٹی کے نام سے ماخوذ ہے۔

صوبہ کا قدیم ترین دارالحکومت (۶۰۰ء۔ ۸۰۰ء) پاؤندرا۔ وَریندرا تھا، جو ماڈرن ٹاؤن بوگرا کے شمال میں ۷/میل کے فاصلے پر ''کاراٹویا'' ندی کے کنارے موجود آج کا ''مہااستھان'' ہے۔ کیوننگھم کا خیال ہے کہ یہ لفظ ''پاؤندرا'' بھی اصل میں ہلکے پیلے رنگ والے گنے ہی کی ایک قسم 'پوندرا' سے ماخوذ ہے۔ یونہی مہااستھان کے مغربی دروازہ کا نام'' تمرادروازہ'' بھی سرخ یا تانبے کے رنگ والے ایک گنے'' تمرَکا'' ہی کے نام سے اخذ کیا ہوا ہے۔ مزید اظہار رائے کرتے ہوئے وہ یہ بھی کہتا ہے کہ '' تَمارائی'' ذات کے لوگ، جن کو بطلیموس (یہ شخص مصر کا مشہور مہندس ہے، دوسری صدی عیسوی میں موجود تھا، ۷۸ یا ۸۰/ برس کی عمر پائی تھی اور اسی صدی میں مرگیا تھا۔ بعض لوگوں نے اسے جالینوس کا شاگرد اور مصر کا بادشاہ بھی قرار دیا ہے۔ از: مترجم) نے دریائے گنگا کے ڈیلٹے کے مشرقی سرے کی طرف آباد کیا تھا، وہ وریندرا ہی کے باشندے تھے اور ان لوگوں کا دارالحکومت '' تَغمہ'' بعد کا ''مہااستھان'' تھا۔ ایچ، ای، اسٹیپلٹن

﴿باب دوم﴾

گوروپنڈوہ کے اہم ترین سلاطین اور نائبین سلطنت کی ایک مختصر سرگزشت

محمد بختیار خلجی کی موت کے بعد عزالدین محمد شیران (۱۲۰۵ء۔۔۱۲۰۸ء)،علی مردان (۱۲۰۸ء۔۔۱۲۱۱ء) اور غیاث الدین عیاض (۱۲۱۱ء۔۔ ۱۲۲۶ء) نے یکے بعد دیگرے لکھنوتی کے نائبین سلطنت کی حیثیت سے حکومت کی۔غیاث الدین نے بِسان کوٹ (جواب کالندری ندی کے کنارے مورچہ بشنوپور کے نام سے معروف ہے) میں ایک قلعہ تعمیر کیا اور محمد بختیار کے ذریعے شروع کی جانے والی اُس سڑک [1] کی تعمیر مکمل کی جو لکھنوَر سے شروع ہوکر لکھنوتی کے راستے دیوکوٹ تک جاتی تھی (کیونگھم کے مطابق لکھنوَر، راج محل کے جنوب میں ۱۶ رمیل کے فاصلے پر واقع وہی جگہ ہے جو آج کانکجول کے نام سے معروف ہے)۔غیاث الدین نے شہر گور کی تزئین کیلئے متعدد شاندار عمارتیں بھی بنوائیں [2] اور کامروپ، میٹھیلا اور اوڈیشہ کے راجاؤں کو اس نے مجبور کیا کہ وہ گور کی حکومت کو خراج پیش کریں۔

ناصرالدین محمود شاہ (۱۲۲۶ء۔۔۱۲۲۹ء) اور اس کے جانشیں:

شاہ دہلی سلطان اِلتمش کے دوسرے بیٹے ناصرالدین محمود نے غیاث الدین کو شکست دی اور قتل کردیا۔ بعدازاں، تین سال تک حکومت کرنے کے بعد ناصرالدین نے وفات پائی [3] اور پھر مَلِک علاء الدین جانی (۱۲۲۹ء)، سیف الدین (۱۲۲۹ء۔۔۱۲۳۳ء) اور عزالدین تغرل (۱۲۳۳ء۔۔ ۱۲۴۴ء) یکے بعد دیگرے اس کے جانشیں

1۔اس سڑک کا ایک حصہ اب تک انگلش بازار کے مغرب میں دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ سڑک یا یہ باندھ برسات کے اُن دنوں میں جب سارا ملک جل تھل ہوجاتا تھا، رسل ورسائل کی مشکلات کو بڑی حد تک آسان کردیتی تھی۔

2۔طبقات ناصری کے مصنف منہاج سراج نے ۶۴۱ھ مطابق ۱۲۴۳ء میں لکھنوتی کا دورہ کیا تھا اور غیاث الدین کے ذریعے عمل میں آئی تعمیری ترقیات کو قلم بند بھی کیا تھا۔

3۔ناصرالدین نے وفات تو گور میں پائی تاہم اس کی لاش کو دہلی بھیج دیا گیا جہاں قطب مینار کے مغرب میں تین میل کی دوری پر اس کی تدفین عمل میں آئی، آج اس کا مقبرہ ''مزار سلطان غازی'' کے نام سے معروف ہے، ناصر الدین کو اس کی قبر کے کتبے میں ''ملک ملوک الشرق'' کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔

مقرر ہوئے۔عزالدین کی حکومت کے دوران اوڈیشہ کے ہندو راجہ نے شہر گور کا محاصرہ کیا مگر مشہور زمانہ ملکہ دہلی، رضیہ بیگم کی بھیجی گئی فوج کی مدد سے اوڈیشہ کی فوج کو پسپا کر دیا گیا۔ چالیس سال بعد شاہ دہلی سلطان بلبن کی حکومت کے وقت ایک دوسرے تغرل حکمراں نے جس نے اپنے لئے مغیث الدین کا لقب اختیار کیا تھا، دہلی کی مرکزی حکومت سے بغاوت کرتے ہوئے گور کو ایک آزاد اور خود مختار ریاست کے طور پر اعلان کر دیا جس سے برانگیختہ ہو کر سلطان غیاث الدین بلبن نے بذات خود بنگال پر چڑھائی کی، تغرل حکمراں کو موت کے گھاٹ اتارا اور لکھنوتی کی تخت اپنے بیٹے بغرا خان کے حوالے کر دی جو تاریخ کے صفحات پر سلطان ناصر الدین کے نام سے معروف ہے۔ بغرا خان نے لکھنوتی میں نو برس تک حکومت کی۔ سلطان بلبن کے انتقال کے بعد بغرا خان کے بیٹے معیذالدین کیقو باد (سلطان بلبن کے پوتے) نے دہلی کے تخت پر قبضہ جما لیا جبکہ اس کا باپ بغرا خان بنگال کی گورنری ہی پر قانع رہا۔ بغرا خان کی وفات کے بعد اس کے دو بیٹے رکن الدین (۱۲۹۱ء۔ ۱۳۰۱ء) اور شمس الدین فیروز شاہ (۱۳۰۱ء۔ ۱۳۲۲ء)، اور پھر چار پوتے جلال الدین محمود (۱۳۰۷ء)، شہاب الدین (۱۳۱۷ء۔ ۱۳۱۸ء)، غیاث الدین (۱۳۱۰ء۔ ۱۳۲۳ء، پھر دوبارہ ۱۳۲۵ء۔ ۱۳۲۸ء) اور ناصر الدین (۱۳۲۴ء۔۔ ۱۳۲۶ء) یکے بعد دیگرے اُس کے جانشیں مقرر ہوتے رہے۔ مؤخر الذکر کو چھوڑ کر ان میں سے ہر کوئی عملی طور پر خود مختار حکمراں تھا اور انہوں نے اپنے نام کے سکے بھی جاری کئے۔ جلال الدین اور غیاث الدین کو تو اُن کے باپ شمس الدین فروز شاہ کی جانب سے اُس کی زندگی ہی میں سکوں پر نام کندہ کروانے کی اجازت مل گئی تھی، اس لئے ان دونوں کی حکومت ممکنہ طور پر مشترکہ رہی ہوگی۔ پھر جب سلطان محمد تغلق دہلی کے تخت پر متمکن ہوا تو اس نے بنگال میں بھی اپنا گورنر مقرر کر دیا، انہیں گورنروں میں ایک قادر خان بھی تھا جس نے ۱۳۲۵ء سے لے کر ۱۳۳۸ء تک [1] بحیثیت گورنر بنگال میں حکومت کی تھی۔

1۔ یہ جگہ تھوڑی تفصیل طلب ہے۔ اوپر شمس الدین فیروز شاہ کے بیٹے غیاث الدین کے دور حکومت کی تحدید کرتے ہوئے خان صاحب نے بیان کیا کہ غیاث الدین نے اولاً ۱۳۱۰ء سے لیکر ۱۳۲۳ء تک حکومت کی، پھر دوبارہ ۱۳۲۵ء سے لیکر ۱۳۲۸ء تک اس نے حکومت کی۔ اس کے بعد نیچے قادر خان کے دور حکومت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ قادر خان ۱۳۲۵ء سے لیکر ۱۳۳۸ء تک ریاست بنگال کی تخت پر متمکن رہا۔ ایسے میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ۱۳۲۵ء سے لیکر ۱۳۲۸ء کے درمیان جو اوپر غیاث الدین کی حکومتِ ثانی کا ذکر کیا گیا، وہ تو قادر خان کا بھی دور حکومت ہے۔ تو اب ایسا کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک ہی وقت میں ایک ہی ریاست کے اندر دو دو شخص تخت نشیں ہو جائیں؟ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

تاریخی شواہد کے مطابق والئی دہلی، سلطان محمد شاہ تغلق (جونا خان) کے دور حکومت میں قحط سالی کی ایک خطرناک وبا

(گزشتہ صفحہ کا بقیہ حاشیہ) الجھن کو رفع کرنے کے لئے سب سے پہلے کچھ تاریخی جزئیات پیش نظر رکھیں۔۔۔اس خصوص میں یہ عرض ہے کہ ریاست بنگال کافی وسیع وعریض رقبے پر پھیلی ہوئی تھی اور اس حد درجہ وسعت ہی کی وجہ سے قدیم وقتوں میں بنگال کے اندر دو دو پایۂ تخت ہوا کرتے تھے، ایک لکھنوتی میں، جسے آگے چل کر گور کا نام دیا گیا اور ایک سنار گاؤں میں۔ بلفظ دیگر آپ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ خطہ بنگال دو حصوں میں بٹا ہوا تھا، ایک لکھنوتی کا علاقہ اور ایک سنار گاؤں کا علاقہ۔ اب کبھی ایسا ہوتا کہ دونوں علاقوں کا فرماں روا ایک ہی ہوتا اور کبھی دو علاقوں کے لئے دو الگ الگ فرماں روا ہوا کرتے۔ چنانچہ شمس الدین فیروز شاہ کے بیٹے غیاث الدین کے زمانے میں لکھنوتی کا فرماں روا الگ تھا اور سنار گاؤں کا الگ۔ سنار گاؤں کا فرماں روا تو غیاث الدین ہی تھا تاہم لکھنوتی کا فرماں روا غیاث الدین کا بھائی ناصر الدین تھا۔ اور بنگال کے لوگوں نے اپنے ظالم و جابر حکمراں کے خلاف جو حکومت دہلی سے امداد کی درخواست کی تھی، حالات کے سیاق میں ایسا لگتا ہے کہ عرضی گزار سنار گاؤں کے رہنے والے تھے، کیونکہ غیاث الدین کا دار الحکومت وہیں تھا اور اسی کے خلاف عرضی پیش کی گئی تھی۔ اس حوالے سے ریاض السلاطین (میرے مطالعہ کی میز پر فی الحال ریاض السلاطین کا انگریزی ترجمہ، از: عبد السلام۔ مطبوعہ: دی باپٹسٹ مشن پریس، کلکتہ۔ ۱۹۰۲ء عیسوی ہے) صفحہ نمبر ۸۴ ر سے لیکر ۹۳ ر تک کے چیدہ چیدہ مقامات کا خلاصہ ملاحظہ فرمائیں:

شمس الدین کا بیٹا غیاث الدین جب تختِ بنگال پر متمکن ہوا تو اس نے اپنے ظلم و جبر سے رعایا کا جینا دوبھر کر دیا، آخر کار اس کی ستم رانیوں سے تنگ آ کر ریاست کے سرکردہ لوگوں نے حکومتِ دہلی کے پاس ایک عرضی بھیجی جس میں غیاث الدین کی زیادتیوں سے لوگوں کو نجات دلانے کی گزارش کی گئی۔ اس وقت تک دہلی کی سلطنت سلطان غیاث الدین تغلق کی گود میں جا چکی تھی۔ سلطان غیاث الدین تغلق ایک نیک دل اور عادل و فاضل شخص تھا، سو بنگال سے بھیجی گئی عرضی پر فوری نوٹس لیتے ہوئے ایک زبردست لشکر آراستہ کیا اور اس لشکر کے ساتھ بذات خود پیش قدمی کرتے ہوئے تھوڑے ہی وقت میں بنگال پہ چڑھائی کر دی۔ غیاث الدین ابن شمس الدین کے بھائی ناصر الدین، جو لکھنوتی کا فرماں روا تھا، نے اپنے اندر مقابلے کی سکت نہ دیکھتے ہوئے خود کو ڈھیر سارے تحفے تحائف کے ساتھ سلطان غیاث الدین کے سامنے پیش کر دیا۔ سلطان نے ناصر الدین کو شایان شان عزت دی اور لکھنوتی ہی کے تخت شاہی پر متمکن رہنے دیا؛ بعد ازاں، سلطان غیاث الدین نے اپنے منہ بولے بیٹے تاتار خان، گورنر مظفر آباد (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(گزشتہ صفحہ کا بقیہ حاشیہ) (نزد جونپور) کو ایک بھاری فوج کے ساتھ غیاث الدین کو پکڑ لانے کیلئے سنارگاؤں بھیجا۔ تا تارخان اپنی فوج کے ساتھ سنارگاؤں گیا اور تھوڑے ہی عرصے میں غیاث الدین ابن شمس الدین کو قید کر کے سلطان غیاث الدین تغلق کے روبرو پیش کر دیا۔ سلطان غیاث الدین تغلق نے سنارگاؤں کی فرماں روائی اپنے منہ بولے بیٹے تا تارخان کے حوالے کر دی اور خود غیاث الدین ابن شمس الدین کو قیدی بنا کر اپنے ساتھ لئے ہوئے دہلی کی طرف کوچ کیا۔ راستے میں ایک پڑاؤ کے دوران خیمے کی چھت اپنے اوپر گر جانے کی وجہ سے سلطان کی موت واقع ہوگئی۔ اس غم انگیز واقعہ کے بعد سلطان غیاث الدین تغلق کا بیٹا سلطان محمد شاہ تغلق (جونا خان) دہلی کے سریر تخت پر متمکن ہوا۔ سلطان محمد شاہ تغلق نے اپنے باپ کی موت کے بعد دریا دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے غیاث الدین ابن شمس الدین کو اس شرط پر آزاد کر دیا کہ وہ حکومت دہلی کا ماتحت بن کر رہے گا اور سکے و خطبے میں اپنے نام کے ساتھ سلطان دہلی کا نام بھی جاری کروائیگا۔ درباری امراء وغیرہ کے ساتھ بھی فیاضانہ سلوک برتتے ہوئے انہیں داد و دہش سے نوازا۔ اسی سلسلے میں اپنے ایک بہت ہی خاص امیر مَلِک بیدار خلجی کو "قادر خان" کا لقب دے کر، ناصر الدین کے وفات پا جانے کے بعد تخت لکھنوتی کے سونا رہ جانے کی وجہ سے، لکھنوتی کا نائب السلطنت مقرر کر دیا۔ ان سب مصروفیات سے فراغت کے بعد سلطان محمد تغلق نے تا تارخان کو، جسے سلطان غیاث الدین تغلق نے اپنی حیات میں سنارگاؤں کا گورنر مقرر کیا تھا، شایان شان عزت بخشتے ہوئے سو ہاتھی، ہزار گھوڑے اور ایک کروڑ سونے کے سکے عنایت کئے اور پھر شاہی چھتری، نوکر چاکر اور سنارگاؤں کی گورنری دے کر پورے عزت و احترام کے ساتھ اسے سنارگاؤں کی طرف روانہ کر دیا۔

اب واقعات کی ترتیب یوں دی جاسکتی ہے کہ ۱۳۲۴ء میں تو سلطان غیاث الدین تغلق نے غیاث الدین ابن شمس الدین فیروز شاہ کو گرفتار کرنے کے بعد تا تارخان کو سنارگاؤں کا گورنر مقرر کر دیا تھا مگر سلطان غیاث الدین تغلق کے ناگہاں حادثاتی موت کا شکار ہو جانے کی وجہ سے حالات یکسر بدل گئے۔ تا تارخان باپ کے آخری دیدار کے لئے دہلی آ گیا۔ نتیجے میں سنارگاؤں کی راج گدی تا تارخان کے وجود سے خالی رہی۔ سو وقت اور حالات کے تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے سلطان محمد تغلق نے ایک معاہدے کے تحت غیاث الدین کو رہا کیا اور سنارگاؤں کی حکومت پر بحال کر دیا۔ اس طرح سے غیاث الدین کو اپنی گرفتاری کے بعد بھی دوبارہ کچھ عرصے کے لئے حکومت کرنے کا موقع مل گیا۔ دوسری طرف سلطنت لکھنوتی کی فرماں روائی قادر خان کے حوالے کر دی گئی۔ اس (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کے عام ہو جانے اور خود اس کے ظلم و جبر [1] کی وجہ سے دہلی کی تغلق حکومت کی گرفت اپنی دور دراز صوبائی اکائیوں میں کمزور پڑ چکی تھی، سو موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ملک فخر الدین جو قادر خان کا ایک امیر تھا، نے غالباً ۱۳۳۸ء میں سنارگاؤں (شرقی بنگال) میں اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ اور پھر اس کے بعد جلد ہی لکھنوتی میں علی مبارک نام کے

(گزشتہ صفحہ کا بقیہ حاشیہ) طرح پورا صوبہ بھی بدامنی سے محفوظ ہو گیا اور صوبے میں دو الگ الگ جگہوں پر الگ الگ پایائے تخت ہونے کی وجہ سے جس سن میں غیاث الدین نے بنگال میں حکومت کی، اسی سن میں قادر خان کے لئے بھی بنگال کی فرماں روائی ممکن ہو گئی۔ پھر آگے چل کر غیاث الدین کو معطل کر کے یا اس کی موت کے بعد تا تار خان کو سنارگاؤں کا نائب السلطنت مقرر کر دیا گیا۔

اسی طرح بغرا خان کے بیٹے شمس الدین فیروز شاہ کے عہد حکومت (۱۳۰۱ء۔۱۳۲۲ء) ہی میں بغرا خان کے تین پوتے جلال الدین، شہاب الدین اور مذکورہ بالا غیاث الدین نے بھی جو حکومت کا لطف اٹھایا ہے، اُس کی تطبیق بھی اِسی طور پر ممکن ہے کہ اِن تینوں نے شمس الدین فیروز شاہ کے ماسوا والے دار الحکومت میں آخر الذکر ہی کے عہد میں حکومت کی ہے۔ (از: میزان)

1۔ سلطان محمد تغلق کا اصلی نام ''جونا خان'' تھا۔ تخت شاہی پر جلوس کے بعد اس نے اپنا نام ''ابوالمجاہد محمد شاہ'' رکھا۔ فرشتہ کے لفظوں میں وہ مجموعہ اضداد تھا۔ قاتل بھی تھا اور جاں بخش بھی، عالم بھی تھا اور علماء و مشائخ کا دشمن بھی، حافظ قرآن تھا، صوم و صلوٰۃ کا پابند تھا، یہاں تک کہ نوافل و مستحبات کو بھی کبھی نہ چھوڑتا۔ اگر کوئی نماز نہ پڑھتا تو اسے سخت ترین سزائیں دیتا۔ زندگی میں فقط ایک ہی شادی کی اور کبھی زنا کا بھی مرتکب نہ ہوا، سلطان المشائخ حضرت محبوب الٰہی کا مرید اور بڑا معتقد تھا۔ ان سب باتوں کے ساتھ بات بات پر خون کا دریا بھی بہانے لگتا۔ ابن بطوطہ نے اپنے مشہور زمانہ ''سفر نامہ'' میں سلطان محمد تغلق کے عادات و خصائل اور اخلاق و شمائل کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ: یہ بادشاہ خونریزی اور جا بیجا سخاوت میں مشہور ہے۔ کوئی دن خالی نہیں جاتا کہ کوئی فقیر امیر نہیں بن جاتا اور کوئی زندہ آدمی قتل نہیں کیا جاتا۔ اس کی سخاوت اور شجاعت، سختی اور خونریزی کی حکایات عوام الناس کی زبان زد ہیں۔ بایں ہمہ میں نے اس سے زیادہ متواضع اور منصف کسی اور کو نہیں دیکھا۔ شریعت کا پابند ہے اور نماز کی بابت بڑی تاکید کرتا ہے، جو نہیں پڑھتا اسے سزا دیتا ہے۔ (سفر نامہ ابن بطوطہ، اردو ترجمہ: رئیس احمد جعفری۔ مطبوعہ: نفیس اکیڈمی، اردو بازار، کراچی) از: میزان۔

ایک دوسرے امیر[1] نے قادر خان کو قتل کر دیا اور خود علاء الدین ابوالمظفر علی شاہ کا لقب اختیار کر کے ایک مختصر مدت کے لئے لکھنوتی کا بادشاہ بن بیٹھا۔ الیاس نامی ایک شخص نے بدلے میں اسے بھی قتل کر دیا اور بعدازاں، شمس الدین الیاس شاہ کے لقب سے پورے شمالی اور مغربی بنگال پر حکومت کرنے لگا۔

سلطان فخر الدین نے اپنی سال وفات ۱۳۴۹ء تک سنار گاؤں میں حکومت کی اور اس کی موت کے بعد اس کا بیٹا اختیار الدین غازی شاہ اس کا جانشیں بنا مگر دو یا تین سال بعد ۱۳۵۲ء میں الیاس شاہ نے آخر الذکر (یعنی سلطان فخر الدین کے بیٹے اختیار الدین غازی شاہ) پر فتح حاصل کر لی، اور اس طرح الیاس شاہ آخر کار پورے بنگال کا اکلوتا فرماں روا بن گیا۔

﴿تصویر نمبر:۱﴾ اختیار الدین غازی شاہ کے سکوں کے نمونے

(دائیں طرف: ۷۵۰ھ۔۔۔۔بائیں طرف: ۷۵۳ھ۔ تصاویر کے دونوں نمونے سنار گاؤں کے ہیں)

ان حریف بادشاہوں کے حوالے سے ریاض السلاطین کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں: کہتے ہیں کہ مَلِک علی مبارک، جس نے ایک بادشاہ کی حیثیت سے اپنا نام سلطان علاء الدین منتخب کیا تھا، دہلی کے فیروز شاہ سوم کا ایک قابل اعتماد خادم تھا جبکہ فیروز شاہ، سلطان غیاث الدین شاہ تغلق کا بھتیجا اور سلطان محمد شاہ کا چچازاد بھائی تھا۔ سلطان محمد شاہ نے اپنی حکومت کے پہلے ہی سال ملک فیروز کو اپنا چیف ایگزیکیٹیو افسر مقرر کر دیا تھا۔ اسی دوران حاجی الیاس نے جو علی مبارک کا رضاعی بھائی تھا، کچھ غلط کام انجام دیئے اور دہلی سے بھاگ نکلا۔ فیروز شاہ نے علی مبارک سے حاجی الیاس کی حرکت کے بارے پوچھا تو اب علی مبارک کو حاجی الیاس کی تلاش میں نکلنا پڑا، مگر تلاش بسیار کے باوجود اس کا کوئی

1۔ غلام حسینؔ کے مطابق قادر خان کو اس کے امیر علی مبارک نے نہیں بلکہ اس کے اپنے غلام فخر الدین نے قتل کیا تھا (ریاض السلاطین: انگریزی ترجمہ۔ صفحہ: ۹۳۔ مطبوعہ: باپٹسٹ مشن پریس، پارک اسٹریٹ، کلکتہ۔ سن اشاعت: ۱۹۰۲عیسوی۔ از: میزان

پتہ نہ پا کر علی مبارک نے ملک فیروز سے کہا کہ الیاس کہیں دور بھاگ گیا ہے۔سو اس بات سے ناراض ہوکر فیروز شاہ نے علی مبارک کی بڑی بے آبروئی کی اور اسے ملک بدری کا حکم دے دیا، اس وقت علی مبارک نے بنگال کا رخ کیا، راستے میں اسے ایک خواب نظر آیا جس میں اس نے مشہور صوفی بزرگ مخدوم جلال الدین تبریزی کو دیکھا۔مخدوم صاحب نے اس سے کہا کہ: میں تمہیں بنگال کی بادشاہت سونپ دونگا لیکن تمہیں میرے روضے کی تعمیر کرنی ہوگی۔علی مبارک نے اپنی شہادت کی انگلی اپنی آنکھ پر رکھی اور دریافت کیا کہ: آپ کے روضے کی تعمیر کہاں کرنی ہے؟ مخدوم صاحب نے فرمایا: شہر پنڈوہ میں، اُس جگہ پر جہاں تمہیں ایک دوسرے پر رکھی ہوئی تین اینٹیں نظر آئیں گی اور ان کے نیچے سو پتیوں والا ایک تازہ گلاب موجود ہوگا۔۔۔۔خیر! جب علی مبارک بنگال پہنچا تو اس نے لکھنوتی کے شاہی گورنر قادر خان کے یہاں ملازمت اختیار کر لی اور بہت جلد فوج کا کمانڈر بن گیا مگر جب فخر الدین نے قادر خان کے خلاف بغاوت کی اور اپنے آقا کو قتل کرنے کے بعد خودمختاری کا اعلان کر دیا تو دوسری طرف علی مبارک نے بھی سلطان علاء الدین کے لقب سے ایک خودمختار بادشاہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ پھر اس نے فخر الدین پر چڑھائی کی اور اپنے حاکم (قادر خان) کے قتل کا بدلا لے لیا۔[1] پھر لکھنوتی میں ایک محافظ فوج متعین کرنے کے بعد بنگال کے دگر حصوں کو زیردست کرنے کے لئے اس نے پیش قدمی کی، تاہم جب سے اس نے اپنے نام کے خطبے اور سکے جاری کئے اور کامیابی و کامرانی کے نشے میں مخمور ہوا تو اس کے ذہن سے حضرت مخدوم کے روضے کی تعمیر والی بات نکل گئی۔ایک شب حضرت مخدوم جلال الدین تبریزی پھر اس کے خواب میں رونما ہوئے اور فرمایا: علاء الدین! تو اب بنگال کا بادشاہ بن گیا ہے لیکن تو نے میرے الفاظ بھلا دیئے؟ چنانچہ یہ خواب دیکھنے کے بعد اگلے ہی روز جب شاہ علاء الدین نے

1۔ ماقبل میں قادر خان کا ذکر کرتے ہوئے خان صاحب نے جب کہا تھا کہ ''جب قادر خان کے ایک امیر فخر الدین نے سنارگاؤں میں خودمختاری کا اعلان کیا تو دوسری طرف قادر خان کے ایک اور امیر علی مبارک نے قادر خان کو لکھنوتی میں قتل کر دیا اور خود لکھنوتی کا بادشاہ بن گیا''۔۔۔۔تو اسی وقت حاشیہ میں ہم نے ریاض السلاطین کے حوالے سے بتایا تھا کہ قادر خان کو علی مبارک نے نہیں بلکہ اس کے غلام فخر الدین نے قتل کیا تھا۔دلچسپ بات یہ ہے کہ اب خود خان صاحب نے حالات کی عکاسی کے لئے ریاض السلاطین کا جو مذکورہ بالا اقتباس نقل کیا ہے، اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ قادر خان کو سلطان علاء الدین علی مبارک نے نہیں بلکہ فخر الدین نے قتل کیا تھا۔علی مبارک نے تو فخر الدین سے اپنے حاکم قادر خان کے خون ناحق کا بدلہ لیا تھا۔(از: میزان)

مبینہ اینٹوں والی جگہ کی تلاش کروائی تو اس جگہ کو بعینہ اسی طرح پایا جس طرح حضرت مخدوم نے خواب میں بتایا تھا۔سو اُس نے وہاں ایک روضہ کی تعمیر کروائی جس کے نشانات اب تک موجود ہیں۔

تقریباً انہی دنوں کی بات ہے کہ حاجی الیاس بھی کہیں سے پنڈوہ میں آ دھمکا، سلطان علاءالدین علی مبارک نے پہلے تو اسے کچھ دنوں کیلئے قید خانہ میں ڈال دیا لیکن پھر اس کی ماں کی سفارش پر جو سلطان علاءالدین کی بھی رضاعی ماں تھی، اسے معاف کر دیا اور ایک شاہی منصب عطا کر کے دربار میں بھی آنے کی اجازت دے دی۔ حاجی الیاس نے بہت ہی مختصر مدت میں فوج پر کنٹرول حاصل کر کے بعد خواجہ سراؤں کی مدد سے سلطان علاءالدین علی مبارک کو قتل کر دیا اور خود ''شمس الدین بھانگڑہ''[1] کے لقب سے خود مختار بادشاہ بن بیٹھا۔

1۔ یہ نام صحیح نہیں ہے۔ بھانگڑہ اگر اس کا عرفی نام بھی ہو تو بھی یہ اس بات کی طرف اشارہ کریگا کہ وہ بھنگ ہی کی ایک قسم ''حشیش'' کے استعمال کا عادی تھا۔ اصل میں الیاس کا پورا لقب تھا 'شمس الدنیا والدین ابوالمظفر الیاس شاہ'۔۔۔ واقعہ یہ ہے کہ علاءالدین، شمس الدین اور فیروز شاہ کے گزشتہ باہمی تعلقات کی تفہیم کے حوالے سے ریاض کی فراہم کردہ تفصیلات کافی زیادہ اہمیت تو رکھتی ہیں تاہم اس نے غالباً اندر کی کہانی پر زیادہ دھیان نہیں دیا۔

بوچانن ہملٹن کی .The 16th Cent. Persian Ms کے مطابق: علاءالدین کے دہلی چھوڑنے کی اصل وجہ یہ تھی کہ اس کے رضاعی بھائی حاجی الیاس نے فیروز کی ایک بیوی کو ورغلایا تھا، اس بات پر ناراض ہو کر فیروز شاہ نے علاءالدین کو بنگال کے گورنر عظمت خان کے پاس بھیج دیا (اعظم الملوک محمد بن تغلق کی جانب سے ستگاؤں میں مقرر کردہ گورنر کا نام)۔ راستے اس کی ملاقات شیخ جلال تبریزی سے ہوئی، شیخ نے پیشن گوئی کی کہ وہ بہت جلد بنگال کا بادشاہ جائیگا، اور شیخ نے گزارش کی کہ جب وہ تخت بنگالہ پر متمکن ہو جائے تو شیخ کیلئے لئے ایک خانقاہ کی تعمیر کرادے۔[1] بنگال پہنچنے کے بعد علاءالدین نے ممکنہ سزا یا قتل کی اذیت سے خود کو محفوظ رکھنے کے لئے گورنر کو قتل کر دیا اور ''مختار'' کے لقب سے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ مؤرخین کے مطابق یہ منصب علاءالدین کے پاس بیس سال کی ایک لمبی مدت تک برقرار رہا۔ کہا جاتا ہے کہ علاءالدین نے شیخ جلال الدین تبریزی کی باتیں بھلا دیں جس پر شیخ نے شمس الدین کو علاءالدین کے قتل پر مدد دی[2] پھر شمس الدین نے بادشاہ کا لقب اختیار کیا اور پنڈوہ کو اپنا دارالحکومت بنایا، وہاں شمس الدین نے ایک عظیم الشان محل کی تعمیر بھی کرائی اور پھر بہار کے گورنر ابراہیم کے خلاف جنگ کا محاذ بھی کھول دیا۔ شمس الدین کی جانب سے انجام دیئے گئے یہ اور اس طرح کے دیگر اقدامات نے ہی شمس الدین کے قدیم

آقا فیروز شاہ، جو ۱۳۵۱ عیسوی میں دہلی کا حکمراں بنا تھا، کو بنگال کے خلاف محاذ آرائی پر برانگیختہ کردیا۔(ایچ، ای، اسٹیپلٹن)

اسٹیپلٹن کا تعاقب: سب سے پہلے یہاں یہ واضح کردوں کہ اس ہیچ مداں مترجم کا یہ نوٹ اصل متن پرنہیں بلکہ اسٹیپلٹن کے متذکرہ بالا حاشیے پر ہے۔اس حاشیہ پر میں نے اپنا نقطہ نظر دو الگ الگ حصوں میں پیش کیا ہے جن پر ترتیبی نمبر لگا دیئے ہیں، سو اسی ترتیبی نمبر کے لحاظ سے متذکرہ حاشیہ پر راقم کا تاثر یا نقطہ نظر ملاحظہ فرمائیں۔

1۔اس مقام پر اسٹیپلٹن نے، ہیملٹن کے حوالے سے یہ بتایا کہ شیخ نے علاء الدین علی مبارک کے سامنے گزارش کی تھی کہ وہ جب بنگال کا بادشاہ بن جائے تو ان کے لئے ایک خانقاہ کی تعمیر کروادے۔ یہ بات محل نظر ہے۔اِس ضمن میں پہلی بات تو یہ ہے کہ خزینۃ الاصفیاء میں حضرت شیخ کی تاریخ وفات ۶۴۲ھ مطابق ۱۲۴۴ء درج ہے، یہی تاریخ سیر العارفین اور آئین اکبری میں بھی ملتی ہے۔تو اب اگر یہی تاریخ حضرت شیخ کی صحیح تاریخ وفات ہے تو ظاہر ہے کہ علی مبارک کی حضرت شیخ سے کبھی ملاقات ہی نہیں ہو پائی، کیونکہ علی مبارک نے تو ۱۳۳۸ء میں بنگال کی حکمرانی پائی تھی، تو اس حساب سے اگر علی مبارک کی حضرت شیخ سے کبھی ملاقات ہوئی ہو تو لازمی طور پر وہ ملاقات ۱۳۳۸ء سے کچھ عرصہ قبل ہی ماننی پڑیگی کیونکہ بنگال آنے کے کچھ عرصہ بعد ہی وہ بنگال کا فرماں روا بن گیا تھا۔حالانکہ مذکورہ بالا تاریخ وفات کے مطابق تو اِس مفروضہ وقتِ ملاقات سے ۹۴ برس قبل ہی حضرت شیخ کا انتقال ہو گیا تھا، تو اب انتقال کے ۹۴ برس بعد حضرت شیخ سے علی مبارک کی ملاقات اور پھر علی مبارک کے سامنے حضرت شیخ کے تعمیر خانقاہ کے حوالے سے اظہار خواہش کا بھلا کیا مطلب نکلتا ہے؟

ہاں! یہاں پر معاملے کا دوسرا رخ یہ ہے کہ ''ابن بطوطہ کہتا ہے کہ وہ خود ۷۴۶ھ مطابق ۱۳۴۵ء میں شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا'' (آب کوثر، شیخ محمد اکرام۔ص:۳۰۱، مطبوعہ: ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور)۔ظاہر ہے کہ یہ قول دیگر لوگوں سے بالکل مختلف اور متضاد ہے۔اسی لئے ''آب کوثر، ص:۳۰۲'' کے مطابق ''اس سفرنامہ کے انگریزی مترجموں (مثلاً پروفیسر گِب) نے قیاس کیا ہے کہ ''جس بزرگ کی ابن بطوطہ نے زیارت کی تھی وہ شیخ جلال الدین تبریزی نہ تھے بلکہ سلہٹ کے شیخ جلال تھے''۔لیکن جناب! گِب کا یہ نظریہ بھی محل نظر ہے، کیونکہ ابن بطوطہ نے کامروپ کا سفر ۷۴۶ہجری مطابق ۱۳۴۵عیسوی میں کیا تھا جبکہ ۷۴۰ہجری مطابق ۱۳۳۹عیسوی ہی کو یعنی سفرِ ابن بطوطہ سے ۶ سال پہلے ہی شاہ جلال سلہٹی کی وفات ہو چکی تھی۔تو بھلا ایسی صورت میں شاہ جلال سلہٹی سے ابن بطوطہ

کی ملاقات کیسے ممکن ہوسکتی ہے؟ دوسری بات یہ کہ ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامے میں تحریر کیا ہے کہ: یہ شیخ اپنے وقت کے قطب تھے، ان کی کرامتیں مشہور ہیں، عمر بھی ان کی بہت زیادہ ہے۔ وہ فرماتے تھے کہ میں نے خلیفہ مستعصم باللہ کو بغداد میں دیکھا ہے اور جس وقت وہ قتل کیا گیا وہ وہیں موجود تھے۔ اُن کا ۱۵۰ ربرس کی عمر پانے کے بعد انتقال ہوا اور چالیس سال سے وہ برابر روزے رکھتے تھے، دس دس دن کے ایک افطار کرتے تھے، بدن کے ہلکے تھے قد لانبا تھا اور رخسارے لگے ہوئے تھے، ان کے ہاتھ پر اس ملک کے اکثر باشندوں نے اسلام قبول کیا ہے (سفرنامہ ابن بطوطہ، اردو ترجمہ: رئیس احمد جعفری، نفیس اکیڈمی، کراچی)۔ ظاہر ہے کہ یہ حالات (لمبی عمر اور قیام بغداد وغیرہ) شیخ جلال تبریزی کے ہیں نہ کہ شیخ جلال سلہٹی کے۔ اس لئے گِب کا نظریہ بہرحال محل نظر ہے۔۔۔۔۔ خیر! دوسری بات کے طور پر اگر ابن بطوطہ کے مندرجات کو کلیۃً صحیح مان لیا جائے اور اس تناظر میں شیخ جلال الدین تبریزی سے علاء الدین علی مبارک کی ملاقات ممکن الوقوع بھی ہو جائے تو بھی شیخ جیسے بے نیاز، خوددار، پرہیزگار، پاکیزہ اخلاق، گوشہ نشیں، عابد، زاہد، حق آشنا اور فنا فی اللہ قطب زماں کے حوالے سے یہ گمان کیا جانا ناممکن سا لگتا ہے کہ انہوں نے ایک ''مائیول'' حکمراں کے سامنے چونے پتھر کی چند دیواروں کیلئے درخواست پیش کی ہوگی؟ میرا گمان نہیں، ایقان ہے کہ لہجے کے بین السطور سے جو سطحی تصور برآمد ہو رہا ہے وہ کم از کم حضرت شیخ کے شایان شان نہیں ہوسکتا۔ ہاں اتنی بات تسلیم کی جاسکتی ہے کہ قدیم زمانوں میں چونکہ خانقاہ تعلیم، تزکیہ، تربیت اور سماجی فلاح واصلاح کا ایک منظّم ادارہ ہوا کرتی تھی اس لئے شیخ نے اِن تعمیری مقاصد کو بروئے کار لانے کی نیت سے علی مبارک کے سامنے یا سپنے میں ایک خانقاہ کی تعمیر کے سلسلے میں درخواست نہیں، بلکہ اپنی خواہش کا اظہار کیا ہو۔

2۔ یہ بات ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ دراصل ہیملٹن ایک ایسے عہد اور ماحول کے پروردہ ہیں جہاں کی آب وہوا کلی طور پر خودغرض اور جہاں کا ماحول سراپا منتقم مزاج ہے، اس لئے شیخ کے حالات کی عکاسی کرتے ہوئے ہیملٹن نے اپنے عہد اور ماحول کی منتقم مزاجی کے رنگ وروغن کو شیخ کے احوال پر منطبق کردیا۔ وہ یہ فراموش کر گئے کہ شیخ کے دماغی آب وہوا کی جگہ ہم سے یکسر مختلف تھی، شیخ مرد مومن تھے، وفا ان کی فطرت تھی، ایقان ان کا مذہب تھا، ''نفرت'' ان کی نفرت تھی۔ سو جب ہیملٹن نے شیخ پر قلم اٹھایا تو ان پر یہ لازم تھا کہ وہ پہلے شیخ کے ذہنی ماحول کا ذوق ومزاج پیدا کر کے شیخ کے احوال کا مطالعہ کرتے، پھر اِس بات کا جائزہ لیتے کہ جو الزام وہ شیخ پر عائد کر رہے ہیں وہ فی الواقع ممکن بھی ہے یا نہیں؟ میرا ایقان ہے کہ اگر تحقیق وتلاش کا یہ بنیادی اسلوب اپنا لیا جاتا تو شیخ پر اتنا بڑا الزام عائد کرنے کی جرأت

نہ کی جاسکتی تھی۔ شیخ کے بارے میں چشتی سلسلے کی لگ بھگ تمام کتابوں میں ایک واقعہ درج ہے، وہ یہ کہ جب حضرت شیخ دہلی گئے تو اس وقت سلطان شمس الدین التمش نے بڑے تپاک کے ساتھ آپ کا استقبال کیا۔ یہ بات نجم الدین صغری کو، جو اس وقت شیخ الاسلام تھے، ناگوار گزری اور وہ آپ کی وقعت کو مجروح کرنے کے درپے ہوگئے۔ چنانچہ نجم الدین صغری نے گوہر نامی ایک طوائف کو پانچ سو اشرفیوں کے عوض اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ حضرت شیخ پر زنا کا الزام عائد کردے۔ سو جب الزام عائد ہوا تو معاملہ کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے سلطان التمش نے تمام مشاہیر اور مشائخ کو مدعو کیا۔ سلطان نے نجم الدین صغری سے کہا کہ آپ کسی کو اپنا ثالث مقرر کردیں۔ انہوں نے حضرت بہاؤالدین زکریا کو اپنا ثالث بنایا، ان کو خیال تھا کو حضرت بہاؤالدین زکریا کی شیخ سے نیشاپور میں کشیدگی ہوگئی تھی اس لئے فیصلے کے وقت وہ کشیدگی کارآمد ہوگی۔ گوہر حاضر ہوئی، آپ بھی بلائے گئے۔ جب آپ مسجد کے دروازہ میں داخل ہوئے تو سب آپ کی تعظیم کے لئے کھڑے ہوگئے، حضرت بہاؤالدین زکریا نے آگے بڑھکر آپ کی جوتیاں اپنے ہاتھوں میں اٹھالیں۔ اس موقع پر حضرت بہاؤالدین زکریا نے فرمایا کہ: میرے اوپر واجب ہے کہ میں شیخ جلال کی خاک پا کو اپنی آنکھوں کا سرمہ بناؤں کیونکہ وہ سات برس تک سفر و حضر میں میرے پیر و مرشد کی خدمت میں مقیم رہے ہیں۔ پھر جب حضرت بہاؤالدین زکریا نے گوہر سے حقیقت حال دریافت کیا تو اس نے مجمع کے سامنے ساری سچائی بتادی، نجم الدین صغری بڑے رسوا ہوئے۔ پھر کچھ عرصہ قیام کے بعد شیخ نے دہلی کو خیر باد کہا۔۔۔ اب قیام بدایوں کے زمانے میں ایک دن آپ دریا کنارے بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک اٹھ کر تازہ وضو کرنے لگے اور حاضرین سے فرمایا کہ آؤ، شیخ الاسلام دہلوی کی نماز جنازہ پڑھ لیں جن کا ابھی ابھی انتقال ہوا ہے۔ چنانچہ شیخ نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ نجم الدین صغری کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھی۔ (ملخصًا خزینۃ الاصفیاء، اردو ترجمہ، ص: ۹۴ تا ۹۸، مطبوعہ: مکتبہ نبویہ، گنج بخش روڈ، لاہور)

خدارا، انصاف! حضرت نجم الدین صغری نے شیخ کے ساتھ ایک ایسی نازیبا حرکت کی تھی کہ سوچ کر ہی کلیجہ منہ کو آتا ہے لیکن بایں ہمہ شیخ نے نہ صرف انہیں معاف کردیا بلکہ جب ان کا انتقال ہوا تو براہ کشف حالات کا پتہ لگا کر ان کی غائبانہ نماز جنازہ بھی پڑھی۔ کیا ایسا فنافی اللہ، مرد مومن اور قطب زمانہ کسی حاکم کے قتل کی سازش رچ سکتا ہے؟ وہ بھی چونے پتھر کی چند دیواروں کے لئے؟ وہ بھی زیر بحث حاکم کے ذہن سے تعمیر کی بات کے محض نکل جانے کی وجہ سے؟؟ **سبحان الله هذا بهتان عظيم** ۔سوچنے والی بات یہ بھی ہے کہ نہ تو شیخ کے تذکرہ نگاروں میں سے کسی نے

شمس الدین الیاس شاہ: (۱۳۳۹ء۔ ۱۳۵۸ء):

۱۳۵۲عیسوی کے بعد جب الیاس شاہ پورے بنگال کا بادشاہ بن گیا تو اس وقت ملک نے بڑی ترقی حاصل کی اور اس نے اپنی مملکت کی سرحدیں مغرب میں بنارس تک وسعت دے دیں۔اسی چیز سے برانگیختہ ہوکر تخت دہلی کے اُس وقت کے فرماں روا فیروز شاہ سوم نے شمس الدین کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔

شہنشاہ فیروز ۱۳۵۴عیسوی کو بنگال پہنچا اور الیاس شاہ نے شہر پنڈوہ کو چھوڑ کر اِکدالا کے قلعے میں جا کر پناہ لی۔ فیروز کے ساتھ ہو رہی جنگ میں الیاس کا بیٹا گرفتار ہو گیا اور شمسی سراج عارفؔ کے مطابق، بنگال فوج کے اسی ہزار ایک سو سپاہی موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔مؤرخوں نے لکھا ہے کہ مرنے والے سپاہیوں کی روتی بلکتی عورتیں جب بیتاب ہوکر قلعہ اِکدالا کی پشت پر جمع ہو گئیں تو فیروز شاہ نے وہاں نرمی کا برتاؤ کیا اور فوج کو جارحیت روک دینے کا حکم دیا۔۔۔۔۔۔جب قلعہ اِکدالا کا محاصرہ جاری تھا، راجہ بیابانی نامی ایک درویش کا انتقال ہو گیا۔الیاس شاہ اس

﴿تصویر نمبر:۲﴾ شمس الدین الیاس شاہ کے جاری کردہ سکوں کے نمونے
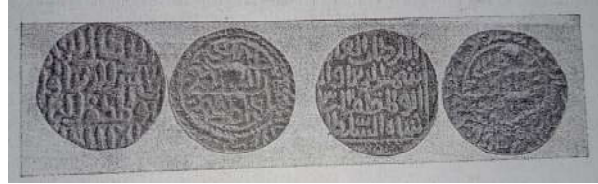
سکے کے سیدھے رخ پر:**السلطان العادل شمس الدنیا و الدین ابو المظفر الیاس شاہ السلطان**

سکے کے الٹے رخ پر:**سکندر الثانی یمین الخلافہ ناصر امیر المؤمنین**

دائیں طرف والے سکوں کے الٹے رخ کے حاشیے پر درج ہے:

ھذہ السکۃ بحضرت جلال سنارگاؤں۔ سنۃ ثلث و خمسین و سبع مأۃ من الھجرۃ النبویۃ (ٹکسال: سنارگاؤں ۔۷۵۳ء)

ایسی کسی بات کا ذکر کیا ہے اور نہ ہی معتمد تاریخ نویسوں میں سے کسی نے، حالانکہ اگر واقعتاً ایسی کوئی بات ہوئی ہوتی تو وہ بات اپنی نوعیت کے اعتبار سے اتنی غیر معمولی ہوتی کہ بہر حال کم از کم تاریخ نویسوں کے یہاں ہرگز بھی ناقابل ذکر نہ ہوتی۔۔۔۔ یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ اسٹیپلٹن نے یہ باتیں ہیملٹن کے حوالے سے رقم کی ہیں اور ہیملٹن ہرگز بھی کوئی ایسا مؤرخ نہیں ہے جس کی اطلاعات صوفی تاریخ میں معتبر گردانی جائیں۔(میزان)

درویش کی بے حد عزت کرتا تھا اس لئے اس کی موت کی خبر سن کر الیاس شاہ ایک بھکاری کے لباس میں قلعہ سے باہر آیا اور اس کی تجہیز و تکفین کے تمام رسومات ادا کر لینے کے بعد شہنشاہ فیروز سے اُس کی خیمہ گاہ میں جا کر ملاقات کی اور پھر اس کے بعد اکدالا لوٹ آیا۔ کہتے ہیں کہ شہنشاہ فیروز کو جب یہ باتیں معلوم ہوئیں تو وہ الیاس شاہ کی بہادری اور بے باکی پر نہایت درجہ خوش ہوا، سو جنگ اس شرط پر ختم کر دی گئی کہ الیاس شاہ حکومت دہلی کو خراج پیش کیا کریگا۔ اس کے بعد شہنشاہ فیروز نے الیاس شاہ کے بیٹے اور دیگر اسیران جنگ کو آزاد کرنے کا حکم دے دیا۔

صاحب ''طبقات اکبری'' کی پیش کردہ تفصیلات سے ظاہر ہوتا ہے کہ دہلی سے اکدالا تک پہنچنے میں فیروز شاہ کو تقریباً پانچ مہینے لگ گئے تھے اور پھر بنگال میں دو مہینے قیام کے بعد واپس دہلی جانے میں بھی اسے ساڑھے تین مہینے سے کچھ زیادہ کا وقت درکار رہا۔۔۔۔۔ اِکدالا میں موجود ''قلعہ'' کے محل وقوع کی شناخت کے حوالے سے مندرجہ ذیل بیانات کافی معلوماتی ثابت ہوں گے۔

ضیاء الدین برانی کہتے ہیں کہ قلعہ اِکدالا پنڈوہ کے قریب ہی موجود تھا، جبکہ صاحب ریاض السلاطین کا خیال یہ ہے کہ یہ قلعہ گور کے نزدیک واقع ہوا کرتا تھا۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ آگے چل کر حسین شاہ نے گور اور پنڈوہ کے مقابلے میں اکدالا کے قلعہ کو ترجیحی طور پر اپنی قیام گاہ بنایا تھا۔ شمسی سراج عارفؔ نے تو قلعہ اِکدالا کو 'جزیرہ اکدالا' سے تعبیر کیا ہے۔ ویسے مخدوم شیخ راجہ بیابانی کے روضے سے اکدالا کے محل وقوع کا صاف طور پر اندازہ لگایا جاسکتا ہے، کیونکہ جب فیروز شاہ کے ذریعے محاصرہ شدہ قلعہ سے حاجی الیاس بھیس بدل کر باہر آیا اور جنازہ میں شرکت کی تو ظاہر ہے کہ مخدوم بیابانی کا مقبرہ اکدالا سے نزدیک ہی بنا تھا اور آج کی تاریخ میں 'مقبرہ مخدوم بیابانی' کی پہچان 'بول باڑی' میں کی جاتی ہے جو ادینہ مسجد کے مشرق میں ۴ میل کی دوری پر واقع ہے۔ اس لئے یہ بات تیقن کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ قلعہ اِکدالا پنڈوہ ہی سے قریب تھا۔۔۔۔۔ صاحب ریاض السلاطین کی رائے کے تعلق سے غالب گمان یہ ہے کہ انہوں نے بِسان کوٹ میں واقع 'پرانا قلعہ' یا مورچہ میں واقع 'کالا پہاڑ گڑھی' کو اکدالا کا قلعہ خیال کر لیا ہوگا جس کی تعمیر غیاث الدین عیاض نے کرائی تھی اور جو اب پنڈوہ کے مغرب میں آٹھ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ قلعہ اکدالا کی جو تفصیلات قدیم مؤرخوں نے فراہم کی ہیں وہ موجودہ منظر نامے کے عین مطابق ہے۔ مثلاً قلعہ کا محل وقوع ایک خاکی فصیل سے گھرا ہوا ہے اور مرکزی حصہ بالکل ایک جزیرہ کی طرح ہے۔ قلعے کے شمالی حصے میں مشرق سے دور مغرب تک پھیلی ہوئی ایک وسیع ترین جھیل ہے اور مغربی حصے میں اِکبنّہ (Ekbanna) کا گھنا جنگل ہے جس سے اس زمانے میں قلعے کی حفاظت کی جاتی تھی۔ جنوب میں یہ قلعہ ایک آبی گزرگاہ کے ذریعے کالندری ندی کے ساتھ متصل ہو جاتا تھا۔

تاریخ فرشتہ کے مطابق اکدالا کا قلعہ گنگا سے تقریباً سات کوس کے فاصلے پر واقع تھا اور زیر بحث جگہ تاہنوز گنگا سے کم و بیش اتنے ہی فاصلے پر واقع ہے۔ کہا جاتا ہے کہ فیروز شاہ نے مورچہ کے مشرق میں چَودوار (Chauduaar) کے مقام پر پڑاؤ ڈالا تھا جہاں پر آج تک کچھ ایسے ٹیلے موجود ہیں جو یقینی طور پر فیروز شاہ کے توپوں کی جائے نشست کو بتاتے ہیں۔[1]

صاحب ریاض السلاطین کے مطابق فیروز شاہ کے ساتھ جنگ آزمائی کے بعد سلطان شمس الدین نے متعدد بار دہلی کے دربار میں اپنا سفارتی نمائندہ بھیجا۔ اس نے اپنی زندگی میں اپنا آخری سفارتی نمائندہ مَلِک تاج الدین کو ۵۸ ۷ھ مطابق ۱۳۵۷ء میں ڈھیر سارے تحفے تحائف کے ساتھ دہلی بھیجا تھا، بدلے میں سلطان فیروز شاہ نے بھی

1۔ مورچہ۔ اِکدالا سے متعلق پیش کردہ تجویز اگر صحیح ہے تو یہ اس بات پر دال ہے کہ الیاس شاہ نے پیچھے ہٹنے کی بجائے ایک ایسی پوزیشن پر قبضہ جمانے کے لئے آگے کی طرف بڑھا ہوگا جو گور اور پنڈوہ دونوں کا احاطہ کر سکے۔ اِس سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ پنڈوہ کیوں لوٹا نہیں گیا تھا؟ تاہم اس ضمن میں سب سے اہم اعتراض یہ ہے کہ مورچہ کے نواحی علاقوں میں کہیں بھی ''اِکدالا'' نام کی کوئی جگہ تاہنوز نظر نہیں آئی۔ وثائق پنڈوہ، جہاں سے بوچانن ہیملٹن اور فرینکلِن نے تاریخ بنگال کی تفصیلات کو اخذ کیا ہے، میں مذکور ہے کہ الیاس شاہ نے ''گھوڑا گھاٹ'' میں پڑاؤ ڈالا تھا۔ مجھے ویسٹ میکوٹ (جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ۱۸۷۴ء، ص: ۲۴۴، ۲۴۵) کے ساتھ زیادہ اتفاق ہے کہ اِکدالا، پنڈوہ کے شمال میں ۲۳ ر کیلومیٹر اور گھوڑا گھاٹ کے مغرب میں ۱۵ ر کیلومیٹر کے فاصلے پر ضلع دیناجپور میں موجود ایک جگہ کا نام ہے۔ اس جگہ کے ایک حصے کو تاہنوز قصبہ (قلعہ یا شہر پناہ) کہا جاتا ہے۔ ویسے صرف ویسٹ میکوٹ کی تجویز پر انحصار نہ کرتے ہوئے کہ یہی جگہ دراصل تاریخ کا اکدالا ہے، میں نے خود اصلی جگہ میں جا کر اس بات کی تصدیق کر لی ہے۔ تاہم بوچانن ہیمِلٹن کا بیان اس ضمن میں یہ ہے کہ حسین شاہ نے رائے گنج کے قریب ایک جگہ میں، جس کو اب تک 'چھوٹا پَروا' کہا جاتا ہے، اپنی ایک الگ رہائش گاہ بنوائی تھی جو اِس تاریخی اِکدالا کے شمال میں ۱۸ ر کیلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔۔۔ بولباڑی، بالیہاری گاؤں کا مقامی نام ہے مگر ایک سوال کے جواب میں مسٹر ایم، کارٹر آئی، سی، ایس، سِٹلمِنٹ افسر مالدہ کی جانب سے دی گئی اطلاعات کے مطابق شیخ کا مزار خطے کے شمالی حصے پر واقع الماس پور نامی گاؤں میں موجود ہے۔ شیخ کو گاؤں والے حضرت بیابانی یا سِکرا پیر کے نام سے پکارتے ہیں۔ (ایچ، ای، اسٹپلِٹن)

دہلی سے عربی وتر کی نسل کے گھوڑے مع دیگر قیمتی ساز وسامان ارسال کئے مگران تحائف کے پہنچنے سے پہلے ہی بنگال میں سلطان شمس الدین کی وفات ہو چکی تھی۔اسی سال شمس الدین الیاس شاہ کے بیٹے سکندر شاہ کے نام پر سکوں کا وجود بھی مذکورہ نتیجے کو یقینی بناتا ہے۔

سکندر شاہ اول:(۱۳۵۸ء۔۔۱۳۹۰ء):

کہتے ہیں کہ سکندر شاہ کا قد اس کے اپنے ہی بازو کے ناپ کے مطابق چھ فٹ تھا جس کی وجہ سے عام طور پر لوگ اسے سکندر چوہٹا کے نام سے پکارتے تھے۔سکندر شاہ کی تخت نشینی کے بعد اُسی سال فیروز شاہ نے ایک بار پھر بنگال پر حملہ کیا تاہم چالیس ہاتھی مع دیگر تحائف دیکر اُسے پیچھے ہٹنے پر راضی کرلیا گیا اور پھر اُس کے بعد سکندر شاہ کی حکومت ایک انتہائی پرسکون اور کامیاب حکومت ثابت ہوئی۔سکندر شاہ نے اپنی حکومت کے کئی سال ''ادینہ مسجد'' کی تعمیر میں صرف کئے۔

﴿تصویر نمبر۳﴾

انڈین میوزیم کیبینیٹ میں رکھے ہوئے سکندر شاہ کے دو سکوں کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے جن میں سے پہلا چاولستان یا کامرو میں ڈھالا گیا ہے جبکہ دوسرا سنارگاؤں میں۔دونوں کی تاریخ ضرب ۷۵۹ھ ہے۔

سکے کے درمیانی حصے کی تحریر: **يمين خليفة الله ناصر امير المؤمنين**

حاشیہ کی تحریر: **ضرب هذه السكة**، ملک چاولستان عرف اَرسہ کامرو۔**سنة تسع و خمسين و سبع مأة**

(دائیں ہاتھ والے سکے پر ''حضرت جلال سنارگاؤں'' درج ہے)۔

غیاث الدین اعظم شاہ:(۱۳۹۰ء۔۔۱۴۱۰ء):

غیاث الدین نے تخت پر بیٹھنے سے پہلے کئی سال تک مشرقی بنگال میں اپنے والد سکندر شاہ کی مخالفت کی۔بالآخر، والد کے خلاف پیش قدمی کرتے ہوئے ایک بھاری فوج کے ساتھ گوال پارہ جو ممکنہ طور پر ادینہ مسجد کے جنوب مغربی حصے میں تین کیلومیٹر کی دوری پر واقع گاؤں کا نام تھا، میں حملہ آور ہوا جہاں تقریباً ۱۳۹۰ء میں سکندر شاہ کو قتل کر دیا گیا۔

غیاث الدین کے حالات:

غیاث الدین ایک اچھا حکمراں اور فرامینِ قرآن پرسختی کے ساتھ عمل کرنے والا شخص تھا۔اس بات کے ثبوت میں ریاض السلاطین میں موجود اُس سے متعلق یہ حکایت کافی ہوگی۔ایک دن کی بات ہے کہ بادشاہ مشقیہ تیراندازی سے اپنا دل بہلا رہا تھا کہ اتفاقی طور پر اس کے ایک تیر سے ایک بیوہ عورت کا بیٹا زخمی ہوگیا، وہ عورت بلا تاخیر قاضی سراج الدین کی خصوصی عدالت میں پہنچ گئی اور بادشاہ کے خلاف مقدمہ دائر کردیا۔قاضی سراج الدین کافی پریشان ہوئے اور سوچنے لگے کہ اگر عدالت میں حاضری کیلئے بادشاہ کے نام سمن جاری کروں تو نافرمانی کا خطرہ مول لوں گا اور اگر اس کے جرم کو نظرانداز کردوں تو اپنے فرض منصبی کے ساتھ وفا نہ کرنے کے جرم میں ایک دن اللہ کی عدالت سے جواب دہی کے لئے میرے نام پر سمن (پروانہ طلبی) جاری کیا جائے گا۔بالآخر کافی غوروخوض کے بعد انہوں نے ایک چپراسی کو حکم دیا کہ وہ بادشاہ کے پاس جائے اور بیوہ عورت کی عرضی پر جواب دہی کے لئے اُسے پروانہ طلبی (Summon) دے آئے۔اب بادشاہ تک رسائی کو ناممکن دیکھ کر وہ چپراسی مسجد کے مینار پر چڑھا اور ناوقت اذان پکار دی۔اس ناوقت اذان کی آواز کو سن کر بادشاہ نے اپنے کچھ محافظین کو حکم دیا کہ وہ اس شخص کو فوراً اُس کے سامنے حاضر کریں جس نے اس طرح شعار دین کا مذاق اڑایا۔

چنانچہ جب اُس چپراسی کو دربارِشاہی میں حاضر کیا گیا تو اُس نے مختصراً سارے حالات بیان کئے اور قاضی کی عدالت میں حاضری کا حکم نامہ بادشاہ کے سامنے پیش کردیا۔بادشاہ نے فوراً ہی تعمیل حکم کی۔چنانچہ جب بادشاہ قاضی کی عدالت میں پہنچا تو قاضی (سراج الدین) نے بادشاہ کو کسی بھی طرح کی کوئی عزت نہ دیتے ہوئے اپنی اونچی آواز میں کہا کہ: تم نے اِس غریب بیوہ کے بیٹے کو زخمی کیا ہے، اس لئے تمہیں یا تو بلاتاخیر اسے مناسب جرمانہ ادا کرنا ہے یا پھر قانونی سزا بھگتنی ہے۔بادشاہ نے عدالت کے سامنے آداب بجالایا اور بیوہ عورت کے پاس جاکر اُسے اتنے پیسے دیئے کہ وہ راضی ہوگئی۔اس کے بعد بادشاہ نے کہا: قابل احترام قاضی صاحب! عرضی دائر کرنے والی نے مجھے معاف کردیا ہے۔قاضی سراج نے اس عورت سے پوچھا کہ: کیا یہ بات صحیح ہے اور کیا آپ راضی ہوگئی ہیں؟ عورت نے جواب دیا، ہاں! اب میں راضی ہوں۔اس کے بعد قاضی سراج اپنے مسند عدالت سے نیچے اترے اور بادشاہ کے روبرو سلامی پیش کی، اس وقت بادشاہ نے اپنے لباس کے اندر سے ایک تلوار باہر نکالتے ہوئے کہا کہ قاضی صاحب! مقدس قوانین کے شارح ہونے کی وجہ سے آپ کے حکم کو بجا لاتے ہوئے میں فوراً آپ کی عدالت میں حاضر ہوا لیکن اگر میں یہاں یہ پاتا کہ آپ نے اپنے فرض کی ادائیگی کے سلسلے میں ذرا بھی کوتاہی برتی ہے تو بخدا آپ کا سرتن سے

جدا کر دیتا، میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ سارے معاملات احسن طریقے پر انجام پذیر ہوئے اور یہ کہ میری سلطنت میں ایک ایسا قاضی موجود ہے جو قانون کی بالاتری پر کسی کو فوقیت نہیں دیتا۔ قاضی سراج نے اس وقت ایک کوڑا اٹھاتے ہوئے کہا کہ: میں بھی رب واحد کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر آپ نے شریعت کے احکام پر عمل نہ کیا ہوتا تو یہ کوڑا آپ کی پشت کو سرخ اور سیاہ بنا دیتا، ہم دونوں کیلئے یہ ایک آزمائش کا دن تھا۔ قاضی سراج نے مزید کہا کہ: ایک مصیبت آپڑی تھی جو بخوبی رفع ہوگئی۔ بادشاہ بہت خوش ہوا اور دیانت دار و فرض شناس قاضی کو کافی سارے انعامات سے نوازا۔

غیاث الدین ایک زندہ دل اور خوش مزاج انسان تھا مگر ایک مرتبہ مشرقی بنگال میں کچھ مدت تک شدید بیماری میں مبتلا رہنے کی وجہ سے جب وہ اپنی زندگی سے مایوس ہو گیا تو اس نے وصیت کی کہ جب وہ مر جائے تو اس کی تین چہیتی کنیزیں جن کے نام سرو، گل اور لالہ تھے، ہی اُسے غسل دیں۔ اب کچھ عرصہ کے بعد بادشاہ تو صحت یاب ہو گیا تاہم حرم کی دوسری عورتوں نے اُن تینوں چہیتی کنیزوں پر حسد کی وجہ سے ''غسالہ'' کا لقب داغ دیا، سو اِس بات سے پریشان ہو کر اُن تینوں چہیتیوں نے بادشاہ کے پاس اس بات کی شکایت کر دی۔ کچھ دیر کے غور و فکر کے بعد بادشاہ نے موقع کی مناسبت سے یہ مصرع کہا۔۔۔ ع

''ساقی حدیث سرو و گل و لالہ میرود''

''ساقی! یہ سرو، گل اور لالہ کی داستاں ہے''۔۔۔ مگر متعدد بار کوشش کرنے کے باوجود سلطان غیاث الدین شعر کو مکمل نہ کر سکا اور نہ ہی اس کے درباری شاعروں میں سے کسی کی تضمین سے اس کی تشفی ہو پائی۔ بالآخر اس نے مصرع کو لکھا اور ایک خصوصی پیغام رساں کی معرفت بیش قیمت تحائف کے ساتھ ۱۳۸۸ء میں مشہور شاعر حافظ شیرازی [1]

1۔ حافظ شیرازی کا نام محمد، لقب شمس الدین اور تخلص حافظ تھا۔ ایران کے شہر شیراز کے رہنے والے تھے، اِسی مناسبت سے نام کے ساتھ ''شیرازی'' اسم منسوب کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ ماشاء اللہ، حافظ قرآن تھے سو اپنا تخلص ''حافظ'' رکھ لیا۔ تاریخ پیدائش کے بارے میں اختلاف ہے تاہم زیادہ تر لوگوں نے ۷۲۶ھ پر اعتماد کیا ہے۔ حافظؔ نے شیخ مجد الدین، شیخ بہاؤ الدین، سید شریف جرجانی اور شمس الدین عبداللہ شیرازی وغیرھم سے استفادہ کیا اور تمام علوم متداولہ حاصل کئے۔ الہیات، حکمت، تفسیر اور فقہ ان کی دلچسپی کے خصوصی مضامین تھے۔ علم ہندسہ اور موسیقی سے بھی خاصا لگاؤ تھا۔ آپ کے باوقار معاصرین نے آپ کو مولانا الاعظم، استاد تحاریر الادباء اور فخر العلماء جیسے ذیشان القابات سے یاد کیا ہے۔ حافظ کے حالات زندگی کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ سلطان غیاث الدین کے علاوہ برصغیر

کی خدمت میں بھیج دیا۔ پیام رساں کو اس نے یہ بھی اختیار دے دیا کہ وہ حافظ شیرازی کے سامنے ہر وہ پیش کش رکھے جو انہیں بنگال کے دربار میں تشریف لانے اور یہاں اقامت اختیار کرنے پر آمادہ کر سکے۔

کہتے ہیں کہ سلطان غیاث الدین کا ایلچی جیسے ہی شیراز پہنچا، حافظ شیرازی نے حالات سے متعلق کسی بھی شخص کی جانب سے کوئی اطلاع یا آگاہی حاصل کئے بغیر محض اپنے روحانی کشف کی بنیاد پر دوسرا مصرع جوڑتے ہوئے یوں فرمایا۔۔۔ع

''ویں بحث با ثلاثه غساله میرود''

''یہ بحث تین غسالہ سے متعلق چل رہی ہے''۔۔۔۔۔۔اس کے بعد حافظ شیرازی نے تضمینی طور پر ایک پوری غزل لکھ دی جواب تک ان کے دیوان میں موجود ہے۔ اس غزل کے ہر شعر میں ''ردیف''[1] کا لفظ ''میرود'' ہے۔ فارسی زبان میں کہی گئی اصل غزل یہاں پیش کی جارہی ہے۔

(واضح رہے کہ اپنی کتاب میں خان صاحب نے ایچ، بیکنیل کی طرف سے کیا گیا زیرِ نظر غزل کے پہلے تین، پانچوے، اور آخری شعر کا آزاد انگریزی ترجمہ پیش کیا ہے لیکن ہم اپنے قارئین کے ذوق کے پیشِ نظر پوری غزل کا سلیس اردو ترجمہ پیش کر رہے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ غزل کا نواں شعر کتاب میں ندارد تھا، ہم نے اسے ''دیوان حافظ'' سے یہاں نقل کر دیا ہے۔از: میزان)

سے محمود شاہ دکنی نے بھی حافظ شیرازی کو اپنے دربار میں آنے کی دعوت دی تھی، حتیٰ کہ محمود شاہ نے اس کیلئے زادِ راہ بھی ارسال کیا تھا مگر ایک تو شیراز کی محبت آڑے آئی اور دوسری سفر کی صعوبتوں سے فرار کے لئے حافظ نے وہاں آنے سے بھی انکار کر دیا تھا تاہم محمود شاہ کی خدمت میں بھی ایک غزل لکھ کر ارسال کر دی تھی۔ حافظ کا عظیم تخلیقی کارنامہ اُن کا دیوان ہے جو غزلیات، قصائد، قطعات اور رباعیوں پر مشتمل ہے۔ علاوہ ازیں انہوں نے قرآن مجید کی تفسیر بھی تحریر کی، حافظ کے ایک معاصر محمد گل اندام کے بقول حافظ نے کشاف اور مصباح کے حواشی بھی تحریر کئے تھے۔ ۷۹۱ھ میں شیراز کے مقام پر حافظ نے وفات پائی اور مصلی کے مقام پر دفن ہوئے جہاں ان کا مزار آج ہر خاص و عام کے لئے زیارت گاہ ہے۔ (از: میزان)

1۔ وہ لفظ یا الفاظ جو حمد، نعت، غزل یا قصیدے کے اشعار میں قافیہ کے بعد بار بار آئیں، انہیں ''ردیف'' کہتے ہیں۔ (از: میزان)

﴿غزل﴾

ساقی حدیث سرو وگل ولالہ میرود	ویں بحث باثلاثہ غسالہ میرود
مئے دہ کہ نوعروس چمن حد حسن یافت	کارایں زماں زصنعت دلّالہ میرو
شکرشکن شوند ہمہ طوطیان ہند	زیں قند پارسی کہ بہ بنگالہ میرود
طی مکاں ببیں وزماں درسلوک شعر	کایں طفل یکشبہ رہ یکسالہ میرود
باد بہاری وزداز بوستان شاہ	وزژالہ بادہ درقدح لالہ میرود
آں چشم جادوانہ عابدفریب بیں	کش کاروان سحر بدنبالہ میرود
خوی کردہ می خرامد وبرعارض سمن	ازشرم روئے اوعرق ازژالہ میرود
ایمن مشوزعشوہ دنیا کہ ایں عجوز	مکارہ می نشیند ومحتالہ میرود
چوں سامری مباش کہ زرداداز خری	موسی بہشت واز پئے گوسالہ میرود
حافظ زشوق مجلس سلطان غیاث دیں	خامش مشوکہ کارتوازنالہ میرود

ترجمہ: (۱) ساقی! یہ سرو، گل اور لالہ کی داستاں ہےاور یہ بحث تین غسالہ کے ساتھ ہورہی ہے۔(۲) ساقیا! شراب پلا کہ چمن کی نئی دلہن نے کمالِ درجہ کا حسن پایا ہے، اوراس زمانے میں کام دلّالہ کی کاریگری سے چلتا ہے۔ (۳) تمام طوطیان ہند اِس پارسی قند سے جو بنگال کو جارہی ہے، شکرخور ہوجائیں گے۔(۴) شعر کے سلوک میں زمان ومکاں کے سمٹتے ہوئے فاصلے کودیکھ، اس لئے کہ یہ ایک رات کا بچہ ایک سال کے راستے پرجارہا ہے۔(۵) شاہ کے گلشن سے بادِ بہار چلتی ہے اور شبنم کے ذریعے لالہ کے پیالے میں شراب بھرتی ہے۔(۶) اس سحرآگیں، عابد ِ فریب نظر کودیکھ کہ جادو کا قافلہ اس کے پیچھے پیچھے چلتا ہے۔(۷) پسینے میں تر وہ کچھ اس طرح نازوادا سے چلتا ہے کہ اس کے چہرے کی حیا کی وجہ سے چنبیلی کے رخسار پر شبنم کا پسینہ بہتا ہے۔(۸) اے صاحب! دنیا کی ادا سے مطمئن نہ ہواس لئے کہ یہ بڑھیا مکاربن کربیٹھتی ہے اور حیلہ گری کرتی چلی جاتی ہے، (۹) سامری کی طرح نہ بن کہ اس نے اپنی حماقت سے سونا دے دیا، موسی کو چھوڑا اور ایک بچھڑے کے پیچھے چلتا بنا، (۱۰) اے حافظ! سلطان غیاث الدین کی مجلس کے شوق میں خاموش نہ بیٹھ، اس لئے کہ تیرا کام آہ وزاری سے چلتا ہے۔

حافظ شیرازی گرچہ ممکنہ طور پر سلطان غیاث الدین کی دعوت کوقبول کرنا چاہتے تھے لیکن طویل مسافت کے خوف

سے انہوں نے بنگال کے شاہی دربار میں تشریف لانے کی سلطان کی خواہش کوٹھکرادیا۔ سلطان غیاث الدین حضرت شیخ نور قطب العالم کے درسی رفیق بھی تھے۔ دونوں نے حضرت حمید الدین کے پاس ایک ساتھ دینیات کی کتابیں پڑھی تھیں۔

نائبین غیاث الدین:

غیاث الدین کی وفات کے بعد اگر چہ اس کا بیٹا سیف الدین ہمزہ شاہ اس کا جانشیں مقرر کیا جا چکا تھا تاہم اِس دوران ایک مختصر عرصہ ہندو فرماروائی کا بھی نظر آتا ہے۔ سیف الدین نے ممکنہ طور پر ۱۴۱۱ عیسوی سے لیکر ۱۴۱۲ء تک ایک بہت ہی قلیل عرصہ میں حکومت کی۔ سکوں پر اس کا نام ابوالمجاہد ہمزہ شاہ ابن اعظم شاہ کندہ تھا، اور جو سکے اس کی طرف سے جاری کئے گئے وہ فیروز آباد یعنی پنڈوہ ہی میں ڈھالے گئے تھے۔

سیف الدین کے بعد اس کا ایک معتمد شمس الدین عرف شہاب الدین بایزید شاہ نے تخت پر قبضہ جمالیا اور ممکنہ طور پر دو یا تین سال تک حکومت کی (۱۴۱۲ء۔۔ ۱۴۱۴ء)۔ نظام زر کا مطالعہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ ۸۱۷ ہجری مطابق ۱۴۱۴ عیسوی میں علاء الدین فیروز شاہ اپنے باپ شہاب الدین کا جانشیں بنا، تاہم جانشینی کے بعد اس نے ایک بہت ہی مختصر مدت، شاید ایک سال سے بھی کم عرصہ تک، کی زندگی پائی۔ (Coins and chronology of the Early Independent Sultans of Bengal از: نالینی کانتا بھٹا سالی، کی پلیٹ نمبر ۶ /اور ۷/میں بایزید اور فیروز شاہ کے سکوں کے نمونے ملاحظہ فرمائیں) دیکھا جائے تو آخر الذکر تینوں سلاطین درحقیقت ایک معتمد خاص راجہ کانس یا گنیش جس نے سلطان غیاث الدین کی موت کے بعد ہی حکومت بنگال کو اپنے کنٹرول میں کرلیا تھا، کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنے ہوئے تھے۔ راجہ گنیش نے اب مسلمانوں پر ظلم وستم بلکہ ان کا قتل عام شروع کردیا۔ یہ اور اس طرح کے دیگر مظالم ہی نے شیخ نور قطب عالم جو مرحوم سلطان اور اس کی رعایا دونوں کے روحانی رہنما تھے، کے صبر وتحمل کے پیمانے کولبریز کردیا، حتی کہ انہوں نے جون پور کے سلطان ابراہیم شرقی کو ملک بنگالہ پر چڑھائی کی دعوت بھیج دی۔ چنانچہ سلطان ابراہیم ایک بھاری فوج کے ساتھ بنگال پہنچا اور فیروز پور، اولڈ مالدہ میں اپنا پڑاؤ ڈالا۔ اس خبر کوسن کر راجہ کانس کے ہوش اڑ گئے، سو وہ دوڑتا بھاگتا شیخ نور قطب عالم کی خدمت میں پہنچ کر معافی مانگنے لگا اور روتے ہوئے عرض کیا کہ: اس گنہگار کے پورے صفحہ جرم پر معافی کا قلم چلا دیجئے اور سلطان ابراہیم کو ملک کی تاراجی سے روکئے۔ اس پر شیخ نے جواب دیا کہ: ایک بے دین مجرم کی جانب سے سفارت کے لئے میں ایک مسلم حکمراں کے

سامنے کھڑا نہیں ہوسکتا، بالخصوص ایک ایسے حکمراں کے سامنے جو میری ہی گزارش اور خواہش پر وارد ہوا ہو۔ آخر مایوس ہوکر راجہ نے اپنا سر شیخ کے قدموں میں جھکاتے ہوئے کہا کہ: شیخ جو کچھ بھی ارشاد فرمائیں، میں بجا آوری کیلئے تیار ہوں۔ شیخ نے جواباً فرمایا کہ: جب تک تو اسلام کو گلے نہیں لگاتا، میں تیرے لئے سفارش نہیں کرسکتا۔ راجہ پہلے تو اس شرط پر راضی ہوگیا لیکن بعد میں گمرہی کے کنویں میں ڈوبے ہوئے اِس شخص کو اس کی بیوی کی طرف سے گمرہی کی مزید گہرائی میں دھکیل دیئے جانے پر اس نے قبول اسلام سے انکار کردیا، تاہم اس نے اپنے بیٹے جادو کو، جو اس وقت بارہ سال کا تھا، شیخ کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے کہا کہ: میں تو اب بوڑھا ہو چکا ہوں اور کسی بھی وقت دنیا سے کوچ کرنے والا ہوں، اس لئے آپ میرے بیٹے کو داخل اسلام کرلیجئے اور بنگال کی سلطنت اسی کو عطا کردیجئے۔ اس پر شیخ نے جادو کو مشرف با اسلام کیا اور اس کا نام جلال الدین رکھتے ہوئے یہ بات شہر میں مشتہر کروادی اور ساتھ ہی اس بات کا بھی حکم دیا کہ سلطنت بنگال کے خطبے میں اب سے اسی کا نام پڑھا جائے۔ چنانچہ اسی دن سے شہر میں ایک بار پھر دستور اسلامی کا نفاذ عمل میں آ گیا اور حضرت نور قطب العالم، سلطان ابراہیم سے ملاقات کیلئے تشریف لے گئے۔ معذرت خواہی کے بعد شیخ نے سلطان ابراہیم سے پڑاؤ اٹھالینے کی درخواست کی جس پر برہم ہوکر سلطان ابراہیم جون پور واپس چلے گئے۔

سلطان ابراہیم، جون پور کے بنگال چھوڑنے کے کچھ ہی دنوں بعد راجہ کانس نے اپنے بیٹے سلطان جلال الدین کو معزول کردیا اور خود دوبارہ تخت پر بیٹھ گیا۔ اپنی مذہبی ہدایات کے مطابق راجہ نے گائے کے بہت سے سونے کے مجسمے بنوائے اور ان مجسموں کے کھوکھلے اندرونی حصے سے جلال الدین کو گزارنے کے بعد ان مجسموں کے سونے برہمنوں کے درمیان تقسیم کروادیئے۔ اس طرح نظری حیثیت سے اس نے اپنے بیٹے کو دوبارہ اپنے مذہب میں داخل کرنے کی کوشش کی، تاہم جلال الدین نے چونکہ شیخ نور قطب العالم کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا تھا، اس لئے اس نے اسلام سے اپنا رشتہ منقطع نہیں ہونے دیا اور بے دینوں کی ترغیبات نے بھی اس کے دل پر کچھ اثر نہ کیا۔ دوسری طرف اس کے باپ راجہ کانس نے مسلمانوں کو تباہ و برباد کرتے ہوئے غیر انسانی سلوک کی حدیں پار کردیں، یہاں تک کہ سنارگاؤں میں شیخ نور قطب عالم کے لڑکے شیخ انور کو راجہ کانس کے مخبروں نے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ یہاں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جس دن اور جس وقت سنارگاؤں میں شیخ انور کا قتل ہوا، اُسی دن اور اُسی وقت حیرت انگیز طور پر راجہ کانس بھی مرگیا۔ کچھ وقائع نگاروں کے مطابق جلال الدین ہی نے، جسے قید خانے میں ڈال دیا گیا تھا، اپنے باپ کے خدمت گاروں کے ساتھ مل کر سازش رچی اور اُسے قتل کردیا۔

سلطان ابراہیم کی واپسی کے بعد راجہ کانس یا گنیش نے 'دنوجہ مردانہ دیوا' کا لقب اختیار کر کے تخت پر قبضہ جما لینے کی وجہ سے ۸۱۸ھ سے لے کر ۸۲۱ھ (۱۴۱۵ء۔۔ ۱۴۱۸ء) تک کا زمانہ نہایت ہی تاریک رہا۔دنوجہ مردانہ کے سکے جو پنڈوہ، سنارگاؤں اور چٹا گونگ میں جاری کئے گئے تھے،ان پر ''سالِ ساکا'' کے حساب سے ۱۳۳۹ اور ۱۳۴۰ کی تاریخ درج ہے(سال ساکا: راجہ سالباہن کا سال جو ۷۸ء سے شروع ہوتا ہے،سو ۱۳۳۹ سال ساکا، ہجری تاریخ کے مطابق ۸۲۰ اور عیسوی تاریخ کے مطابق ۱۴۱۷ ہے۔اسی طرح ۱۳۴۰ سال ساکا ہجری تاریخ کے مطابق ۸۲۱ اور عیسوی تاریخ کے مطابق ۱۴۱۸ ہے۔از: میزان)۔ ۱۳۴۰ ''سال ساکا'' میں ''مہیندرا دیوا'' نامی ایک دوسرے ہندو راجہ نے تخت پر قبضہ جمایا جس نے اپنے سکے پنڈوہ اور چٹا گونگ دونوں جگہوں پر ڈھالے۔یہاں یہ تجویز بھی پیش کی گئی ہے کہ مہیندرا دیوا کے یہ سکے ممکنہ طور پر راجہ کانس کے بیٹے جادو کے وہ سکے تھے جو اس کی واپسی اسلام سے پہلے کے تھے۔[1] لگے ہاتھ یہ بھی رقم کرتے چلیں کہ اسٹیوارٹ کے مطابق جادو، راجہ کانس یا گنیش کا سب سے بڑا بیٹا تھا جو اس کی ایک مسلم بیوی کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔فرشتہ نے جادو کو ''جتمال'' کے نام سے یاد کیا ہے۔یہاں پر بلوچ مین کا کہنا ہے کہ دیناجپور کے تھوڑے مشرق میں 'جتمال پور' نامی ایک گاؤں ہے جو ممکنہ طور پر کانس کے بیٹے کے یہ نام (جتمال) ہونے کے خیال کو تقویت پہنچا رہا ہے۔ایک اہم بات یہ کہ ''راج شاہی'' ڈویژن کا موجودہ نام غالباً اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ کانس بیک وقت راجہ اور شاہ دونوں ہی تھا۔

﴿تصویر نمبر۴﴾ دنوجہ مردانہ دیوا کے سکوں کے نمونے
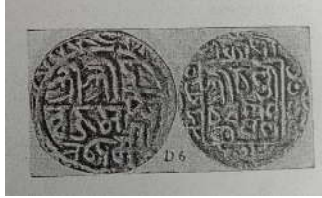
سکے کے پہلے رخ پر درج ہے: سری سری دنوجہ مردانہ دیوسیا۔

سکے کے الٹے رخ پر درج ہے: سری چاندی چرانہ پرایانہ۔

سکے کے الٹے رخ کے حاشیہ پر درج ہے: اوپر: سال ساکا۔دائیں: ۱۳۴۰۔ نیچے: پآنو۔بائیں: نگرات۔

1۔موجودہ وقت میں ایسی کوئی بھی وجہ نہیں ہے جس کی بنیاد پر اِس نظریہ کو ثابت یا مسترد کیا جا سکے۔اس بارے میں

جلال الدین محمد شاہ: (۱۴۱۵ء ۔ ۱۴۳۱ء):

جادو جلال الدین جب دوبارہ بادشاہ بنا تو اس نے ان تمام پڑھے لکھے اور معزز لوگوں کو جو اس کے باپ کے ظلم و جبر کی وجہ سے دور دراز مقامات پر جا چکے تھے، دارالحکومت میں واپس لایا اور اپنے باپ کی جانب سے کی گئی گزشتہ ستم رانیوں کی تلافی کرتے ہوئے انہیں انعامات و اکرامات سے نوازا۔ کہا جاتا ہے کہ اُس نے اُن تمام برہمنوں کو، جو اسے

﴿تصویر نمبر ۵﴾ جلال الدین محمد شاہ کے سکوں کے نمونے

سکے کے پہلے رخ پر درج ہے: **جلال الدنیا و الدین ابو المظفر محمد شاہ السلطان**

سکے کے الٹے رخ پر درج ہے: **ناصر امیر المؤمنین غوث الاسلام و المسلمین**

الٹے رخ کے حاشیہ پر درج ہے: اوپر: در۔ بائیں: **سنة ثمان**۔ نیچے: **عشر**۔ دائیں: **وثمان مأة**

زیادہ یقینی بات یہ ہے کہ ۸۲۱ھ ہجری کے بعد مردانہ کی طرف سے سکے ڈھالے ہی نہیں گئے تھے اور یہ کہ اسی سال سے جادو نے ایک مسلمان کی حیثیت سے حکومت کی ذمہ داری سنبھال لی تھی اور ''جلال الدین'' کے نام سے سکوں کو دوبارہ ڈھالا تھا۔ گرچہ وہ سکے جو ۸۲۱ھ میں جلال الدین کی طرف سے ڈھالے گئے، نوعیت کے اعتبار سے مہیند را کے سکوں کے مماثل تھے تاہم اِس سے مہیند را کے ساتھ جلال الدین کے کسی ربط وشناخت کا کوئی ثبوت قطعی طور پر نہیں ملتا، بلکہ اگر جلال الدین کے ہندو مخالف رجحانات کے تعلق سے ریاض کی پیش کردہ اطلاعات صحیح ہیں تو یہ بات نا قابل یقین ہے کہ وہ (سکوں کے معاملات میں) ایک ہندو راجہ کی طرح خود کو نمایاں کرے۔ البتہ غالب گمان یہ ہے کہ مہیند را جادو ہی کا بھائی تھا جو اپنے باپ کی موت کے بعد سرکردہ ہندو رہنماؤں کی مدد سے ایک مختصر عرصہ کے لئے راجہ کانس کے تخت کا وارث بنا۔ ۱۹۳۰ء کو Numismatic Society of India میں اپنی صدارتی تقریر کے دوران تاریخی اطلاعات کی بنیاد پر میں نے اس قضیہ پر روشنی ڈالی بھی ہے جس کو ''دنوجہ مردانہ کے سکے اور مردانہ: ایک مطالعہ'' کے عنوان سے جمع کیا جاسکتا ہے۔ (ایچ، ای، اسٹیپلٹن)

رانیوں کی تلافی کرتے ہوئے انہیں انعامات واکرامات سے نوازا۔ کہا جاتا ہے کہ اُس نے اُن تمام برہمنوں کو، جو اسے اُس کے باپ کی جانب سے دوبارہ ہندو بنائے جانے کی کوششوں کے بعد سونے کی گائیوں کے حصے دار بنے تھے، گائے ہی کا گوشت کھلا کر بدلہ لیا اور اپنی پوری حکومت کے دوران ہندوؤں کی تبدیلیٔ مذہب کے لئے بڑا سرگرم رہا۔ اس کی حکومت کے دوران ریاست نے کافی مظبوطی اور توانائی حاصل کی اور شہر پنڈوہ از حد مشہور ہوگیا۔ کہتے ہیں کہ جلال الدین نے پنڈوہ اور گور دونوں مقامات پر بہت سی شاندار عمارتیں بھی بنوائیں۔ ۱۴۳۱ء میں جب اس کا وصال ہوا تو اسے پنڈوہ کے مشہور ''اِک لاکھی مقبرہ'' میں دفنایا گیا۔ ایک سلطان کی حیثیت سے اُس نے سکوں پر اپنا لقب ''جلال الدنیاوالدین ابوالمظفر (یاابوالمجاہد) محمد شاہ'' استعمال کیا تھا۔

احمد شاہ: (۱۴۳۱ء۔۔ ۱۴۴۲ء):

جلال الدین کے بعد اس کا بیٹا احمد شاہ اس کا جانشیں بنا۔ وہ بڑا ہی ظالم تھا۔ عوام کو دبائے رکھنے کے لئے اس نے مردوں اور عورتوں کا بے دریغ قتل کیا، بالآخر اس کے دو بااثر درباری شادی خان اور ناصر خان نے مل کر اسے قتل کر دیا۔ احمد شاہ کے قتل کے بعد آخر الذکر نے تخت پر قبضہ جمایا تاہم اپنے ساتھی سازشیوں کے ذریعے وہ بھی بہت جلد قتل کر دیا گیا۔

ناصر الدین محمود شاہ: (۱۴۴۲ء۔۔ ۱۴۵۹ء):

ناصر خان کے قتل کے بعد امراء دربار نے سلطان شمس الدین الیاس شاہ کی اولاد میں سے ''محمود'' نام کے ایک شخص کو تخت پر بٹھایا جس نے ''ناصر الدین'' کا عام لقب اختیار کیا۔ ناصر الدین محمود نے ان تمام درباریوں کو جو احمد شاہ کی حکومت کے دوران ملک سے باہر چلے گئے تھے، دوبارہ بلایا۔ اِس کے علاوہ اس کی ذاتی خوبیوں کی شہرت نے بھی دیگر علاقے کے لوگوں کو یہاں آ کر آباد ہونے پر آمادہ کیا۔ گور کا قلعہ اور وہاں پر موجود دوسری عمارتیں بھی اغلب طور پر اسی نے بنوائی تھیں، اُس نے ایک طویل اور پر سکون حکومت کا لطف اٹھایا۔ محمود شاہ اور اس کے جانشینوں کی اگلی پچیس سالہ حکومت کے دوران کتبات میں قلم کاری کا فنی حسن بھی ایک بار پھر اوج کمال کو پہنچ گیا، جسے آپ پلیٹ نمبر ۳،۴ اور ۶ر میں پیش کی گئی تخلیقات میں دیکھ سکتے ہیں۔

باربک شاہ: (۱۴۵۹ء۔۔۱۴۷۴ء):

ناصر الدین کے بعد اس کا بیٹا رکن الدین باربک شاہ تخت پر چڑھا۔ وہ ایک بہت ہی اچھا حکمراں تھا۔ اُس کی

حکومت کے دوران رعایا اور لشکر دونوں خوش اور ترقی پذیر تھے۔ باربک شاہ کے سکوں اور کتبوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا پورا نام 'رکن الدنیا والدین ابوالمجاہد باربک شاہ' تھا۔ اس کی حکومت غالباً ۸۶۴ھ مطابق ۱۴۵۹ء میں شروع ہوئی، تاہم جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ۱۸۷۰ء کے صفحہ نمبر ۲۹۰ر میں شائع شدہ کتبات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اِس سے پہلے ہی ۸۶۰ھ مطابق ۱۴۵۵ء میں جنوب مغربی بنگال کے گورنر کی حیثیت سے حکومت کر چکا تھا۔ جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ۱۸۷۳ء، کے صفحہ نمبر ۲۷۲ر میں شائع شدہ دیناجپور کے کتبات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ باربک شاہ نے بلاشک وشبہ ۸۶۵ ہجری مطابق ۱۴۶۰ عیسوی کے آغاز ہی سے بنگال میں بحیثیت سلطان اپنی حکومت کا آغاز کر دیا تھا۔

یوسف شاہ: (۱۴۷۴ء۔۔۱۴۸۱ء):

باربک شاہ کا جانشیں اس کا بیٹا یوسف شاہ بنا۔ کہا جاتا ہے کہ یوسف شاہ نہایت ہی شریف مزاج، عوام کا خیرخواہ، پڑھا لکھا اور مذہبی قسم کا حکمراں تھا؛ خصوصیت کے ساتھ مساجد میں بڑے کتبوں کو لگانے کا وہ بڑا شوقین تھا۔ ان کتبات کے نقوش (اصل کتاب بزبان انگریزی کے) صفحہ نمبر ۷۷، پلیٹ نمبر ۳ر اور صفحہ نمبر ۱۱۶ر میں موجود ہیں۔ (زیرنظر ترجمہ میں یہ نقوش یادگار نمبر ۱۸ر درس باڑی مسجد کے بعد پلیٹ نمبر ۳ر اور ''بی بی محل'' کے بعد موجود پلیٹ نمبر ۶ر میں آپ دیکھ سکتے ہیں) ان کتبات سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اس کا پورا نام ''شمس الدنیا والدین ابوالمظفر یوسف شاہ'' تھا، اور یہ بھی کہ اس نے ۸۷۹ھ مطابق ۱۴۷۴ء سے لے کر ۸۸۵ھ مطابق ۱۴۸۱ء تک حکومت کی۔

فتح شاہ: (۱۴۸۱ء۔۔ ۱۴۸۶ء):

ناصرالدین کے ایک بیٹے سلطان فتح شاہ کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ یوسف شاہ کے بیٹے سکندر کے اندر کچھ دماغی خلل کے پائے جانے کی وجہ سے، جس کو فقط آدھے دن تک ہی حکومت کرنے کی اجازت دی گئی تھی، بنگال کا اگلا حکمراں فتح شاہ ہی مقرر ہوا۔ فتح شاہ ایک پڑھا لکھا اور دانشور انسان تھا۔ اُس نے اپنے اگلوں کے اصولوں کے مطابق حکومت کی۔ [1] تاہم بیانات کے مطابق باربک نامی ایک مخنث غلام نے فتح شاہ کو قتل کر دیا اور خود 'سلطان شہزادہ

1۔ سکوں اور کتبوں (جو ۱۸۷۳ء کو جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ص: ۲۸۱ تا ۲۸۶ر میں شائع ہوئے ہیں) سے یہ پتہ چلتا ہے کہ فتح شاہ کا پورا عوامی نام ''جلال الدنیا والدین ابوالمظفر فتح شاہ'' تھا۔ اس کے کچھ سکے ۸۸۶ھ مطابق ۱۴۸۱ء اور ۸۹۲ھ مطابق ۱۴۸۶ء کو فتح آباد (فرید پور ٹاؤن) میں ڈھالے گئے تھے، اُن میں سے

باربک'' کے لقب سے تخت پر بیٹھ گیا، البتہ اِس شخص کے ذریعہ کسی بھی سکہ کے ڈھالے جانے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ باربک نے پورے دربار کو سطحی قسم کے لوگوں سے بھر دیا تھا۔تقریباً آٹھ ماہ کی حکومت کے بعد ملک عندیل نامی ایک نیگرو جنرل نے اسے بھی موت کے گھاٹ اتار دیا اور خود سیف الدین فیروز شاہ کے لقب سے تخت پر قبضہ جمالیا۔

سیف الدین فیروز شاہ: (۱۴۸۶ء۔ ۱۴۸۹ء):

فیروز شاہ کی رعایا پرور حکومت کے تحت عوام کو ایک خوشحال زندگی گزارنے کا موقع ملا۔اس کی شرافت کی وجہ سے رعایا اور لشکر دونوں ہی اس سے محبت کرتے تھے اور اس کے عہد حکومت میں کسی بھی افغان یا ترک سردار کو اس کے خلاف بغاوت کی جرأت نہیں ہوئی۔

فیروز شاہ کی کہانی:

آنے والے واقعہ سے فیروز شاہ کی کشادہ ظرفی کا واضح طور پر اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ کہتے ہیں کہ کسی عوامی تقریب کے موقع پر فیروز شاہ نے غرباء ومساکین کے درمیان ایک لاکھ روپے تقسیم کرنے کا حکم دیا۔وزرائے دربار نے خیال کیا کہ فیروز شاہ کافی زیادہ دریادل آدمی ہیں اور شاید اتنی بڑی رقم کی اہمیت سے واقف نہ ہونے کی وجہ سے ہی انہوں نے اتنے زیادہ روپے تقسیم کرنے کا حکم دیا ہے۔اِس لئے اُن لوگوں نے تقسیم سے پہلے اِس امید پر اُن سارے پیسوں کو ایک ڈھیر میں جمع کیا کہ جب فیروز شاہ کی ان پر نظر پڑے گی تو شاید وہ چاندی کے سکوں کی اتنی زیادہ تعداد دیکھ کر حیرت میں پڑ جائیں (اور شاید اپنا فرمان واپس لے لیں)۔چنانچہ جب فیروز شاہ دربار میں داخل ہوا تو پیسوں کے اس ڈھیر کو دیکھ کر دریافت کیا کہ یہ پیسے یہاں کیوں رکھے گئے ہیں؟ جواب میں یہ بتائے جانے پر کہ یہ وہ کل رقم ہے جو فلاں صبح حضور نے غریبوں کے درمیان تقسیم کرنے حکم دیا تھا،خلاف توقع فیروز شاہ نے کہا کہ: یہ بس اتنے ہی ہیں؟ یہ تو بہت کم ہے۔اس میں ایک لاکھ اور ملا دو''۔وزرائے سلطنت اُس کی اِس شاہ خرچی (بلکہ دریادلی) پر حیرت زدہ رہ گئے تاہم اس کی خواہشات کو بروئے کار لانے پر مجبور تھے۔فیروز شاہ کے عہد حکومت میں گور میں ایک

ایک سکہ''انڈین میوزیم کیبینیٹ''میں موجود ہے جس پر تاریخ ضرب [-]۸۸ھ اور نام محمد آباد درج ہے جو غالباً اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ فتح شاہ کا دارالحکومت ساگر دیگھی کے شمالی کنارے پر واقع تھا۔۔ایک کتبہ جس میں فتح شاہ کی تعلیمی لیاقت کی قصیدہ خوانی کی گئی ہے، اصل کتاب کے اندر صفحہ نمبر ۸۷/اور پیش نظر ترجمہ میں زیر عنوان ''گن مانت مسجد''،نوٹ نمبر ۱/ میں ملاحظہ کر سکتے ہیں۔(ایچ،ای،اِسٹیپلٹن)

مسجد کی تعمیر بھی ہوئی۔ اِس کے علاوہ اولڈ مالدہ کے کٹرہ میں ایک مسجد کے کتبے پر بھی اُس کا نام دیکھا جا سکتا ہے (ملاحظہ فرمائیں: گور، از: رَونشا۔ پلیٹ ۴۹، نمبر ۸)۔ اس نے تقریباً تین سال تک حکومت کی اور ۸۹۵ ہجری مطابق ۱۴۸۹ عیسوی میں اپنی فطری موت سے ہمکنار ہوا۔

ناصرالدین محمود شاہ ثانی: (۱۴۸۹ء۔۔ ۱۴۹۰ء):

فیروز شاہ کی موت کے بعد اس کا بڑا بیٹا سلطان محمود شاہ تخت پر بیٹھا مگر محض ایک سال کے قلیل عرصے کی حکومت کے بعد ہی 'سیدی بدر' نامی ایک دوسرے نیگرو نے اسے قتل کر دیا اور خود ''مظفر شاہ'' کے لقب سے تخت پر بیٹھ گیا۔

شمس الدین مظفر شاہ: (۱۴۹۰ء۔۔ ۱۴۹۳ء):

مظفر شاہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بڑا ہی ظالم بادشاہ تھا، اس نے ان تمام لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارنا شروع کر دیا جو اس کی حکومت سے غیر مطمئن تھے۔ بالآخر سید حسین [1] نے، جو اس کا وزیر تھا، دوسرے ارکان حکومت کو اپنے ساتھ ملا کر اس کے خلاف بغاوت کر دی اور ایک خون ریز تصادم میں مظفر شاہ کو قتل کرنے کے بعد ''علاء الدین حسین شاہ'' کے لقب سے تخت پر قبضہ جما لیا۔ گور میں مظفر شاہ کے ذریعے تعمیر کی گئی ایک جامع مسجد کے حوالے سے غالبًا صاحب ریاض کا ریکارڈ کیا گیا ایک کتبہ ''پروسیڈنگ آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، سن اشاعت: دسمبر ۱۸۹۰ء، ص: ۲۴۲'' میں شائع ہوا ہے اور اب یہ کتبہ حاکم عدالت، ضلع مالدہ کے باغیچے میں لگا ہوا ہے۔ فیروز شاہ کے نام پر قلم کاری کئے ہوئے اور بھی بہت سے کتبات معلوم ومتعارف ہیں۔

حسین شاہ: (۱۴۹۳ء۔۔ ۱۵۱۹ء):

حسین شاہ نے ۱۴۹۳ء سے لے کر ۱۵۱۹ء تک بنگال میں حکومت کی۔ وہ ایک بہت ہی اعلی اور معزز خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور علمی لیاقت وذاتی اوصاف میں بھی اپنی مثال آپ تھا۔ اس کے دور حکومت میں بنگال تعمیر وترقی کی راہ پر گامزن رہا۔ ہند وبیرون ہند کے مختلف مقامات سے تعلق رکھنے والے ہر طبقہ کے بے شمار مسلمانوں نے یہاں آ کر

1۔ فرشتہ نے اس کا نام سید شریف مکی لکھا ہے لیکن سکوں اور کتبات پر اس کا نام ''علاء الدنیا والدین ابوالمظفر حسین شاہ ابن سید اشرف الحسینی'' درج ہے۔ سکوں یا کتبوں پر کہیں بھی اس کا نام 'شریف مکی' نہیں ملتا۔ (ملاحظہ فرمائیں: جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ۱۸۷۳ء، ص: ۲۹۲/۲۹۳) ایچ، ای، اِسٹیپلٹن۔

بود و باش اختیار کی۔ حسین شاہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اُس نے پنڈوہ میں شیخ نور قطب العالم کا آستانہ بہت سے گاؤں کی آمدنی کے ساتھ وقف کیا۔ حسین شاہ کے دور حکومت میں بہت سے سرمایہ دار افراد نے گور میں اپنی رہائش گاہیں تعمیر کرائیں اور تیوہار و تقریب کے موقع پر تو سونے چاندی کے برتنوں کا استعمال عام ہو گیا تھا۔ اس کے عہد میں فن تعمیر بھی منتہائے کمال تک پہنچ گیا۔ حسین شاہ کی حکمرانی میں رعایا کو پرسکون زندگی نصیب تھی اور ادب و دیگر فنون لطیفہ نے بھی خوب خوب فروغ پایا، اُسی کا نتیجہ ہے کہ اُس کے دو بنگالی وزیر روپ اور سناتن نے اُس وقت سنسکرت زبان میں متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ حسین شاہ نے گور میں قلعہ کے ایک دروازہ کے علاوہ دگر اور بھی متعدد عمارتیں تعمیر کرائیں۔ اس نے کمتا پور سلطنت کو تاراج کیا، اوڑیشہ پر چڑھائی کی، بہار کو بھی ایک بار فتح کرنے کی کوشش کی مگر سکندر لودھی کے آڑے آجانے کی وجہ سے اُسے اپنی قلمرو میں واپس آنا پڑا۔ وہ ایک بارعب بادشاہ تھا اور اس نے متعدد مساجد و مدارس کی تعمیر بھی کرائی۔

حسین شاہ کی جائے پیدائش:

حسین شاہ کی جائے پیدائش کے تعلق سے مختلف روایات موجود ہیں۔ کچھ لوگوں کے مطابق وہ مکہ میں پیدا ہوا جبکہ کچھ لوگ ترکی کے شہر ''ترمذ'' کو اس کی جائے پیدائش بتاتے ہیں۔ اس کے باپ کا نام سید اشرف الحسینی اور بھائی کا نام یوسف شاہ تھا۔ حسین شاہ کے والد نے بنگال پہنچنے کے بعد چاند پور، جنگی پور سَبڈ ویژن (حالیہ ضلع مرشد آباد) میں رہائش اختیار کی۔ یہیں پر حسین اور اس کے بھائی نے قاضی شہر سے تعلیم حاصل کی۔ قاضی شہر نے حسین شاہ کی نسبی شرافت کی وجہ سے اپنی لڑکی کا عقد اُس سے کرا دیا اور اپنے ذاتی اثر و رسوخ کی بنا پر مظفر شاہ کے دربار میں نوکری بھی دلوادی، اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے حسین شاہ وزیر اعظم کے عہدے تک پہنچ گیا۔ بالآخر مظفر شاہ کی وفات کے بعد وہ بنگال کا فرماں روا بن گیا۔

حسین شاہ کے وزراء:

حسین شاہ کا وزیر اعظم پورَندر خان تھا جو ذات کے اعتبار سے ''کائستھا'' تھا، اس کا اصل نام گوپی ناتھ بوس تھا۔ سناتن اور روپ نامی دو سگے بھائی بھی اس کے دوسرے وزیر تھے۔ اول الذکر کو ''دبیر خاص'' اور آخر الذکر کو ''شاکر مَلِک'' کا لقب دیا گیا تھا۔ پورندر خان کے بعد یہ دونوں بھائی ریاستی نظم و نسق میں اہم ترین عہدوں پر فائز ہوئے۔ یہ دونوں برادران کافی ذہین اور پڑھے لکھے آدمی تھے اور چونکہ ان دونوں لائق مصاحبوں کے مشوروں کی وجہ سے سلطنت

بھی روز افزوں ترقی پر تھی اس لئے حسین شاہ مکمل طور پر ان دونوں سے متعلق ہو کر رہ گیا تھا۔ دونوں بھائی سنسکرت اور فارسی زبانوں پر خاصا عبور رکھتے تھے۔ گور کے جنوبی حصے میں رام کلی نامی ایک گاؤں میں رہائش تھی۔ اُن دِنوں رام کلی میں بہت سے معزز لوگ رہا کرتے تھے۔ روپ کے ذریعہ کھودا گیا ایک بڑا تالاب جسے ''روپ ساگر'' کہا جاتا ہے، آج بھی یہاں موجود ہے جبکہ اس کے جنوبی سمت میں سناتن کے ذریعہ کھودا گیا ایک دوسرا بڑا تالاب بھی ہے جس کو لوگ ''سناتن ساگر'' کہتے ہیں۔

چیتنیا کا دورۂ گور:

غالبًا حسین شاہ کی حکومت کے عہدِ اخیر کی بات ہے کہ بنگال کے ناقابل فراموش مذہبی مبلغ ''چیتنیا'' نے ایک بار جیٹھ (جون) کے مہینے میں ''برندہ بن'' جاتے ہوئے گور کا دورہ کیا اور رام کلی میں کچھ دنوں تک سکونت بھی اختیار کی۔ جیانندا کی ''چیتنیا منگل'' میں رام کلی کو کرشنا کلی کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ رام کلی میں روپ اور سناتن نے بھی چیتنیا سے ملاقات اور گفتگو کی تھیں۔ چیتنیا کی رام کلی آمد کی یاد میں آج تک جون کے مہینے میں وہاں ایک بڑا میلہ منعقد کیا جاتا ہے۔ خطہ گور سے چیتنیا کے کوچ کرنے کے بعد روپ اور سناتن بھی دنیوی معاملات سے بیزار ہونے لگے اور پھر ایک دن سناتن نے بادشاہ کے پاس اپنا استعفیٰ نامہ پیش کر دیا۔ بادشاہ نے اس بات سے ناراض ہو کر حکم دیا کہ سناتن کو ریاستی قید خانہ میں بند کر دیا جائے۔ کہا جاتا ہے کہ جب حسین شاہ اوڈیشہ کی چڑھائی میں مصروف تھا اس وقت جیلر کو رشوت دیکر سناتن قید سے فرار ہو گیا۔ جیلر کا نام ''شیخ حبّو'' تھا جو فتح پور کا رہنے والا تھا۔ شیخ حبو کے مکان کی جگہ جہاں اب صرف کھنڈرات ہیں، گاؤں میں اب تک دیکھی جا سکتی ہے۔ چمپک کالیکا کے مطابق جیلر کو رشوت میں دی جانے والی رقم ایک لاکھ تھی جبکہ چیتنیا چریتمریتا نے مجموعی رقم کئی ہزار ہی بتایا ہے۔ روپ اور سناتن نے اپنی عمر کے آخری کئی سال برندہ بن میں گزارے جہاں ان لوگوں نے گزشتہ زمانہ وزارت سے کہیں زیادہ نام اور عزت کمائیں۔

نصرت شاہ: (۱۵۱۹ء۔۱۵۳۲ء):

حسین شاہ کے ولی عہد اور بیٹے نصرت شاہ کے زمانہ حکومت میں مغل بادشاہ بابر نے سلطان ابراہیم لودھی کو موت کے گھاٹ اتار کر خود دہلی کے تخت پر متمکن ہوا اور ساتھ ہی ہندوستان کے اکثر صوبوں پر قبضہ جما لیا۔ چنانچہ اُس سے خائف ہو کر دہلی کے کثیر تعداد امراء و شرفاء نے راہ فرار اختیار کی اور نصرت شاہ کے یہاں آکر پناہ گزیں ہوئے، یہاں تک کہ خود مرحوم شہنشاہ کا بھائی سلطان محمود بھی بھاگتا ہوا بنگال آیا اور اپنے مصارف کی تکمیل کیلئے اپنی حیثیت و درجہ

کے مطابق کچھ پرگنوں اور گاؤں کی منظوری حاصل کی۔ اسی موقع پر سلطان محمود کی بہن، جو اپنے بھائی کے ساتھ گور میں پناہ گزیں ہوئی تھی، کا بیاہ نصرت شاہ سے کر دیا گیا۔ تعمیرات کی بات کریں تو نصرت شاہ نے گور میں قدم رسول کی عمارت اور عظیم ترین سونا مسجد کی تعمیر کرائی، اِس کے علاوہ شیخ اخی سراج آئینہ ہند کے روضے کی مرمت کا کام بھی اس نے کرایا تھا۔ بتاتے ہیں کہ نصرت شاہ کو کسی غلام نے سوتے میں قتل کر دیا تھا۔

فیروز شاہ ثانی: (۱۵۳۲ء):

نصرت شاہ کے بعد اس کا بیٹا فیروز شاہ تخت نشیں ہوا۔ ریاضؔ کے مطابق اس نے تین سال تک حکومت کی مگر اس کے سارے سکوں اور کتبات پر صرف ۹۳۹ ہجری مطابق ۱۵۳۲ عیسوی کی تاریخ ہی درج ہے جس سے ہم اس بات کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس نے ممکنہ طور پر ایک سال یا اس سے بھی کچھ کم عرصے تک حکومت کی ہوگی۔ اسٹیوارٹ، جس نے اپنی ''ہسٹوری آف بنگال'' کا بنیادی ماخذ ریاضؔ کے ایک قلمی نسخہ کو بنایا ہے، کے مطابق فیروز شاہ کی حکومت صرف تین ہی مہینے تک قائم رہ سکی۔ فیروز شاہ کو اس کے چچا محمود شاہ نے قتل کیا اور خود سریر حکومت پر متمکن ہوا۔

غیاث الدین محمود شاہ (۱۵۳۲ء۔۔۱۵۳۸ء) اور شیر شاہ سوری (۱۵۳۷ء۔۔۱۵۴۵ء):

نصرت شاہ کے بھائی محمود شاہ نے اپنے بھتیجے کو قتل کرنے کے بعد تخت پر قبضہ تو جما لیا مگر چند ہی سالوں کے بعد بہار کے شیر شاہ نے اسے تخت سے بے دخل کر دیا۔ محمود شاہ نے بابر کے بیٹے ہمایون کے پاس جا کر پناہ لی۔ ہمایون نے (حالات کے پیش نظر) گور پر چڑھائی کی اور ۱۵۳۸ء میں گور پر قبضہ جما لیا، مگر چونکہ محمود زخمی ہو جانے کی وجہ سے گور پہنچنے سے پہلے ہی '' کال گنگ'' میں مر گیا تھا اس لئے اب ہمایون ہی بنگال کا فرماں روا بن گیا۔ اس مغل بادشاہ نے گور میں تین ماہ تک قیام کیا اور اس کے منحوس نام گور، جس کا معنی فارسی زبان میں '' قبر'' کے آتا ہے، کو جنت آباد میں بدل دیا۔ اسی بیچ شیر شاہ جو اپنا دارالحکومت بہار گیا ہوا تھا، نے ہمایون کی دہلی واپسی کا راستہ روک دیا۔ اس نے ہمایون کو بکسر کے قریب گنگا اور کرمناسا کے اتحادی علاقے میں روکا اور تقریباً تین مہینے تک اسی جگہ پر روکے رکھا۔ بالآخر! شیر شاہ اور ہمایون کے درمیان اس شرط پر ایک معاہدہ عمل میں آیا کہ اگر شیر شاہ کو بنگال کا خود مختار حکمراں تسلیم کر لیا جائے تو ہمایون کو بغیر کسی مزاحمت کے دہلی واپسی کی اجازت دے دی جائیگی تاہم شیر شاہ نے معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ہمایون کے لشکر پر شب خون مارا اور اسے شکست دے دی۔ ہمایون نے اپنی جان بچا کر تیرتے ہوئے ندی پار کی اور بالآخر گنتی کے چند ساتھیوں کے ساتھ ہی وہ آگرہ پہنچ سکا۔

قنوج کی جنگ:

بنگال واپس آنے کے بعد شیر شاہ نے پٹھانوں اور دوسرے لوگوں کو ملا کر پچاس ہزار کا ایک لشکر تیار کیا اور پھر ۱۵۴۰ء میں اس کے اور ہمایون کے بیچ قنوج کی جنگ لڑی گئی۔ جنگ میں شکست کھا کر ہمایون نے فارس کی طرف راہ فرار اختیار کی اور اب شیر شاہ بنگال کے ساتھ ساتھ دہلی کا بھی حکمراں بن گیا۔ اس نے بنگال کو خصوصی طور پر متعدد حصوں میں تقسیم کیا اور ہر حصے کو ایک علاقائی حاکم کے ماتحت رکھا۔ زمینی پیداوار کے چوتھائی حصے پر خراج مقرر کیا اور سنار گاؤں سے لیکر 'اِندس ندی' تک ایک ایسی سڑک بنوائی جس کے دونوں طرف درخت لگائے گئے تھے اور مناسب فاصلوں پر پانی کے کنویں اور سرائے کا انتظام کیا گیا تھا۔ شیر شاہ نے ۱۵۴۵ء میں وفات پائی۔

محمد خان: (۱۵۵۲ء۔۔۱۵۵۴ء):

شیر شاہ کی وفات کے بعد اس کے لڑکے اسلام شاہ نے محمد خان سور کو بنگال کا گورنر مقرر کیا لیکن ۱۵۵۲ عیسوی میں اسلام شاہ کی وفات کے بعد عادل شاہ نے اسلام شاہ کے بیٹے کو قتل کر کے تختِ دہلی کو غصب کر لیا۔ انہی دنوں محمد خان نے ''شمس الدین محمد غازی شاہ'' کے لقب سے بنگال کے خودمختار فرماں روا ہونے کا اعلان کر دیا اور ساتھ ہی جون پور بھی فتح کر لی تاہم اگلے دو سال سے کچھ کم ہی کے عرصے کے اندر عادل شاہ کے ایک ہندو جرنیل ''ہیمو'' نے اُسے قتل کر دیا۔

غیاث الدین بہادر شاہ ثانی: (۱۵۵۴ء۔۔ ۱۵۶۰ء):

محمد شاہ کے بعد اس کا بیٹا بہادر شاہ اس کا جانشیں بنا جس نے ۱۵۵۷ء میں مونگیر کی جنگ میں جنوبی بہار کے گورنر سلیمان خان کرارانی کے تعاون سے عادل شاہ کو قتل کر کے اپنے باپ کے خون کا بدلہ لے لیا۔ اس نے پورے بنگال میں ۶ رسال تک حکومت کی۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ جس سال عادل شاہ نے وفات پائی، اُسی سال ۵ رنومبر ۱۵۵۶ء کو پانی پت میں لڑی گئی جنگ کے ذریعے مغلوں نے سوری خاندان سے دہلی کا تخت دوبارہ حاصل کر لیا۔

جلال الدین محمد شاہ: (۱۵۶۰ء۔۔۱۵۶۳ء):

بہادر شاہ کے بعد اس کا بھائی جلال الدین تخت پر بیٹھا اور شہر گور میں ۳ رسال تک حکومت کی، جلال الدین کی موت کے بعد بنگال میں کافی زیادہ افراتفری پھیل گئی۔ آخر کار! سلیمان نے اپنے بھائی تاج خان کرارانی کو بھیجا جس نے غیاث الدین نامی تخت کے ایک غاصب کو قتل کر کے اپنے بھائی کی طرف سے ایک مختصر عرصے تک بنگال میں

حکومت کی۔

سلیمان خان کرارانی: (۱۵۶۴ء۔۔۱۵۷۲ء):

تاج خان کی موت کے بعد اس کے بھائی سلیمان خان کرارانی نے عملی طور پر خود کو بنگال اور جنوبی بہار کا آزاد فرماں روا بنا لیا۔ اس نے اوڈیشہ کی ریاست بھی فتح کر لی، کوچ بہار کے خطہ کو بھی اپنی ریاست میں ضم کر لیا اور دار الحکومت کو گور سے ٹانڈہ میں منتقل کر دیا۔ سلیمان نے اکبر کے دربار میں کچھ تحفے تحائف بھی بھیج دیئے اور اُس کے ساتھ گہری دوستی قائم کر لی۔ اور اِنہی وجوہات کی بنا پر اُس نے ایک مکمل طور پر پرسکون حکومت کا لطف اٹھایا۔

بایزید (۱۵۷۲ء):

۱۵۷۲ء میں جب سلیمان کی وفات ہوئی تو اس کا بیٹا بایزید تختِ حکومت پر بیٹھا مگر اُسی سال پٹھان سرداروں نے اسے قتل کر دیا اور اس کی جگہ پر اُسی کے بھائی داؤد خان کو تخت پر بٹھایا۔

داؤد خان: (۱۵۷۲ء۔۔۱۵۷۶ء):

داؤد خان جو افغان شاہی گھرانے کا آخری فرد تھا، نے شہنشاہ دہلی کو خراج پیش کرنے سے انکار کر دیا جس پر برہم ہو کر اکبر نے ۱۵۷۴ء میں خان خاناں مومن خان کو ایک بھاری فوج کے ساتھ بنگال بھیجا۔ ایک شدید جنگ کے بعد مومن خان کو فتح ملی اور داؤد خان بھاگ نکلا۔ مومن نے ٹانڈہ کو پسند نہ کرتے ہوئے سپاہیوں اور باشندوں کو گور میں منتقل ہو جانے کا حکم دیا لیکن وہاں آ کر وہ خود اُس طاعون کا شکار ہو گیا جس کے نتیجے میں اُس سال گور میں تباہی پھیل گئی تھی۔ موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے داؤد خان نے فوری طور پر ٹانڈہ کی طرف پیش قدمی کی اور دوبارہ ٹانڈہ کو زیرِ نگیں کر لیا، ساتھ ہی گنگا کنارے آباد تیلیا گڑھی قلعہ پر بھی قبضہ جما لیا۔ اُس وقت شہنشاہ اکبر نے خان جہاں کو بنگال کا گورنر بنا کر بھیجا۔ چنانچہ ۱۵۷۶ء میں راج محل میں خان جہاں اور داؤد کے درمیان ایک فیصلہ کن جنگ لڑی گئی جس میں داؤد خان کو کراری شکست ملی اور پھر اسے پکڑ کر قتل کر دیا گیا۔ کہتے ہیں کہ اُس کے سر کو اکبر کے دربار میں بھیجا گیا اور جسم کا باقی حصہ ٹانڈہ ہی میں تختہ دار پر لٹکا دیا گیا۔

داؤد کی ماں:

مرحوم سلطان کی ماں نے گورنر کے پاس ایک اپیل بھیجی کہ اُسے اُس کے تمام نوکر چاکر سمیت تحفظ فراہم کیا جائے اور یہ کہ دورانِ سفر ٹانڈہ کے ارد گرد کہیں اس سے نجی ملاقات کی اجازت دی جائے۔ گورنر کے حوالے سے داؤد کی ماں

کے اس ریمارک کے باوجود کہ ''تم ایک بادشاہ کے نوکر ہو اور میں ایک بادشاہ کی ماں ہوں، اس لئے تم پر میرا احترام لازم ہے نہ کہ مجھ پر تمہارا'' گورنر نے اُس پر ترس کھائی اور اسے اُس کے تمام ساتھی سنگھی و دیگر متعلق افراد سمیت لقمہ اجل بننے سے بچایا۔ بچے کھچے افغان سرداروں اور اُن کے دیرینہ برہمن جرنیل ''کالا پہاڑ'' کے ساتھ کچھ مزید مزاحمتوں کے بعد پورا بنگال اور بہار خان جہاں کے زیر انتظام باقاعدہ طور پر اکبر کی حکومت میں شامل ہوگیا۔ خان جہاں کا اصل نام ''حسین قلی خان'' تھا۔

خان اعظم (۱۵۸۲ء)، شہباز خان (۱۵۸۴ء) اور راجہ مان سنگھ (۱۵۸۹ء):

حسین قلی خان کے بعد خان اعظم، شہباز خان اور راجہ مان سنگھ یکے بعد دیگرے شہنشاہ دہلی کے ماتحت گورنر بنے۔ راجہ مان سنگھ شہنشاہ جہانگیر کا سالہ تھا۔ اُس نے جگنا تھ کو فتح کیا اور بنگال کا دارالحکومت راج محل منتقل کر دیا جہاں اس نے متعدد عمارتیں تعمیر کرائیں جن کے کھنڈرات آج بھی وہاں موجود ہیں۔ [1] اُس نے کوچ بہار کے راجہ کی بہن سے شادی کی تھی۔

قطب الدین (۱۶۰۶ء)، جہانگیر قلی خان (۱۶۰۷ء) اور اسلام خان (۱۶۰۷ء۔۔۱۶۱۳ء):

مان سنگھ کے بعد قطب الدین، جہانگیر قلی خان اور اسلام خان بڑی عجلت کے ساتھ بنگال کے گورنر مقرر ہوئے۔ ۱۶۰۲ء میں چٹا گونگ کے پرتگالیوں نے ''اراکانیز'' سے تنگ آکر 'جزیرہ سندیپ' میں ایک قلعہ تعمیر کرلیا تھا مگر راجہ مان سنگھ نے جلد ہی انہیں وہاں سے بے دخل کر دیا، تاہم اُن لوگوں نے ۱۶۰۹ء میں ''گونزیلز'' کی زیر قیادت دوبارہ سندیپ پر قبضہ جمالیا اور ان لوگوں کی رہزنی و ڈکیتی کی وجہ سے دریائے گنگا کے ڈیلٹے میں رہنے والے لوگ بری طرح پریشان ہوگئے۔ اُس وقت اراکانیز اور پرتگالی، جواب متحد ہو چکے تھے، کی دھمکی آمیز روش اور مشرقی بنگال میں بقیہ افغان سرداروں کی چیرہ دستیوں سے تنگ آکر اسلام خان نے اغلب طور پر ۱۶۱۲ء میں دارالحکومت کو راج محل سے ڈھاکہ منتقل کر دیا۔

گونزیلز نے اراکان کے راجہ کی مدد سے ۱۶۱۰ء میں بنگال پر حملہ کیا تھا مگر اسلام خان نے انہیں کراری شکست دی تھی۔ اب ۱۶۱۲ء میں افغانوں کو بھی کراری شکست دی اور عثمان کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اسلام خان نے

1۔ مسٹر چکراوتی کے مطابق وسیع و عریض جامع مسجد جواب کھنڈرات کی شکل میں ہے، اور ۶/ پشتہ بندی والا ہدف کا پل دونوں مان سنگھ ہی کے عہد سے منسوب ہیں۔

۱۶۱۳ء میں پھر سے اراکانیز پر کامیاب چڑھائی کی مگر اس کے کچھ ہی دنوں کے بعد اُس کی موت واقع ہوگئی۔

قاسم خان (۱۶۱۳ء۔۔ ۱۶۱۸ء) اور ابراہیم خان (۱۶۱۸ء۔۔ ۱۶۲۲ء):

اسلام خان کی موت کے بعد اس کا بھائی قاسم خان بنگال کا گورنر بنا۔ اس کے وقت میں اراکانیوں نے بنگال کے جنوب مشرقی علاقوں میں کافی لوٹ مچائی، سو گورنری کے فرائض کی ادائیگی میں قاسم خان کے نااہل ثابت ہوجانے کی وجہ سے گورنری کے سلسلے میں مشہور زمانہ 'نور جہاں' کے بھائی ابراہیم خان کو ترجیح دی گئی (یعنی قاسم خان کو ہٹا کر ابراہیم خان کو گورنر بنایا گیا)۔ ابراہیم خان کے عہد حکومت میں تجارت کو خوب فروغ ملا۔ آگرہ کے دربار میں مالدہ کے ریشمی کپڑے اور ڈھاکہ کے عمدہ ململ نے اپنے اعلیٰ ترین معیار کی بنیاد پر کافی شہرت حاصل کی اور انگریزوں نے پٹنہ میں ایک نیا کارخانہ بھی کھولا۔۔۔ ابراہیم خان راج محل میں شاہجہاں جس نے اپنے باپ شہنشاہ جہانگیر کے خلاف بغاوت کی تھی، کے خلاف لڑتے ہوئے مارا گیا۔

محمد شجاع: (۱۶۳۹ء۔۔ ۱۶۵۹ء، دوسالہ وقفہ حکمرانی "۱۶۴۹ء۔۔ ۱۶۵۱ء" کے ساتھ):

ابراہیم خان کے بعد شاہ جہاں کے بیٹے شہزادہ محمد شجاع تک بنگال کے تخت پر یکے بعد دیگرے سات گورنروں نے قبضہ جمایا۔ ۱۶۳۹ء میں شہزادہ محمد شجاع بنگال کا گورنر بنا اور اس نے دارالحکومت کو ڈھاکہ سے راج محل منتقل کردیا۔ اس کے عہد میں انگریز تاجروں کی حالت کافی ترقی پذیر رہی۔ براؤٹن نامی ایک ڈاکٹر، جس نے شاہجہاں کی ایک بیٹی کا علاج کرنے کی وجہ سے بنگال میں انگریزوں کیلئے آزادانہ تجارت کی خاطر اجازت نامہ کے حصول کو یقینی بنادیا تھا، شجاع کے اندرون خانہ کی بھی کسی عورت کا علاج کیا جس کے صلے میں شجاع نے اسے ہگلی اور بلیشور میں کارخانے قائم کرنے کی اجازت دے دی۔ ۱۶۵۹ء کو شجاع نے اپنے بھائی اورنگزیب سے الہ آباد میں شکست کھائی اور ٹانڈہ کی طرف بھاگ نکلا۔ اورنگزیب کے مشہور جرنیل میر جملہ نے اسے بنگال ہی سے نکال دیا جس پر اُس نے اراکان کے راجہ کے پاس جا کر پناہ لی مگر ظالم اراکان راجہ نے اسے قیدی بنالیا اور پھر اسے دریا میں پھینک دیا۔ شجاع کی بیوی اور دو بیٹیوں نے خودکشی کرلی، ایک تیسری بیٹی کے ساتھ اراکان راجہ نے جبری طور پر شادی رچائی مگر اِس بےعزتی نے اُسے بھی زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہنے دیا۔

میر جملہ: (۱۶۵۹ء۔۔ ۱۶۶۳ء):

محمد شجاع کے بعد میر جملہ بنگال کا گورنر بنا اور دارالحکومت کو راج محل سے پھر ڈھاکہ منتقل کردیا۔ ۱۶۶۱ء میں اس

نے کوچ بہار کو فتح کیا اور اگلے ہی سال آسام کو بھی اپنی ریاست میں ضم کرلیا۔ ۱۶۶۳ء کو خضر پور میں اس کی موت ہوئی جو اب ڈھاکہ سے دس میل دور لکھیا ندی کے کنارے پر واقع ماڈل ٹاؤن نارائن گنج کا ایک حصہ ہے۔

شائستہ خان: (۱۶۶۳ء۔۔ ۱۶۸۹ء):

میر جملہ کی موت کے بعد نور جہاں کا بھتیجا شائستہ خان کئی سال کے لئے بنگال کا گورنر بنا۔ بتایا جاتا ہے کہ اس کے عہد میں چاول آٹھ من فی روپیہ کے حساب سے بکتا تھا۔ شائستہ خان نے ڈھاکہ کے لال باغ قلعے میں رہائش اختیار کی جہاں انتہائی تجسس کے ساتھ تعمیر کی گئی اس کی پیاری بیٹی پری بی بی کی قبر اب تک دیکھی جاسکتی ہے۔ (ملاحظہ فرمائیں: آرکیالوجیکل سروے رپورٹ آف انڈیا۔ از: کیوننگھم۔ص: ۱۳۰/تا ۱۳۱ء، اور پلیٹ ۳۴)

ابراہیم خان ثانی: (۱۶۸۹ء) اور مرشد قلی خان (۱۷۰۴ء۔۔ ۱۷۲۵ء):

ابراہیم خان ثانی ۱۶۸۹ء میں بنگال کے گورنر کی حیثیت سے شائستہ خان کا جانشیں مقرر ہوا تاہم ۱۷۰۴ء میں مرشد قلی خان کے حکومتی باگ ڈور سنبھالنے تک پے در پے ۶/گورنر ہو چکے تھے۔ مرشد نے دارالحکومت کو ڈھاکہ سے مرشد آباد میں منتقل کیا اور کئی خوش منظر تعمیرات سے شہر کی خوبصورتی بھی بڑھائی۔ اُسی نے اپنے دارالحکومت کا نام اپنے نام پر ''مرشد آباد'' رکھا تھا۔

شجاع الدین (۱۷۲۵ء):

۱۷۲۵ء میں شجاع الدین محمد خان گورنر بنا اور اُس نے تقریباً خودمختاری حاصل کرلی۔ شجاع الدین کے بعد سرفراز خان (۱۷۳۳ء)، علی وردی خان (۱۷۴۰ء) اور سراج الدولہ (۱۷۵۶ء) یکے بعد دیگرے بنگال کے نواب ہوئے۔ بالآخر ۱۷۵۷ء میں لڑی گئی پلاسی کی جنگ سے بنگال کی فرماں روائی انگریزوں کے ہاتھوں میں چلی گئی۔

بنگال کے گزشتہ اقتصادی حالات:

ماضی میں بنگال کی عمومی ترقی کے حوالے سے عظیم سیاح ابن بطوطہ جس نے ۱۳۴۵ء میں بنگال کا دورہ کیا تھا، کا بیان ہے [1] کہ اس نے دہلی کے ایک تاجر محمد المسمودی مغربی کو کہتے سنا کہ جب اس تاجر نے اپنی بیوی اور نوکر چاکر

1۔ ابن بطوطہ نے اپنے مشہور زمانہ سفرنامہ میں لکھا ہے کہ: بنگالہ ایک وسیع ملک ہے، چاول بکثرت ہوتا ہے، ایسی ارزانی میں نے اور کسی ملک میں نہیں دیکھی۔ چاول وہاں ایک دینار نقرئی کے پچیس رطل آتے ہیں، حالانکہ اُس سال

کے ساتھ بنگال میں قیام کیا تھا تب آٹھ درہم۔۔۔برابر ایک روپیہ۔۔اس کے پورے سال کے راشن خرچ کیلئے کافی ہوتے تھے۔ پچاس رَطل (ایک رَطل برابر ۱۴ر سیر) چاول ایک درہم میں خریدا جاسکتا تھا جبکہ آٹھ پرندے یا پندرہ کبوتر ایک درہم میں بیچے جاتے تھے۔ایک مینڈھے کی قیمت محض دو درہم تھی۔ابن بطوطہ نے عمدہ قسم کے تیس کیوبٹ سوتی کپڑے صرف دو دینار میں بکتے دیکھے۔۔۔۔سونے کا ایک دینار چاندی کے دس دینار کے برابر تھا اور چاندی کا ایک دینار آٹھ درہم یا ''ہشت کانس'' کے برابر تھا۔۔۔ابن بطوطہ کے دورۂ بنگال کے وقت مروجہ قیمتوں کا ایک خاکہ اس وقت کے مروجہ پیسوں اور وزنوں کے حساب سے پیش کیا جارہا ہے جو بھٹاسالی کی ''اَرلی انڈیپنڈنٹ سلطانس آف بنگال'' سے ماخوذ ہے: دودھ دینے والی ایک گائے، قیمت: تین روپے۔۔۔ایک فربہ پرندہ، قیمت: تین پیسے۔۔۔دو کبوتر، قیمت: تین پیسے۔۔۔ایک فربہ دنبہ، قیمت: چار آنہ۔۔۔ایک من چینی، قیمت: (1-7) ۔۔۔ایک من شہد، قیمت: (2-14)۔۔۔۔ایک من چاول، قیمت: ایک آنہ نو پیسے۔۔۔ایک من گھی، قیمت: (1-7)۔۔۔ایک من تِل کا تیل، قیمت: ساڑھے گیارہ پیسے۔۔۔۔سوتی کے پندرہ گز عمدہ کپڑے، قیمت: دو روپے۔۔۔خود ابن بطوطہ نے سونے کے ایک دینار میں ایک خوبصورت کنیز خریدی تھی۔

سر جارج ووڈ کا بیان ہے کہ ۱۵۷۵ء میں اولڈ مالدہ کے ایک رئیس تاجر نے بیش قیمت ریشمی کپڑوں سے بھرے ہوئے تین جہاز خلیج فارس کے راستے سے روس بھیجے تھے جو واضح طور پر یہ بتا رہا ہے کہ مالدہ کی ریشم صنعت کافی قدیم اور پائیدار ہے۔۔۔انگلش بازار کے مقامی لوگ بتاتے ہیں کہ گور میں پہلے کل بائیس بازار تھے جن میں سے مہاجن ٹولی، لال بازار، ہباس خانہ اور چاندنی چوک بہت اہم تھے۔

گرانی تھی۔۔۔۔دودھ والی بھینس وہاں تین نقرئی کو آتی ہے۔اِس ملک میں گائے نہیں ہوتی۔اچھی موٹی مرغیاں ایک درہم کی آٹھ آتی ہیں، اور کبوتر کے بچے ایک درہم کے پندرہ، اور موٹا مینڈھا دو درہم کا، اور شکر کا رطل چار درہم کو، اور گلاب کا رطل آٹھ درہم کو، اور گھی کا رطل چار درہم اور میٹھے تیل کا رطل دو درہم کو، اور روئی کا ایک کپڑا تیس گز لمبا دو دینار میں، اور خوبصورت کنیز ایک دینار طلائی کو۔۔۔اِس قیمت کو میں نے ایک کنیز عاشورہ نام خریدی، وہ نہایت خوبصورت تھی۔اور میرے ایک ساتھی نے ایک غلام چھوٹی عمر کا جس کا نام لولو تھا، دو دینار میں خریدا۔(سفرنامہ ابن بطوطہ، حصہ دوم۔اردو ترجمہ: رئیس احمد جعفری۔ص: ۲۲۴۔مطبوعہ: نفیس اکیڈمی، اردو بازار، کراچی، پاکستان۔سن اشاعت: ۱۹۸۶ء) از: میزان۔

گور

پلیٹ نمبر۲

﴿باب سوم﴾

دوشہروں کے باقی ماندہ آثار

فصل اول۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔گور

بنگال کا قدیم اور تباہ شدہ دارالحکومت۔۔۔۔۔گور۔۔۔۔ضلع مالدہ میں گنگا کی ایک خشک اور ویران دھارا کے کنارے پر واقع ہے (ارض البلد ۲۴ درجے ۵۳ منٹ شمال، طول البلد ۸۸ درجے ۱۴ منٹ مشرق)۔تاریخی وثائق سے پتہ چلتا ہے کہ سلطنتِ گور اپنے وقت میں اتنی ترقی یافتہ اور عظیم الشان تھی کہ سوائے سلطنتِ دہلی کے، پورے ہندوستان میں جاہ وجلال کے اعتبار سے اس کا کوئی حریف نہیں تھا۔یہ شہر کافی وسیع وعریض تھا۔یہاں علم وفضل کے شہرہ آفاق تاجدار، بڑے بڑے رئیس اور عالی خاندان لوگ آباد تھے۔

گور کے قدیمی شہر کا محل وقوع: ایک جائزہ

گور کا قدیمی شہر، مہانندا اور قدیم گنگا کے سابق سنگم کے نزدیک ایک خاص خطہ ارض پر واقع تھا۔سابق مہتم بالشان دارالحکومت پنڈوہ کے زوال کے بعد گور کو دارالحکومت کے طور پر شاید اسی لئے منتخب کیا گیا تھا کہ یہاں آبی وسائل کی بہتات تھی جن سے بآسانی پوری ریاست میں آب رسانی کا کام لیا جاسکتا تھا۔تاہنوز یہاں چند ایسے ہندو آثار موجود ہیں جن سے قدیمی شہر کے محل وقوع کی نشاندہی ہوتی ہے تاہم یہ بھی کہا جاتا ہے کہ راجہ لکھن سین اور اس کی فیملی کی آخری رہائش گاہ کالندری ندی کے جنوبی کنارے پر گنگارام پور کے نزدیک ''بچھلی'' میں تھی جہاں اب تک زمین کا ایک بڑا رقبہ لکھوری اینٹوں اور جنگلات سے گھیرا ہوا ہے۔علاوہ ازیں! بلاّل باڑی، راما بھیٹا، چاندی پور، پاتال چاندی، لوہاگڑھ، اَمریتی اور کَملا باڑی جیسے جگہوں کے نام شاید اس وقت خطے میں ہندوانہ تسلط وتصرف ہی کی وجہ سے رکھے گئے تھے۔اس مقام پر ایک اہم بات جو قابل ذکر ہے، وہ یہ کہ ساگر دیگھی کے شمال مغرب میں ایک میل کے فاصلے پر واقع کَملا باڑی میں، جہاں ایک وسیع وعریض تالاب موجود ہے اور جس سے وہاں قدیم ترین ہندو بود و باش کا پتہ چلتا ہے، کیونکہ ماضی قریب کے زمانے تک ''گوریسوری دیوی'' نامی ایک دیوی کی پوجا کی جاتی تھی اور اسی کی یاد میں جون کے مہینے میں ایک میلہ لگتا تھا۔

ان تمام امور سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مسلم بادشاہوں کی چڑھائی سے پہلے تک ہندو راجاؤں نے اپنی راج گدّیاں گنگا ندی، جو اُس وقت غالبًا کالندری سے ہوکر بہتی تھی، کے جنوبی کنارے پر مختلف جگہوں پر منتقل کی تھیں۔پھر آگے

چل کر جب گنگا نے اپنے بہاؤ کا راستہ بدلا تو گنگا کے کنارے کنارے مضبوط ترین پشتہ بندیاں قائم کرا کر قدیم ندی تلوں کے جنوبی اور مغربی حصے میں شہر بسا لیا گیا۔اس میں کوئی شک نہیں کہ سب سے پہلے ہندو راجاؤں نے شہری حفاظت کا بندوبست کرتے ہوئے ندی کنارے موجود اِن ''پشتوں'' کی تعمیر کرائی تھی۔تاہم آگے چل کر مسلم حکمرانوں نے ان پشتوں کو مزید بہتر طریقے پر استوار کرایا اور پہلے سے کئی درجہ زیادہ مضبوطی فراہم کی۔ہاں، پاتال چاندی کے پاس پتھر کی جو دیوار ہے وہ البتہ مسلم دور حکمرانی کی تعمیر ہے اور وہ دیوار ندی ہی کے قہر سے شہر کو بچانے کیلئے تعمیر کی گئی تھی۔اِس کے علاوہ ''دُوار باشینی'' میں شہر کے شمالی آخری حصے پر جو ''گیٹ وے'' ہے وہ بھی ایک مسلم حکمراں کی تعمیر ہے۔غیاث الدین کا تیار کردہ پشتہ (حالیہ راج محل روڈ) اسی حفاظتی تعمیری سلسلے ہی کی ایک اہم کڑی ہے جو گور کے مغربی حصے کی طرف ندی کے بہاؤ کو دیکھتے ہوئے اُس وقت کا ایک لازمی اقدام تھا۔یہ پیاس باڑی دیگھی اور وسیع تر ساگر دیگھی وغیرہ دراصل ندی ہی کے زوردار بہاؤ کے نتائج ہیں۔جب آگے چل کر بہاؤ کا رخ ادھر سے مُڑ گیا تو یہ جگہیں کافی وسیع وعریض تالاب یا جھیل کی شکل میں نظر آنے لگیں۔

اگر ریاست میں مسلم آبادی کی بات کی جائے تو پہلے پہل ریاست میں مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی ،مگر پھر دھیرے دھیرے دوسری ریاستوں سے ہجرت کر کے آنے والے مسلمانوں ،خصوصیت کے ساتھ ہندو مذہب کو چھوڑ کر داخل اسلام ہونے والے کثیر تعداد نومسلموں کی وجہ سے ریاست میں مسلمانوں کی آبادی کافی زیادہ بڑھ گئی۔ایسا خیال کیا جاتا ہے کہ نومسلموں کی زیادہ تعداد نے تو اپنی رضا ورغبت ہی کے ساتھ اسلام قبول کیا تھا تاہم کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو جبری طور پر داخلِ اسلام کئے گئے تھے۔[1] جب مسلم حکمرانوں نے ریاست میں ہندوؤں پر اپنا تسلط قائم

1۔اس مقام پر مجھے خان صاحب سے سخت اختلاف ہے۔۔۔۔یہاں سب سے پہلے یہ واضح کرتا چلوں کہ خان صاحب ایک ایسی جگہ کی تاریخ بیان کر رہے ہیں جہاں کے وہ خود باشندے ہیں۔اِس لئے ہوسکتا ہے کہ جبر والی بات اُن کی اپنی رائے نہ ہو بلکہ وہاں کے مقامی باشندوں کی عمومی رائے ہو یا پھر ان تک پہنچی محض اطلاعات کا نتیجہ ہو۔اگر ایسا ہے تو اس صورت میں مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی محسوس نہیں ہوگی کہ یہ ایک فنی غلطی ہے۔۔۔۔ہر تاریخ نویس کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ وہ اپنی تاریخ میں کسی بھی روایت کو جگہ دینے سے پہلے اسے عقل اور نقل دونوں اعتبار سے من کل الوجوہ جانچ لے۔یعنی اولاً یہ دیکھے کہ جو روایت وہ بیان کر رہا ہے وہ عقلاً ممکن بھی ہے یا نہیں؟ اگر عقلاً ممکن نہیں ہے تو اس کے لئے نقلاً دلیل تلاش کرنے کی ضرورت نہیں، وہ روایت خود بخود حدّ اعتبار سے ساقط ہو جائے گی۔(ہاں!

کرلیا تو مذکورہ بالا مقامات کے ہندو ناموں کو بدلنے کی بجائے انہیں جوں کا توں رہنے دیا بلکہ اپنی ہندو رعایا کے ساتھ

اگر ایسا ہے کہ روایت تو عقلاً ناممکن سی ہے لیکن اس کے مقابلے میں جو دلیل ہے وہ مسلم الثبوت اور ناقابل انکار ہے جیسے آیات قرآنیہ یا آحادیث نبویہ، تو راقم کے ایقان میں وہ روایت بہرصورت قابل قبول ہوگی)۔۔۔اور اگر روایت عقلاً ممکن ہے تو اُس وقت تاریخ نویس کے لئے یہ دیکھنا ضروری ہوگا کہ نقل کی کسوٹی پر روایت کا مرتبہ کیا ہے؟ یعنی روایت کے مآخذ کس حد تک قابل اعتبار ہیں؟ اگر مآخذ کلی طور پر قابل اعتبار ہوں تو بلاشبہ وہ روایت قابل قبول ہوگی اور اسے تاریخ میں جگہ دی جائیگی۔اور اگر نقلی دلائل اور مآخذ قابل اعتبار نہ ہوں یا اُن میں کسی طرح کا سقم ہو تو فنی اعتبار سے کوئی وجہ نہیں کہ وہ روایت قبول کی جائے اور اسے تاریخ میں جگہ دی جائے۔۔۔اب اس کلیہ کے تناظر میں جب ہم خان صاحب کی روایت کو جانچتے ہیں تو قطعی طور پر وہ روایت قابل اعتبار نہیں رہتی۔ بایں وجہ کہ مسلم بادشاہوں کی طرف سے تبدیلئ مذہب کے حوالے سے ہندوؤں پر جبر گرچہ عقلاً ممکن ہے لیکن نقل پوری طرح اس کی حمایت نہیں کرتی کیونکہ مستند اور قابل قبول دلائل کے ذریعے یہ بات ہرگز بھی ثابت نہیں کی جاسکتی کہ بنگال کے مسلم حکمرانوں نے جبرا ہندوؤں کو داخل اسلام کیا تھا۔۔۔دوسری بات یہ کہ خود خان صاحب کے پیراگراف کا آخری فقرہ بھی خان صاحب کی زیرنظر روایت کی نفی کرتا ہے کیونکہ خان صاحب اپنے پیراگراف کے آخر میں لکھتے ہیں:

"they generally showed much favour to their Hindu subjects"

اب آپ خود سوچیں کہ ایسا کیونکر ہوسکتا ہے کہ ایک طرف تو یہ حکمراں اپنی ہندو رعایا کے ساتھ انتہائی حسن سلوک کے ساتھ پیش آئیں اور دوسری طرف یہی حکمراں اپنی انہی ہندو رعایا کے ساتھ کوئی جبری پالیسی روا رکھیں؟ وہ بھی مذہب کے معاملے میں جو مشرقی کلچر میں تقریباً ہر انسان کے لئے روح کی حیثیت رکھتا ہے؟ تیسری بات یہ کہ ''جبرًا تبدیلئ مذہب'' والے پیراگراف ہی کے اندر خان صاحب نے یہ بات بھی کہی کہ:

"they did not change the Hindu names of the above places but kept them as they were before"

غور فرمائیں کہ جب مسلم فرماں رواؤں نے زیرنگیں ریاست کی جگہوں کے ہندوانہ نام تک نہیں بدلے، حالانکہ اگر وہ فرماں روا اتنے ہی زیادہ متشدد اور غیر روادار ہوتے تو فطری طور پر انہیں چاہئے تھا کہ وہ اولاً ان جگہوں کے نام بدل دیتے، مگر ایسا نہیں ہوا، تو پھر جبری طور پر ریاست کے لوگوں کا مذہب بدلنے کی بات کس زاویے کی بنیاد پر درست

بھی انتہائی حسن سلوک کے ساتھ پیش آئے۔

گور کی تجارتی بندرگاہ:

جب گنگا شہر گور کے پاس سے ہوکر گزرتی تھی تب بڑی بڑی کشتیوں کے ذریعے دور دراز مقامات سے مختلف طرح کے اسباب شہر میں درآمد کئے جاتے تھے اور پھر یہاں سے اُن اسباب کو الگ الگ جگہوں میں ایکسپورٹ بھی کیا جاتا تھا۔اُن دنوں ساگر دیگھی کے شمال میں واقع ''ہائی لینڈ'' خطے کا تجارتی مرکز ہوا کرتا تھا،گنگا کے قہر سے اس جگہ کو محفوظ رکھنے کے لئے اِس کے مشرق میں دوار باشینی گیٹ سے لے کر پھلواڑی گیٹ تک ایک مضبوط پشتہ بھی تیار کیا گیا تھا۔وہ لنگر گاہ جہاں مال بردار کشتیاں لنگر انداز ہوا کرتی تھیں،وہاں لمبوتری شکل کے پشتے تاہنوز دیکھے جا سکتے

مانی جاسکتی ہے؟ انصاف کی بات یہ ہے کہ جلال الدین (جادو) جو خود پہلے ایک ہندو تھے،کو چھوڑ کر دیگر مسلم حکمرانوں نے کسی کو جبراً داخل اسلام نہیں کیا بلکہ اسلام کی روح پرور تعلیمات اور صوفیاء کرام کی پرتاثیر تبلیغ نے لاکھوں اندھیرے دلوں میں ایمان و یقین کی شمع جلائی۔

جب دعوت وارشاد کے حوالے سے خان صاحب نے مسلم بادشاہوں کا ذکر کیا ہے تو اس پس منظر میں یہ بات بھی ملاحظہ فرمالیجئے کہ مصر،ترکی،اردن،لبنان اور عراق وغیرہ کی طرح ہندوستان میں بھی صدیوں تک مسلمانوں کی حکومت رہی مگر کیا وجہ ہے کہ آج اُن ممالک میں تو اسلام سر اٹھا کر جی رہا ہے لیکن ہندوستان میں غریب الدیار ہو چکا ہے؟ اگر آپ آنکھیں کھلی رکھ کر ہندوستان اور اسلامی ممالک کے مابین ایک زمینی موازنہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ دعوت وارشاد کے حوالے سے ہندوستان کی تاریخ آج نقشے پر موجود بیشتر اسلامی ممالک کی تاریخ سے قطعاً مختلف رہی ہے۔ ہندوستان میں دین متین کی اشاعت اور سربلندی بنیادی طور پر علماء اور صوفیاء کی رہین منت رہی،یعنی چند ایک افراد کو چھوڑ کر یہاں کے حکمراں طبقے نے اشاعت اسلام کے تئیں کبھی کوئی مؤثر قدم نہیں اٹھایا۔محصولات کی وصولی اور امور سلطنت کی تنظیم و تنفیذ کے بعد حالات سے بے پرواہ ہوکر اونچے اونچے محلوں میں دادعیش دینا ہی ان مسلم حکمرانوں کا شیوہ تھا۔ان لوگوں نے کبھی اس بات کی پرواہ نہیں کی کہ ان کے بعد اس اجنبی ملک میں اسلام اور مسلمانوں کا کیا بنے گا؟ اور یقیناً دین کے تئیں ان کی اسی غفلت اور بے حسی کا نتیجہ ہے کہ صدیوں تک مسلمانوں کی حکومت کے باوجود آج اسلام اور مسلمان دونوں ہی اس ملک میں تقریباً اجنبی بن گئے ہیں۔ ہندوستان کی اسلامی تاریخ کا یہ ایک ایسا باب ہے جو ایک حساس مسلمان کے لئے بہت ہی تکلیف دہ ہے۔از: میزان

ہیں۔ پیران پیر جاتے ہوئے درمیانی راستے میں ساگر دیگھی کے شمال مشرقی گوشے کے پاس جو پرانا پل ہے اُسے دیکھ کر اشارتی طور پر یہ پتہ چلتا ہے کہ اسی آبی گزرگاہ کے ذریعے چھوٹی چھوٹی کشتیوں کی مدد سے درآمد شدہ اسباب کو اندرونِ شہر لایا جاتا تھا۔ وہ پشتہ جو انگلش بازار کے موجودہ محل وقوع سے جانب جنوب تقریباً بیس سے پچیس میل تک گنگا کی نئی گزرگاہ کے ساتھ پھیلا ہوا ہے، اُسے دیکھ کر اِس خیال کو تقویت پہنچتی ہے کہ جب گنگا نے اپنے بہاؤ کا رخ جنوب کی سمت موڑ لیا تو اُس وقت رسل ورسائل کے ایک متبادل آپشن کے طور پر گاڑیاں بھی اس پشتہ والی سڑک پہ استعمال کی جاتی تھیں۔

رقبہ اور آبادی:

رقبے کی بات کریں تو قدیمی شہر کی لمبائی شمال سے جنوب تک کم از کم ساڑھے بارہ میل اور چوڑائی مشرق سے مغرب تک دو میل تھی جو پچیس مربع میلوں کا حاصل مجموعہ ہوتا ہے۔ مگر ایسا لگتا ہے کہ ایک ہی وقت میں شہر کے سارے اندرونی حصے آباد نہ تھے، ڈاکٹر بوچانن ہیملٹن نے ۱۸۰۸ء میں شہری رقبہ کے حوالے سے جو تفصیلات پیش کی تھیں اس کے مطابق یہ شہر بیس مربع میل پر پھیلا ہوا تھا۔۔۔۔ آبادی کی بات کریں تو ۱۶۴۰ء سے قبل ترتیب دی گئی اپنی ایک تحریر میں ''فاریہ وائی سوزا'' نے یہ بتایا تھا کہ اپنے عروج واقبال کے زمانے میں شہر کی آبادی بارہ لاکھ تھی۔ اِسے وقت کی ستم ظریفی ہی کہئے کہ ۱۵۷۵ء میں طاعون کے حملے کی وجہ سے تاریخ کا یہ عظیم الشان شہر دیکھتے ہی دیکھتے اجڑ گیا، اور اب تو لگ بھگ پچاس برس پہلے ہی یہاں گھنے جنگلات بنے کھڑے تھے جہاں شیروں اور دیگر جنگلی جانوروں کا راج تھا۔ پھر بھی اچھی بات یہ ہے کہ اب یہاں دھیرے دھیرے کھیتی باڑی وغیرہ کے چلن کو فروغ مل رہا ہے، یہاں وہاں نئے گاؤں کی بنیاد رکھی جا رہی ہے اور اجڑے ہوئے شہر کے باقی ماندہ کھنڈرات کے درمیان چھوٹے چھوٹے نئے آشیانے تعمیر ہو رہے ہیں۔

شہر گور کے تئیں ''ڈی بیروس'' کی پیش کردہ تفصیلات (ماقبل ۱۵۴۰ء):

''راہیں کشادہ اور سیدھی ہیں۔ اہم ترین سڑکوں کے کنارے دیواروں سے متصل ایک قطار میں پیڑ لگائے گئے ہیں تاکہ مسافروں کو چھاؤں ملتی رہے۔ آبادی بہت زیادہ ہے۔ سڑکیں ذرائع نقل وحمل کی کثرت اور لوگوں کے ہجوم، بالخصوص دربارِ شاہی میں حاضری کی غرض سے آئے ہوئے مسافروں کی بہتات کی وجہ سے اس قدر بھری رہتی ہیں کہ ایک راہگیر دوسرے راہ گیر کو کراس کر کے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ شہر کا ایک بڑا حصہ عالیشان اور دلکش عمارتوں پر مشتمل

ہے'' (ڈی بیروس، ''دی ایشیا'' لزبن ایڈیشن، ۱۷۷۸ء، ج:۸، ص:۴۵۸)۔

گور کی حصار بندی:

شہرِ گور، مٹی کی ایک اونچی فصیل کے ذریعے مکمل طور پر گھیرا ہوا تھا اور فصیل کا بالائی حصہ عمارتوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ [1] شہر کے اندر بے شمار عمارتیں تھیں جن کی وجہ سے گنگا، جس کے کنارے یہ شہر آباد تھا، کا نظارہ نہایت ہی حسین بن جاتا تھا۔ شہر کے مشرقی کنارے پر ایک دوہری فصیل بنی تھی جس کے دونوں اطراف میں ۱۵۰ فٹ چوڑی والی ایک گہری کھائی ہوا کرتی تھی۔ تمام شاہراہیں شمال سے جنوب کو جاتی تھیں اور شمالی و جنوبی فصیلوں میں لوگوں کی آمد و رفت کے لئے دروازے بنے ہوئے تھے۔ البتہ شہر کا مغربی حصہ کھلا ہوا تھا، کیونکہ مغربی حصے میں گنگا کے بہنے کی وجہ ایسا خیال کیا جاتا تھا کہ اِس طرف سے دشمن کی کسی بھی طرح کی دست درازی کو روکنے کے لئے گنگا ہی کافی ہوگی۔

بتاتے چلیں کہ گور کے کھنڈرات کو از ہمہ اول مسٹر کریٹن نے ۱۷۸۶ء اور ۱۸۰۷ء کے بیچ میں دریافت کیا تھا۔ اس کے بعد ۱۸۰۸ء میں ڈاکٹر بوچانن ہیملٹن نے اور ۱۸۱۰ء اور ۱۸۱۱ء کے بیچ میجر ڈبلیو، فرینکلن نے دریافت کئے۔ آخر الذکر دونوں ماہرین آثار قدیمہ نے کھنڈرات کے اُس وقت کے کوائف کی تفصیلات بھی تحریر کی تھیں۔

مدفون خزانہ:

اپنے دامن میں ان گنت عمارتوں اور محلوں کو سمیٹے ہوئے ایک عظیم الشان شہر ہونے کے ناطے یہ بات ناقابلِ توجہ نہ تھی کہ اس شہر کی بے اندازہ دولت سطح زمین کے نیچے دفن کی گئی ہوگی یا پھر مقبروں اور زمین دوز حجروں میں چھپائی گئی ہوگی، خصوصیت کے ساتھ اُس زمانہ ماضی کو دیکھتے ہوئے جب آج کی طرح کوئی بنکنگ نظام نہیں تھا۔ چنانچہ منریق جس نے ۱۶۴۱ء میں گور کے کھنڈرات کا دورہ کیا تھا، تازہ دریافت کی ایک کہانی یوں بیان کرتا ہے کہ: ایک کھوکھلے دیوار کے اندر تانبے کے تین ایسے برتن پائے گئے ہیں جو سونے کے سکوں اور دگر بیش قیمت پتھروں سے بھرے ہوئے تھے اور جن کی مالیت تین کروڑ تھی۔ یہ سرمایہ اُس وقت کے گورنر شاہ شجاع کے حوالے کیا گیا تھا۔ [2]

1۔ پشتے پر بنی عمارتیں اب غائب ہیں اور فصیل بھی گھنے جنگلات اور درختوں کے نیچے کہیں گمشدہ ہے۔ اسٹیپلٹن

2. Travels of Sebastien Manrique, 1629-43 (Hakluyt Society publication, 1927, Vol, II, pp. 128-132.

سیر المتأخرین میں ہے کہ: ۱۷۶۶ء میں کیپٹن ایڈمز نے گور میں ایک مقبرہ اور تہ خانہ کھولا جس میں اُس نے ایک شاہی لاش، جو گزشتہ چار سو برس سے مکمل طور پر محفوظ تھی، کے پائنتی ایک عود دان (ایک ایسا برتن جس میں خوشبو کے لئے لکڑی وغیرہ سلگاتے ہیں)، دو برتن، کچھ ہتھیار اور ایک چراغ پائے۔ (Vol. III, footnote 271, p. 386---- Cambray's reprint)

زمانہ ماضی کے چند دیگر نشانات:

اِس اجڑے ہوئے شہر کے متعدد مقامات میں مقامی کسان طبقہ نے بھی خزانے کی تلاش میں کھدائیاں کی ہیں جس کے نتیجے میں مختلف کشادہ دیوان خانوں، پختہ راستوں، سیڑھیوں، زمین دوز گزرگاہوں اور بھی چند دگر قابل لحاظ یادگاروں کا انکشاف ہوا ہے۔ بلاشبہ یہ ساری باتیں وقت کے ایک ممتاز شہر کی عظمت کی گواہی دیتی ہیں۔

﴿تصویر نمبر ۶﴾ پرشکوہ سونا مسجد، گور کا دروازہ
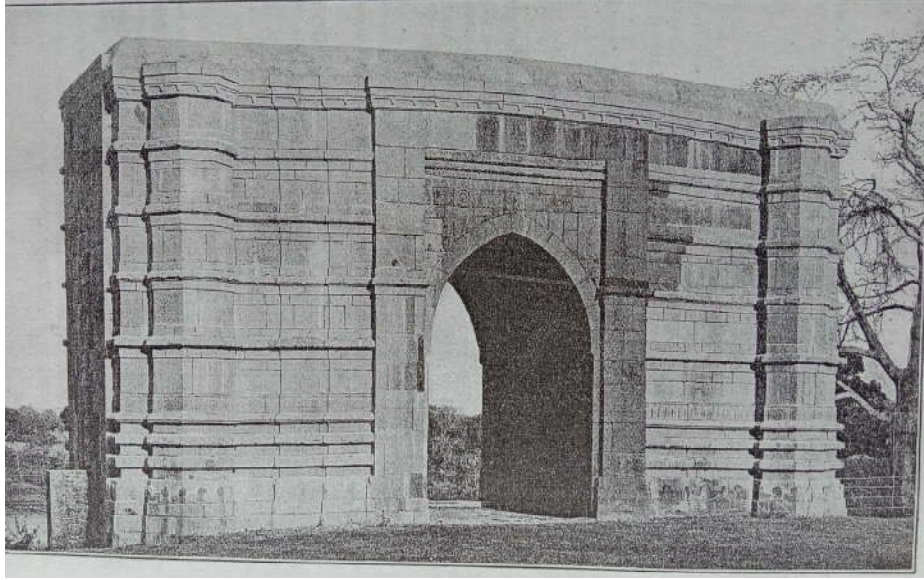
گورو پنڈوہ کی قدیم عمارتوں کی تباہی کے اسباب:

۱۵۳۹ء میں جب شیر شاہ نے بنگال پر حملہ کیا تو اُس وقت گور کو تباہ کر دیا گیا تھا اور پھر اُس کے بعد یہ پرشکوہ دارالحکومت روبہ زوال ہو گیا اور اُس کی عمارتیں فراموش کر دی گئیں۔ دیکھا جائے تو تعمیری آثار کے تحفظ کی، بنگال کی آب و ہوا بھی ایک انوکھی دشمن ہے۔ اگر پیپل یا املی کے درختوں کی جڑیں کسی عمارت کی دراڑوں میں کہیں ہلکی سی بھی

راہ پالیں تو اُس عمارت کی تباہی تو یقینی ہے۔ مزید برآں، برسات کے موسم میں کشتیاں بڑی آسانی کے ساتھ اِن کھنڈرات تک پہنچ جاتی تھیں، سولوگ کشتیاں بھر بھر کر یہاں سے اینٹ پتھر وغیرہ اُس وقت کے نوآباد شہر انگلش بازار، پھر مرشدآباد، راج محل، ہگلی اور آخر میں کلکتہ [1] تک لے جانے لگے۔ اس طرح سے گوروپنڈوہ، دونوں دیار کی قدیم رہائشی عمارتیں انسان اور ریاستی آب وہوا نے باہم مل کر تباہ وبرباد کردیں۔ ہم خوش نصیب ہیں کہ ہمیں قدیم مساجد کے کچھ آثار اور صوفیہ کے کچھ مقابر دیکھنے کو مل گئے جو محض اپنی تقدیس کی بنیاد پر ''مالِ غنیمت'' لوٹنے والوں کے خورد برد سے محفوظ رہ گئے تھے۔

﴿یادگار نمبر ۱﴾ بارہ دواری۔۔یا۔۔پرشکوہ سونا مسجد، رام کلی

(تعمیر کردہ: سلطان نصرت شاہ۔ بتاریخ: ۹۳۲ھ مطابق ۱۵۲۶ء)

اینٹوں اور ظاہری سطح پر چنے گئے پتھروں سے بنی قائم الزاویہ شکل کی یہ پرشکوہ مسجد ۱۶۸ر فٹ لمبی اور ۷۶ر فٹ چوڑی ہے۔ مسجد کے گوشوں میں کنگرے بنے ہوئے ہیں۔ گور میں موجود تمام یادگاروں کے درمیان یہ مسجد سب سے بڑی ہے۔ مسجد کے عین سامنے، جانب مشرق، ۲۰۰ر اسکوائر فٹ پر پھیلا ہوا ایک کشادہ صحن ہے۔ ساتھ ہی کئی محرابدار دروازے ہیں جن میں سے ہر دروازہ تین اطراف کے مابین ساڑھے ۳۸ر فٹ برابر ساڑھے ۱۳ر فٹ وسیع ہے۔ مشرقی دروازہ کو بکمال احتیاط بحال کردیا گیا ہے اور اس کے حالیہ نقش ونگار کا ایک نمونہ تصویر نمبر ۶ر میں پیش کیا گیا ہے۔ مسجد کے اندر گراں بارسنگین ستونوں کے ذریعے تین گلیارے نکالے گئے ہیں اور ساتھ ہی ایک راہداری بھی ہے جو عمارت کی پوری لمبائی کے ساتھ جاتی ہے۔ سامنے ۸ر دروازے ہیں جن میں سے ہر دروازہ ۵ر فٹ ۱۱ر انچ چوڑا ہے۔ شمالی اور جنوبی اطراف کے اواخر میں بھی دروازے موجود ہیں۔ عمارت کی چھت ۴۴ر چھوٹے چھوٹے نیم کروی

1۔ گرانٹ کے مطابق نظامت دفتر، مرشدآباد نے مقامی زمینداروں کو آثارِ گور کو منہدم کرنے اور وہاں سے بیش قیمت مینا کی ہوئی اینٹوں اور سنگہائے موسی کو برآمد کرنے کا جو حق دے رکھا تھا اُس کے بدلے میں اُن زمینداروں کی طرف سے دفتر کو سالانہ آٹھ ہزار روپے موصول ہوتے تھے۔ ابھی انیسویں صدی عیسوی میں چند تراشیدہ پتھر، جو گور کے کھنڈرات میں پائے گئے ہیں، کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ کلکتہ کے تابوت سازوں اور دیگر یادگاری مقاصد پر کام کرنے والوں کی غارت گری کا شاخسانہ ہے۔ ۱۸۹۹ء عیسوی سے گور کی اجڑی ہوئی عمارتوں کے انہدام کے عمل کو حکومت کی جانب سے روک دیا گیا ہے۔ (ایچ، ای، اسٹیپلٹن)

گنبدوں سے بنائی گئی تھی جن میں سے راہداری کے گیارہ گنبدیں اب تک موجود ہیں اور لارڈ کرزن کی زیرِ ہدایت ان کی مرمت بھی ہو چکی ہے۔ یہاں پتھروں پر قلمکاری کے کچھ نمونے باقی رہ گئے ہیں جن میں سے مندرجہ ذیل کتبہ سے واضح طور پر پتہ چلتا ہے کہ یہ عظیم ترین مسجد ۹۳۲ھ مطابق ۱۵۲۶ء کو سلطان نصرت شاہ نے بنوائی تھی۔ فرینکلن کے

﴿تصویر نمبر ۷﴾ پر شکوہ سونا مسجد کی گلیارے
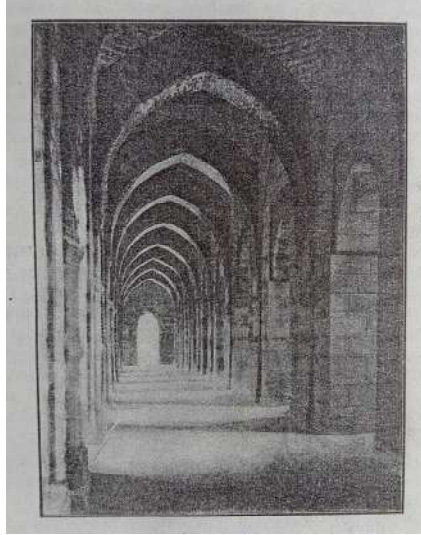
زمانے میں یہ کتبہ اپنی مخصوص جگہ ہی پر دریافت ہوا تھا مگر اب یہ کتبہ یہاں سے غائب ہے، کتبے پر نوشتہ تغرا حروف تقریباً ۹؍انچ پر پھیلے ہوئے تھے۔ کیوننگھم کا بیان ہے کہ وسطی دروازہ کے بالائی حصے پر موجود خالی پینل، جہاں سے کتبات والے سنگین تختے کو ہٹایا گیا ہے، کی پیمائش پانچ فٹ دو انچ لمبی اور دو فٹ ایک انچ چوڑی ہے۔۔۔ آنے والا اقتباس اُس کتبہ کا ترجمہ ہے جسے فرینکلن نے دریافت کیا تھا: رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ جس شخص نے ایک مسجد بنائی، اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت میں ایک گھر بنائے گا۔۔۔ یہ جامع مسجد ۹۳۲ھ (مطابق ۱۵۲۶ء) میں عظیم الشان، عالی مرتبت، شہزادہ ناصر الدنیا والدین ابوالمظفر سلطان نصرت شاہ ابن سلطان حسین شاہ ابن سید اشرف الحسینی نے تعمیر کرائی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی حکومت وسلطنت کو دوام بخشے اور عظمت وقوت میں اضافہ فرمائے''۔

''سونا مسجد'' کی وجہ تسمیہ:

کیوننگھم نے بیان کیا ہے کہ فرینکلن کو ''سونا مسجد'' کے مروج نام پر کافی زیادہ حیرت ہوئی تو اس نے ایک انوکھا نظریہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ: یہاں کہیں بھی سونے کا کوئی نام ونشان نہیں ہے، اِس لئے قرین قیاس یہ ہے کہ یہ نام

تعمیر مسجد میں آئی بھاری لاگت اور استعمال کئے گئے گراں بار اسباب سے ماخوذ ہے۔اگر چہ مقامی لوگ گراں بار اسباب کوسونا نہیں کہتے تاہم تعمیر مسجد پر آئی لاگت کا (سونا کے ساتھ) حقیقی یا مجوزہ تخمینہ کرنے کے بعد لوگ اسے سونا مسجد کہنے لگے۔ پنڈوہ کا ایک لاکھی مقبرہ اور لاہور کا نولاکھی محل اس نظریہ کی نظیر ہیں''۔

حقیقت یہ ہے کہ مسجد کے گنبدوں پر واقعی طور پر سونے کا ملمع چڑھایا گیا تھا اور سطح کچھ اس انداز سے آراستہ کی گئی تھی کہ سورج کی کرنوں اور چاند کی چاندنی میں پوری مسجد سونے کی تعمیر شدہ نظر آتی تھی، اِسی وجہ سے مسجد کا نام ''سونا مسجد'' رکھا گیا۔ یہ سچ ہے کہ ابھی یہاں ملمع کاری کا کوئی بھی اثر آشکارا نہیں ہے تاہم اِس ''اثر'' کے تئیں لوگوں کے درمیان ایک کائناتی عقیدہ موجود ہے۔اس کے علاوہ ہم سب جانتے ہیں کہ فیروز پور میں موجود ''چھوٹی سونا مسجد'' کا نام یقینی طور پر مذکورہ بالا وجہ تسمیہ ہی کی بنیاد پر رکھا گیا ہے، کیونکہ کریٹن نے (چھوٹی سونا مسجد، فیروز پور ہی کے بارے میں) ذکر کیا ہے کہ: اِس پر ملمع کاری کے اثرات تاہنوز موجود ہیں، اور ممکنہ طور پر اس مسجد کا اور سابق شاندار عمارت کا نام ''سونا'' سونے کی اسی ملمع کاری کی وجہ سے رکھا گیا ہے''۔ بلکہ سچائی تو یہ ہے کہ ۱۸۷۹ء میں جب جنرل کیونگھم نے خطے کا دورہ کیا تھا تو اس وقت بھی ''چھوٹی سونا مسجد'' پر ملمع کاری کے اثرات موجود تھے۔

''بارہ دواری'' نام کی توضیح:

عمارت کا عوامی نام ''بارہ دواری'' ہے جس کا معنی لغت میں بارہ دروازہ کے آتا ہے مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ یہاں سامنے صرف گیارہ ہی دروازے ہیں اس لئے اس کے واقعی نام کے سلسلے میں خاصا اختلاف واقع ہوا ہے۔اس سلسلے میں راقم کا خیال یہ ہے کہ ''بارہ دواری''، جس کا معنی عموماً ''دیوان خانہ سامعین'' کے لیا جاتا ہے، کا نام مسجد کو اُس کے سامنے واقع کشادہ صحن کی وجہ سے دیا گیا ہے۔

پلیٹ فارم برائے خواتین:

مسجد کے شمالی گوشے میں خواتین کیلئے ایک اونچا پلیٹ فارم بنایا گیا تھا۔خواتین چھوٹے دروازوں کے ذریعے، شمالی حصے پر بنے اُس بالا خانہ تک، مسجد آیا کرتیں۔ڈھلان دار چبوترہ جو زمینی سطح پر بنے دروازوں تک جاتا تھا، کے آثار آج بھی وہاں دیکھے جاسکتے ہیں۔

خواتین کے لئے بنائے گئے اس طرح کے پلیٹ فارم مرکزی ہندوستان، خان دیش اور بھی متعدد مقامات پر موجود ہیں تاہم مغل عہد حکمرانی میں خواتین کیلئے نشست گاہیں ستونوں کے ذریعے بالائی حصے یا محرابوں پر نہیں بلکہ عام

طور سے گراؤنڈ فلور ہی پر استوار کی جاتی تھیں۔

﴿تصویر نمبر ۸﴾ پرشکوہ سونا مسجد، گور کا بیرونی منظر
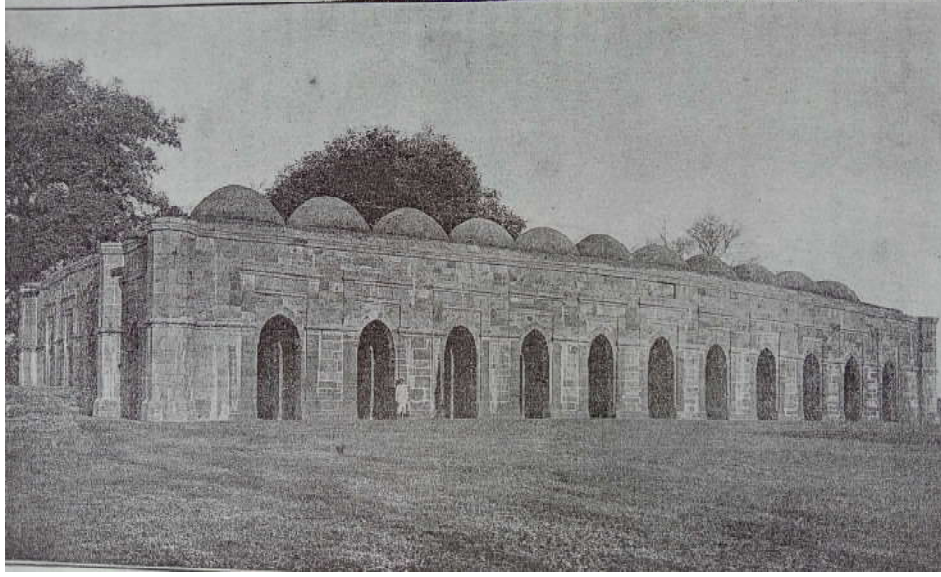
قدیم سنگین ستون:

سنگین ستونوں، جن کے اوپر گنبدوں کی محرابیں ٹکی رہتی تھیں، کے وقوع کی جگہیں اب نشان زد کردی گئی ہیں اور بنیادوں کے بالائی حصے پر پلاسٹر چڑھا دیا گیا ہے۔ساتھ ہی منبر بھی نشان زد کر دیا گیا ہے۔مغربی دیوار کی محرابوں میں دلفریب سجاوٹی نقش ونگار بنائے گئے تھے، یہ نقش ونگار اگرچہ اِس وقت رخصت ہو چکے ہیں تاہم بعض حصوں پر اب تک کچھ ایسے آثار پائے جاتے ہیں جو اُس عہد کی عمدہ ترین کاریگری کے عکاس ہیں۔

چبوترہ:

مسجد کے جنوب مشرقی حصے میں ایک اونچا پلیٹ فارم بنا ہوا ہے جسے مقامی لوگ ''چبوترہ'' کے نام سے پکارتے ہیں۔ایسا مانا جاتا ہے کہ چبوترے کا استعمال مؤذن اذان دینے کے لئے کرتا تھا لیکن یہ بات کچھ زیادہ معقول نہیں لگتی، کیونکہ اذان تو عام طور پر اونچے میناروں سے پکاری جاتی ہے۔

آثار قدیمہ:ایک جائزہ:

مسجد کے شمال اور شمال مغربی سمتوں میں اونچی زمینوں پر دیگر عمارتوں کے بھی نشانات نمایاں ہیں۔غالباً یہ سب

اُس وقت کے مدارس اور سرائے کے وقوع کی جگہیں ہیں۔ اگر کھدائی کی جائے تو اغلب طور پر یہاں سے عمارتوں کی اساسیں برآمد ہوں گی۔ مشرقی دروازہ کے عین مشرق میں ایک عمدہ ترین تالاب ہے جو چھ سوفٹ لمبا اور تین سوفٹ چوڑا ہے۔ مندرجہ ذیل اقتباس میجر فرینکلِن کا مسجد پر ایک تبصرہ ہے:

''محرابیں نوکیلی ہیں، سوممکنہ طور پر گوتھک [1] یا انسب طور پر عربی طرزِ تعمیر، جسے ہندوستان کے قدیم فاتحین نے یہاں متعارف کرایا ہے، سے تعبیر کی جاسکتی ہے۔ یہ محرابیں ساخت اور بناوٹ کے اعتبار سے لودھی اور غوری خاندان کے بادشاہوں کے ذریعے پرانی دہلی میں تعمیر کردہ مساجد کے ساتھ بڑی حد تک ملتی جلتی ہیں۔ عمارت کی پوری ہیئت تحیر کی حد تک وسیع اور پرشکوہ ہے اور شہزادے، جس نے اِس مسجد کی تعمیر کرائی، کے نفیس اور شاہانہ ذوق کا پتہ دیتی ہے''۔

گوروپنڈوہ کی تعمیرات میں بنیادی مواد کے طور پر منقش اینٹوں جو اکثر ان مساجد کی چھتوں کے اندرونی حصوں میں دیکھی جاسکتی ہیں، کے استعمال کے سلسلے میں فرگیوسن لکھتا ہے کہ: بنگال میں ستونوں اور شہتیروں کو نصب کرنے کے لئے اینٹوں کے علاوہ نہ تو پتھر دستیاب ہیں اور نہ ہی کوئی دوسرا مناسب تعمیری مواد۔ اِسی لئے ایک ''انتہائی لازمی امر'' کے طور پر انہوں نے ہر جگہ اور ہر اُس عمارت میں، جسے وہ کسی بھی طرح پائیدار بنانا چاہتے تھے، محرابوں کا استعمال کیا۔

خمیدہ تراش والی چھتیں: بنگال کے باشندے عمومی طور پر بانسوں کی لچک کا فائدہ اٹھا کر اپنے لئے خمیدہ تراش چھتوں والے مکانات تعمیر کر لیتے ہیں اور یہ چیز اُن کی نظر میں اتنی محبوب ہے کہ وہ بانسوں کی تعمیرات کو نہایت ہی خوبصورت خیال کرتے ہیں۔

''اس خمیدہ ہیئت نے سولہویں صدی عیسوی تک دہلی اور اٹھارہویں صدی عیسوی تک لاہور میں اپنی راہ پائی، بایں وجہ آپ کہہ سکتے ہیں کہ ۱۶۵۰ء سے متوسط درجے کی تقریباً تمام تعمیرات اس کی شمولیت کی دعائیں مانگنے لگیں۔ ویسے یورپین نگاہوں میں تو یہ ڈھانچہ ہمیشہ سے ناخوشگوار رہا تاہم قومی نگاہیں، ہندو یا مسلم، اسے جدید ایجادات کی ایک

1۔ گوتھک: ایک طرزِ تعمیر ہے جو شمالی فرانس میں پلی، بڑھی اور جوان ہوئی اور پھر ۱۲۰۰ء سے لیکر ۱۶۰۰ء کے بیچ پورے یورپ میں پھیل گئی۔ باریک عمودی پشتنے، محراب دار عمارتیں اور نوکیلی محرابیں وغیرہ اِس طرزِ تعمیر کی خاصیت تھیں۔ ازمیزان)

خوبصورت ترین شکل میں دیکھتی رہیں۔[1]

﴿یادگار نمبر۲﴾ گور کا قلعہ

[جنرل کیوننگھم کی تحریر]

''لکھنوتی کا قلعہ قدیم گنگا کے کنارے پر واقع ہے۔ یہ قلعہ طول میں شمال سے جنوب تک تقریباً ایک میل اور عرض میں مشرقی دروازہ کے جانبِ مخالف وسیع تر حصے کے پاس نصف میل پر پھیلا ہوا ہے جبکہ شمالی اور جنوبی اطراف کے اواخر میں چوتھائی میل سے زیادہ اُس کی چوڑائی نہیں ہے۔ پورا قلعہ مٹی کی ایک بلند اور مضبوط ترین فصیل سے گھیرا ہوا ہے جو اوپری حصے میں ۳۰/فٹ اور اور بنیاد میں ۱۹۰/فٹ موٹی ہے، ساتھ ہی فصیل کے سارے گوشوں میں گول گول مینارے بنے ہوئے ہیں۔ فصیل کے بیرونی حصے میں تقریباً ۲۰۰/فٹ چوڑا ایک گہرا نالہ ہے۔ فصیل پوری کی پوری قد آور درختوں سے ڈھکی ہوئی ہے اور نالہ گھاس پات اور مگرمچھوں سے بھرا ہوا ہے۔ قلعے کی عمر تو غیر معلوم ہے تاہم چوں کہ یہاں ماضی قریب کی کوئی بھی نشانی موجود نہیں ہے اس لئے ایسا لگتا ہے کہ یہ قلعہ غالباً محمود ثانی (ناصر الدین:۱۴۴۲۔۱۴۵۹ء) اور اس کے جانشینوں کا تعمیر کردہ ہے''۔(رپورٹ، از: کیوننگھم۔ج:۱۵،ص:۵۰)

﴿تصویر نمبر۹﴾ داخل دروازہ یا قلعے کا صدر دروازہ
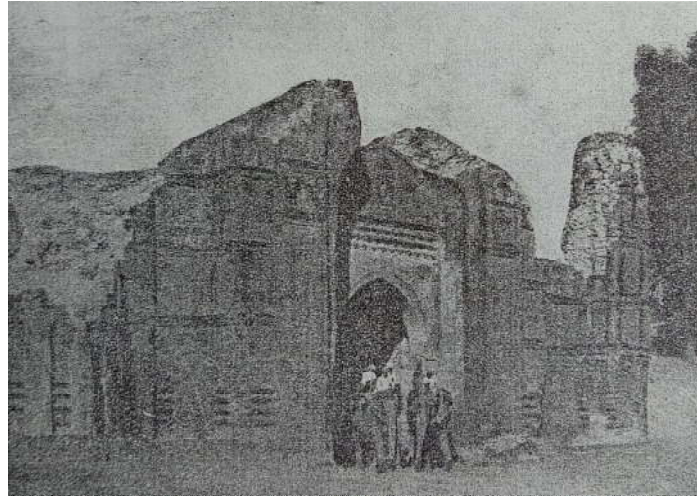
1. History of indian and Eastern Architechture,1910 ed. (Burgess and Spiers), Vol. II, pp. 253 and 254.

الف: داخل دروازہ یا قلعے کا صدر دروازہ:

بارہ دواری کے جنوب مغربی حصے میں نصف میل کے فاصلے پر واقع یہ ایک عظیم الشان دروازہ ہے۔اسے ''داخل دروازہ'' کے نام سے پکارتے ہیں کیونکہ شمالی جانب سے قلعہ کے اندر داخل ہونے کا یہ ایک بنیادی دروازہ تھا۔اس کا دوسرا نام ''سلامی دروازہ'' بھی ہے کیونکہ اسی دروازے سے ملحق فصیل پر سے سلامی پیش کی جاتی تھی۔

اس کی تاریخ تعمیر تو یقینی طور پر پتہ نہیں ہے مگر مشاہدہ سے لگتا ہے کہ یہ دروازہ غالبًا پندرہویں صدی عیسوی کے نصف اول میں تعمیر کیا گیا تھا، پھر بعد کے بادشاہوں مثلاً رکن الدین باربک (۱۴۵۹ء۔۔۔ ۱۴۷۵ء)، حسین شاہ اوراسی طرح نصرت شاہ نے امکانی طور پر اس کی مرمت واصلاحات کرائی تھیں۔اِسی دروازہ کے نزدیک، جانب شمال، ایک تالاب ہے، جس کے مشرقی حصے سے ایک آب گیر (نہر یا پکا نالہ) نکلتی ہے جو دور جنوب تک جاتی ہے۔ دروازہ بنیادی طور پر لکھوری اینٹوں سے بنا ہوا ہے اور (اپنے عروج کے دنوں میں) اعلیٰ ترین گل کاری سے آراستہ رہنے کی نشانیاں پیش کرتا ہے۔

''کریٹن کی تصویر، جو باہر سے اتاری گئی ہے، میناروں کے کناروں کو کافی ڈھلان دار دکھاتی ہے، جیسا کہ رونشاہ کی اتاری گئی اندرونی تصویر کے ساتھ موازنہ کر کے اِسے دیکھا جاسکتا ہے۔عمارت میں ایک وسطی گزرگاہ بھی ہے جو ۱۴رفٹ چوڑی اور تقریبًا ۱۰۰ر ساڑھے تیرہ فٹ لمبی ہے، ساتھ ہی گزرگاہ کے دونوں طرف ساڑھے چوہتر فٹ لمبا اور ساڑھے نو فٹ چوڑا محافظوں کا ایک ایک کمرہ ہے۔دیواریں، جو تقریبًا ساڑھے نو فٹ موٹی ہیں، گزرگاہ کے دونوں ہی اطراف تین تین دروازوں کے ذریعے چھیدی گئی ہیں، ساتھ ہی فصیل کے اندرونی حصے میں باہر کی طرف کھلتا ہوا ایک دروازہ ہے۔بیچ میں کافی بڑے بڑے سوراخ کئے ہوئے پتھروں، جو صدر دروازہ کی دیواروں میں چنے گئے ہیں، کو دیکھ کر بخوبی اس امر کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ دروازے کتنے قوی ہیکل رہے ہوں گے جو اِن پتھروں کے ساتھ مربوط تھے۔دروازہ کے دونوں بازو کافی بڑی آہنی سلاخ یا چوبی کیل کے ذریعے بند کئے جاتے تھے جیسا کہ گزرگاہ کے دونوں اطراف دیواروں کے اندر کافی گہرائی تک گئے روزنوں کو دیکھ کر پتہ چلتا ہے۔دروازوں کے درمیان کی کشادہ دَرزیں محرابوں کی حد تک اینٹوں اور ظاہری سطح پر چنے گئے پتھروں سے بنائی گئی تھیں تاہم بقیہ پوری عمارت محض اینٹوں سے بنی تھی۔چہار گوشوں میں ایک ایک ''دوازدہ پہلو'' مینار بنا ہوا تھا جن کی اونچائی ۵رمنزلہ عمارت کے برابر تھی اور ان میناروں کے سرے پر گنبد بنائے گئے تھے، میناروں کے فیس لکڑی سے مزین تھے جن میں تزئین کاری کے لئے عام زنجیریں اور گھنٹیاں باندھی گئی تھیں۔کریٹن نے میناروں کی اونچائی ترپن فٹ بتائی ہے تاہم اِس پیمائش میں وہ مینار یں

شامل نہیں ہیں جو کریٹن سے پہلے ہی تباہ ہو چکے تھے۔محراب کے دونوں پہلو کی دیواریں بھی زنجیروں اور گھنٹیوں سے میناروں ہی کی طرح آراستہ کی گئی تھیں۔ بیرونی محراب کی اونچائی ۳۴رفٹ تھی جس کے اوپر پندرہ فٹ اونچی کھانچے دار دیوار بنائی گئی تھی،اس طرح کل اونچائی انچاس فٹ کی تھی''۔(رپورٹ،از: کیوننگھم۔ص:۵۱)۔۔۔پوری عمارت تعمیر کرنے کے بعد اولاً چاروں طرف استرکاری کردی گئی تھی پھر بعد میں مشرقی اور مغربی اطراف میں عمارت کی بنیادیں مٹی سے ڈھک کر فصیل کے ساتھ ملادی گئیں تھیں۔فصیل کے اندرونی حصے سے اس کے اوپر تک جانے کیلئے پکے راستوں کے نشانات بھی پائے گئے ہیں۔اور ہاں! اینٹوں کے ایک ڈھانچہ کے ذریعے شہر بند بھی کافی مضبوط کردیا گیا تھا۔

قرب وجوار سے دریافت شدہ ایک کتبہ پر نوٹ:

ایک کتبہ، جو ۱۹۱۱ء سے کچھ سال پہلے ''داخل دروازہ'' کے نزدیک دریافت ہوا تھا، کی تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ ایک دروازے کی تعمیر نصرت شاہ نے کرائی تھی تاہم امکانی طور پر نصرت شاہ کا تعمیر کردہ دروازہ کسی مسجد یا مقبرہ کے صحن کا رہا ہوگا۔کتبہ پر موجود تحریر اور اس کا ترجمہ مندرجہ ذیل ہے:

بنی هٰذا الباب سلطان العهد والزمان المعروف بالعدل والاحسان سلطان بن السلطان ناصر الدنيا والدين ابو المظفر نصرت شاه السلطان بن حسين شاه السلطان الحسينى خلدالله ملكه و سلطانه فى سنة ست و عشرين و تسعمأة☆

ترجمہ: عدل واحسان میں مشہور شاہِ عہد وزماں، سلطان ابن سلطان، ناصر الدنیا والدین، ابوالمظفر ،سلطان نصرت شاہ ابن سلطان حسین شاہ الحسینی، اللہ تعالی اس کی حکومت اور سلطنت کو ہمیشہ قائم رکھے، نے ۹۲۶ ہجری (مطابق ۱۵۱۹عیسوی) میں اس دروازے کی تعمیر کرائی۔

ب: چاند دروازہ اور نیم دروازہ: (اس وقت موجود نہیں ہے)

شمالی دروازہ یعنی داخل دروازہ سے اوپر چڑھتی ہوئی ایک سڑک قلعے کے نصف جنوب میں واقع محل تک جاتی ہے۔ یہ سڑک درمیان میں واقع دو دروازوں ''چاند دروازہ اور نیم دروازہ'' سے ہوکر آگے بڑھتی ہے۔آخر الذکر دروازہ چونکہ محل کی دیواروں اور داخل دروازہ کے بالکل بیچوں بیچ واقع ہے،سو اغلب طور پر اپنے محل وقوع ہی کی وجہ سے اسے 'نیم دروازہ' (یعنی نصف راہ پر واقع دروازہ) کہا جاتا ہے۔ چاند دروازے کی ایک تصویر کریٹن کے ذریعہ

پیش کی گئی پلیٹ نمبر ۳ر میں دیکھی جاسکتی ہے۔اس دروازے کی طرزِتعمیر مکمل طور پر'' داخل دروازہ'' سے میل کھاتی ہے،ساتھ ہی فصیلوں اورمحرابوں کی اونچائی بھی یکساں ہے۔اسی چاند دروازہ کے نزدیک سے برآمد شدہ ایک کتبے سے نتیجہ اخذ کرتے ہوئے کریٹن نے ذکر کیا ہے کہ یہ دروازہ ۸۷۱ھ ہجری (مطابق ۱۴۶۶ءعیسوی) میں تعمیر کیا گیا تھا مگر آگے چل کر صفحہ نمبر ۵۶ر سے ۵۸ر تک نقل کئے گئے محل کے کتبات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ تاریخ دراصل ''نیم دروازہ'' کے تعمیر کی ہے۔

﴿یادگار نمبر۳﴾ مینار فیروز شاہ۔۔یا۔۔مینار فیروزی

یہ مینار قلعے سے باہراور بارہ دواری مسجد کے جنوب میں تقریباً ایک میل کے فاصلے پر واقع ہے۔مینار میں تاریخی ریکارڈ کے طور پر ایسا کوئی کتبہ تو موجود نہیں ہے جس سے اُس کی تاریخ تعمیر کا پتہ چلے،تاہم فرینکلن کو'گو امالتی' میں پتھر کا ایک ایسا کندہ کیا ہوا ٹکرہ ملا تھا جس پر سلطان سیف الدین کا نام درج تھا اسلئے فرینکلن اِس بات میں متیقن نظر آتا ہے کہ یہ مینار ضرور سلطان سیف الدین سے متعلق رہا ہوگا۔اس بارے میں کیوننگھم نے بھی بایں وجہ فرینکلن کی حمایت کی ہے کہ فرینکلن نے کتبہ والے حروف کی جو ناپ بتائی ہے وہ مینار کے دروازہ کے اوپر موجود پینل کی ناپ سے میل کھاتی ہے مگر کیوننگھم کے خیال میں مینار کا بانی سیف الدین فیروز شاہ (۱۴۸۶ءعیسوی) نہیں بلکہ سیف الدین ہمزہ شاہ (۱۴۱۲ء) ہے،تاہم تعمیراتی بنیادوں کے پیشِ نظر فرگیوسن نے مینار کے تعمیر کی بابت پندرہویں صدی عیسوی کے خاتمہ سے کچھ ہی سال پہلے کی تاریخ کو ترجیح دی ہے۔آس پڑوس کے لوگ مینار کو'' پیر آسا مندیر'' اور'' چراغ دانی'' کے نام سے پکارتے ہیں۔

اول الذکر نام کے تئیں کیوننگھم کا خیال ہے کہ یہ لفظ'' فیروزہ'' کی ایک بگڑی ہوئی شکل ہے اور اِس نام سے صاف طور پر پتہ چلتا ہے کہ مینار دراصل نیلے نگینوں سے آراستہ کیا گیا تھا۔کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ مینار اذان پکارنے کے مقصد سے بنایا گیا تھا،جبکہ کچھ صاحبان اسے'' واچ ٹاور'' بتاتے ہیں۔راقم السطور کا خیال ہے کہ جس طرح سے دہلی کے قطب مینار اور کولی، دولت آباد کے مماثل میناروں (اور جس طرح سے) اور بھی دیگر متعدد مقامات پر موجود میناروں کا قیام عمل آیا ہے،ٹھیک اُسی طرح یہ مینار بھی ایک'' نشان فتح'' کے طور پر تعمیر کیا گیا تھا۔

تفصیلات:

مینار کی اونچائی تقریباً ۸۴ر فٹ اور گولائی ۶۲ر فٹ ہے۔ایک پیچ دار سیڑھی بھی ہے جو ۷۳ر پائیدانوں کے ساتھ

بالائی چیمبر تک پہنچتی ہے۔ قدیم خاکوں اور تصویروں کو دیکھتے ہوئے کوئی بھی شخص یہ تجویز کرسکتا ہے کہ مینار کے بالائی

﴿تصویرنمبر۱۰﴾ فیروزہ مینار بحالی کے بعد
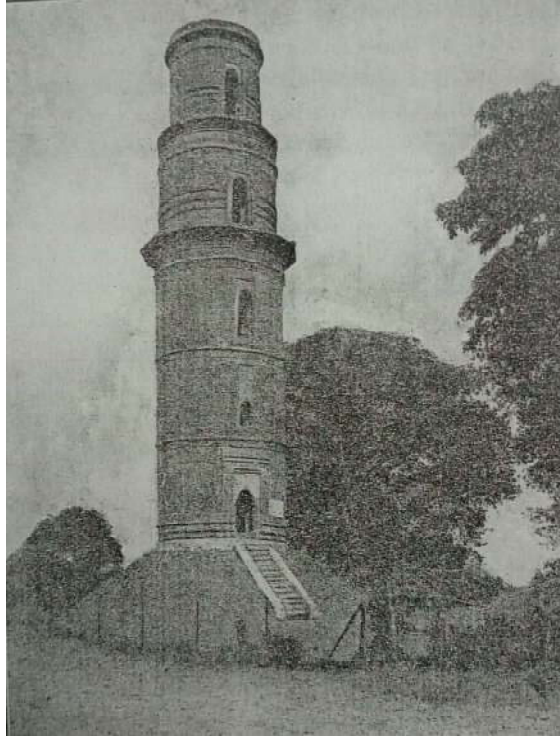
حجرہ کے اوپر چھت کے طور پر ایک گنبد بھی بنایا گیا تھا۔ فرینکلن نے ۱۸۱۰ء میں جب گور کا دورہ کیا تو اس نے یہاں ایک شکستہ گنبد بھی دیکھا۔ ڈینیل کے ذریعے مینار کا بنایا گیا خاکہ، اسی طرح کریٹن کے ذریعے بنایا گیا دلکش ترین رنگین خاکہ بھی اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ مینار کے سرے پر ایک گنبد ہوا کرتا تھا تاہم ابھی چند برسوں پہلے جب مینار کی مرمت کا کام شروع کیا گیا تو آثاریاتی انتظامیہ نے گنبد کے فی الواقع ہونے یا نہ ہونے کے تئیں شک وتردد کی وجہ سے، نئے گنبد کے تعمیر کی اجازت نہ دی سو کھلی چھت کے ساتھ ہی مینار کے بالائی حصے کا کام مکمل کردیا گیا۔

یہ مینار اپنی تین بٹا پانچ اونچائی اور دو بٹا پانچ گولائی تک جاکر دوازدہ پہلو والا ایک کثیر الاضلاع عمارت کے طور پر تعمیر ہوا ہے۔ ایسا مانا جاتا ہے کہ مینار کا سردابہ ہر چہار طرف صیقل شدہ پتھروں کے ذریعے پائیدانوں کی شکل میں آراستہ کیا گیا تھا، زیرزمین بنیادوں میں ناہموار پتھر نصب کئے گئے تھے اور یہ مینار ایک ٹیلے پر تعمیر کیا گیا تھا۔ اس سلسلے

میں آرکیالوجیکل ڈپارٹمنٹ کا ایسا ماننا ہے کہ بنیادوں کو مضبوط کرنے کے لئے اس کے آس پاس مٹیاں ڈال دی گئی تھیں اور اوپری سطح پر سبزہ جات اور پیڑ پودے لگا دیئے گئے تھے تاکہ یہ قطعہ زمین ایک ٹیلے کی طرح نظر آئے۔ آثاریاتی محکمے کی یہ تجویز ۱۹۱۱ء میں منظر عام پر آئی تھی۔[1]

مینار کے قدیم زائرین:

سابق کلکٹر مسٹر سیمویل کی مندرجہ ذیل دلچسپ تحریر جو فرہنگِ جغرافیہ، ضلع مالدہ سے ماخوذ ہے، ملاحظہ فرمائیں:
ناظم کمپنی ہیج نے ۱۶۸۳ء میں انگلش بازار اور گور کا دورہ کیا اور معائنہ کی تفصیلات اپنی ڈائری میں تحریر کیں۔ وہ ''لالگولا'' سے مہانندا آیا اور روہن پور کے نزدیک ''بالیا گھاٹا'' میں رات بھر کے لئے ٹھہرا، اُس نے دو فرنگی خواتین کے ساتھ گور کا دورہ کیا تھا۔ فینی پارکیز نے بھی گور کا دورہ کیا ہے، وہ مسٹر چیمبرز کو اپنے ساتھ لیکر آئی تھی اور اس نے وہاں مینار میں ہارووڈ ۱۷۷۱ء، ایس، گرے ۱۷۷۲ء، کریٹن اور بھی دیگر کئی لوگوں کے نام لکھے ہوئے دیکھے۔ اُس نے وہاں ایک نام کے اولین الفاظ ''ایم، وی ۱۶۸۳ء'' کا بھی معائنہ کیا۔ اس سلسلے میں مسٹر بیویریج کا خیال یہ ہے کہ یہ نام ہیج کے گروپ کی خواتین میں سے کسی ایک کا رہا ہوگا۔ مسٹر کریٹن نے تو متعدد بار اس مینار کا دورہ کیا تھا، اور چاقو کے ذریعے وہاں پر اپنا نام بھی کندہ کیا ہے جس کے ساتھ ۱۷۸۶ء، ۱۷۸۸ء، ۱۷۸۹ء، ۱۷۹۰ء، اور ۱۷۹۱ء کی تواریخ درج ہیں''۔

مسٹر ریوبَن براؤنے ۱۷۸۷ء میں اِس مینار کا دورہ کیا اور اُس کا محل وقوع، ارض البلد ۲۴ر درجے ۵۳ر منٹ شمال اور طول البلد ۵ر گھنٹے ۵۲ر منٹ ۱۳ر سیکنڈ مشرق متعین کیا۔ یہ ارض البلد ۲۹ر خطوط نصف النہاری سے استخراج کیا گیا جبکہ طول البلد کسی قدر فاصلوں سے اور کسی قدر گھڑیوں سے استخراج کیا گیا ہے۔

مقامی روایت:

مینار کے سلسلے میں ایک مقامی روایت یہ ہے کہ جب مینار بن کر تیار ہوگیا تو بادشاہ مینار کو دیکھنے کیلئے گیا۔ اُس وقت مینار کو بنانے والے معمار نے شیخی بگھارتے ہوئے کہا کہ وہ مینار کو موجودہ ہیئت سے کافی زیادہ اونچا بنا سکتا تھا۔

1۔ مینار کے داخلی راستے میں حالیہ دنوں تاروں کا جو ایک جالی دار دروازہ لگا گیا ہے، قدیم ساخت اور بناوٹ کے لئے یہ قطعاً نامناسب ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہاں ماضی میں قدیم طور طریقے کے مطابق ساگوان کی لکڑی کا دروازہ لگایا گیا تھا۔ اس کے علاوہ، مینار کے سب سے اونچے حجرہ کے نزدیک جو سلائیڈنگ دروازہ لگایا گیا ہے وہ بھی نہ صرف یہ کہ تاریخی معنویت کے اعتبار سے قابل اعتراض ہے بلکہ زائرین کیلئے خطرناک بھی ہے۔ (ایچ، ای، اسٹیپلٹن)

یہ سن کر بادشاہ نے اس سے پوچھا کہ: اگر تم اس سے زیادہ اونچا مینار بنا سکتے تھے تو پھر بنایا کیوں نہیں؟ معمار نے جواب دیا کہ: مجھے مناسب میٹریل نہیں مل پائے۔ بادشاہ نے اس جواب پر پوچھا کہ: اگر ایسا ہے تو تم نے مطلوبہ سامان کیوں نہیں مانگے؟ اب کی بار معمار سے کوئی جواب نہیں بن پایا۔ چنانچہ بادشاہ نے شدت غضب میں حکم دیا کہ معمار کو مینار کے اوپر سے نیچے پھینک دیا جائے۔ فوراً ہی حکم کی تعمیل کی گئی اور یوں اُس معمار کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔ مینار سے نیچے اترتے ہوئے بادشاہ نے اپنے پسندیدہ چپراسی ''ہنگا'' کو حکم دیا کہ وہ فوراً ہی ''مورگاؤں'' جائے۔ بادشاہ کا چہرہ اس قدر غضبناک تھا کہ ہنگا نے اپنے مورگاؤں سفر کی وجہ پوچھنے کی جرأت نہ کی۔ اب مورگاؤں پہنچ جانے کے بعد اس نے گہرائی کے ساتھ اس بات پر غور کرنا شروع کیا کہ آخر وہ مورگاؤں بھیجا کیوں گیا ہے؟؟ چنانچہ گہری سوچ میں ڈوبا ہوا اِدھر اُدھر ٹہلتے ہوئے اُس کی ملاقات ایک برہمن نوجوان سے ہوئی جس کا نام سناتن تھا۔ ہنگا نے اس لڑکے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ بادشاہ نے اسے یہاں بھیجا ہے لیکن مقصد کیا ہے؟ وہ نہیں جانتا، کیونکہ نہ تو بادشاہ نے اُسے بتایا ہے اور نہ ہی بادشاہ سے پوچھنے کی اُس کی جرأت ہوئی تھی۔ سناتن نے ہنگا سے وہ سب کچھ سنا جو شاہی بارگاہ سے اس کی روانگی سے پہلے رونما ہوا تھا اور پھر بلا تاخیر وہ اس نتیجے تک پہنچ گیا کہ، وہ حالات جن کے تحت ہنگا کو مورگاؤں بھیجنے کی ضرورت پیش آئی، ممکنہ طور پر بادشاہ کے ذہن میں یہ رہا ہوگا کہ وہ مورگاؤں کے ایسے تجربہ کار معماروں کو اپنے یہاں ملازم رکھے جو اُن خالی جگہوں کو پر کریں۔ سو اس اشارہ کے تحت ہنگا نے مورگاؤں سے کئی سارے معمار لئے اور بادشاہ کے سامنے حاضر ہوا۔ بادشاہ، جو اُس وقت تک پرسکون ہو چکا تھا، کو بہت حیرت ہوئی کہ آخر ہنگا اُس کا منشا کیسے سمجھ گیا جبکہ اُسے تو کچھ بتایا بھی نہیں گیا تھا؟ چنانچہ بادشاہ کی جانب سے یہ کہے جانے پر کہ وہ معاملے کی وضاحت کرے، ہنگا نے اس اشارہ کے بارے میں بتایا جو اسے سناتن سے ملا تھا، جس پر بادشاہ نے سناتن کی کافی ستائش کی اور اُسے گور کے دربار کا ایک منصب دار بنا دیا۔ ہنگا کے لائے ہوئے معماروں کی مدد سے بادشاہ نے مینار کو مزید ترقی دی۔ [1]

1۔ مورگاؤں مالدہ ریلوے اسٹیشن کے شمال مشرق میں تقریباً ایک میل کے فاصلے پر واقع ایک گاؤں ہے۔ سناتن کے نام اور ایک درباری عہدہ میں اس برہمن کی تقرری سے اس امکان کو جگہ ملتی ہے کہ یہ آدمی وہی تھا جو آگے چل کر حسین شاہ کا وزیر بنا۔ اگر ایسا ہے تو وہ سلطان یقینی طور پر سیف الدین فیروز ہی رہا ہوگا۔ مزید یہ کہ سیف الدین ہمزہ نے فقط ایک سال تک حکومت کی جبکہ فیروز نے تین سال تک حکومت کی ہے۔ یہ نام ''فیروز مینار'' بھی اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ مینار کا بانی سیف الدین فیروز ہی تھا۔ (ایچ۔ای۔اسٹیپلٹن)

﴿یادگارنمبر۴﴾ بائیس گزی دیواراورراجگان گورکاقدیمی دیوار

قلعے کے اندرونی حصے میں محل کی احاطہ بندی(اینٹوں سے بنی ایک اونچی دیوار جسے'بائیس گزی' کہتے ہیں) تاہنوزنمایاں طور پر دیکھی جاسکتی ہے۔اُس کی اونچائی ۲۲/ بنگالی گز یا۴۲/فٹ تھی۔یہ دیوار بنیاد میں ۱۵/فٹ چوڑی ہے جبکہ چوٹی تک پہنچتے پہنچتے یہ چوڑائی گھٹ کر۹/فٹ رہ جاتی ہے۔پوراا حاطہ طول میں شمال سے جنوب تک ۷۰۰/گز اورعرض میں ۲۵۰/گز سے لیکر۳۰۰/گز کے درمیان پیمائش کردہ ہے۔دیوار کی تصاویر،جنہیں گزشتہ صدی(اٹھارہویں صدی عیسوی) کی ساٹھ کی دہائی میں مسٹر جے،ایچ،رَوِنشاہ نے اتاری تھیں،گور پرلکھی اُس کی کتاب کے پلیٹ نمبر۱۰/ وا۱۱/میں دیکھی جاسکتی ہیں۔اُس وقت تو یہ دیوار گھنے جنگلات اور بڑے بڑے درختوں سے ڈھکی ہوئی تھی لیکن اب محکمہ تعمیرات عامہ(پی،ڈبلیو،ڈی) کی جانب سے وہ سارے جنگلات ہٹادیئے گئے ہیں۔یہ ایک اچھی بات ہوتی اگر دیوار کے بوسیدہ حصوں کی اساسیں نمایاں کردی جاتیں۔اس سے زائرین کو پوری عمارت کا آئیڈیامل جاتا۔

شاہی محل:

محل ،شاہی رہائش گاہ کے چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔مندرجہ ذیل کتبہ جسے فرینکلن نے''گوامالتی'' سے دریافت کیا تھا، سے پتہ چلتا ہے کہ ۸۷۱ھ ہجری(مطابق ۱۴۶۶ عیسوی) میں رکن الدین باربک شاہ نے محل، ساتھ ہی''نیم دروازہ'' کے نیچے سے ایک آبی گزرگاہ بنوائی تھی۔اِس سے کیونگھم نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ محل اورساتھ ہی داخل دروازہ دونوں باربک شاہ کے والدناصرالدین محمودشاہ ہی کے عہدحکومت میں مکمل ہوچکے تھے۔

الحمد لله ذی الآلاء و المنن	رب تنزه عن نوم وعن وسن
ثم الصلوٰة علی المختار من مضر	خير الانام النبی السيد المدن
محمد خاتم الرسل الكرام ومن	لولاه سبل الهدی والحق لم تبن
وآله معدن التقوی وصحبته	التابعی الله فی سر و علن
وبعد من اتی علی جوار رحمته	ازری بجود السجاب الهاطل الهتن
السلطان امان الدنيا وركن الدين	سلطاننا باربک شاه العالی الفطن
ابن السيد الذی شاع فی الامصار	سلطان محمود شاه العادل الحسن
هل سلطان العراقين فی كرم	كباربک شاه فی شام وفی اليمن

کلا فیا فی بلاد الله قط له	فی البذل و الجود هٰذا واحدالزمن
وداره کالجنان رائق نزه	ومجلب للغنی وقی من الشجن
نهر جری تحتها کاالسلسبیل	سبحالها فاز بالفقراء ذی المحن
وبابها راحة للروح ریحانًا	لذی محبته واحد کالشطن
باب علی الشط مشرح باسمه	"میانه در" وهی دخول خاص لبن
احد وسبعون سنة والثمانیة	وذاک مبناه زمان العیش فی الاون
فالله اسأله تخلید دولته	ماغرد الطیر فی روض علی الفنن

دردور سلطنت شاہ جہاں پناہ رکن الدنیا و الدین ابو المظفر سلطان باربک شاہ **خلد الله تعالی ملکه وسلطانه** بنای میانه در **سنة احدی و سبعون وثمان مأة** شد۔[1]

ترجمہ: تمام تعریفیں اس اللہ کیلئے جونعمتوں اورعنایتوں والا ہے، جورب نینداوراونگھ سے منزہ ہے۔۔۔۔۔رحمتیں نازل ہوں قبیلہ مضر کے مختار، نوع انسانی کے افضل نامدار، غیب کی خبریں بتانے والے مدنی سرداراوررسولان کرام کے آخری تاجدار محمد (ﷺ) پر، کہ اگر وہ نہ ہوتے تو سچائی اور ہدایت کی راہیں عیاں نہ ہوتیں۔۔۔۔۔اور (رحمتیں نازل ہوں) تقوی کے سرچشمے اُن کے اصحاب اوراولاد پر جوظاہر و باطن میں اللہ کے اطاعت شعار ہیں۔۔۔۔اوراس کے

(۱) المدنی (۲) سبیل (۳) صحبة (۴)اذرایٰ (۵) القنن (۶) فی مر کرم (۷) الشام فی الیمن (۸) مجلب الغنی و تدمن الشجن (۹) بالفقراء و المحن (۱۰) کالسطن (۱۱) اسال(۱۲) دولة.

1۔ یہ کتبہ مرحوم خان صاحب کے ذریعے شامل نہیں کیا گیا تھااور کتبے کی عبارت ،فرینکلن کی نقل کردہ غلط عبارت کی گروٹؔ کے ذریعے کی گئی ترمیمی کوششوں پر مشتمل ہے۔(ملاحظہ فرمائیں: گور، از: رَونشا۔ص: ۱۸، ۱۹) مذکورہ بالا الفاظ کی اصلاحات اور ترجمہ کی نظر ثانی کے لئے میں خان بہادر شمس العلماء ڈاکٹر ہدایت حسین کا منت کش ہوں۔کلام اب تک ناموزوں ہے اور یہ امید کی جاسکتی ہے کہ اگر کبھی وہ تختہ مل جائے جسے فرینکلن نے دریافت کیا تھا تو کلام کا فیصلہ کن مطالعہ ممکن ہوجائے گا۔(ایچ،ای،اسٹیپلٹن)

بعداس شخص پر جواس کی رحمت کے جوار میں آ گیا(اور) جس کی کریم النفسی اس بادل کی سخاوت جیسی ہے جو بے حدو حساب لگا تار بارش برسائے۔۔۔۔۔(یعنی) ہمارے سلطان، محافظِ دنیا، ستونِ دیں، عالی مرتبت، سلطان باربک شاہ پر، جوانصاف پروراور عالمی شہرت کے حامل رہبر سلطان محمود شاہ کے فرزند ہیں۔۔۔کیا دونوں عراق، شام اور یمن کے سلاطین کرم گستری میں باربک شاہ کی طرح ہوسکتے ہیں؟۔۔۔تو سنو، خدادادمما لک میں کوئی بھی کبھی بھی جودوسخا میں (سلطان باربک کی طرح) ہرگز بھی نہیں ہوسکتے، یہ یکتائے روزگار ہے۔۔۔اور، اس کا شاندار بے داغ گھر جنت کی طرح ہے، جہاں دولت کی ریل پیل ہے اوراس سے غمزدوں کی غمی دور کی جاتی ہے۔۔۔۔(وہ دیکھو) محل کے نیچے سے سلسبیل کی طرح ایک نہر جاری ہے جس کی دھارائیں آشفتہ حال فقیروں کی اشک شوئی کرتی ہیں۔۔۔۔اُس کے چاہنے والوں کے لئے وہ رسی کی طرح ایک ہے (یعنی، اُس کے چاہنے والوں کو کسی رسی کے ریشوں کی طرح وہ ایک ساتھ جوڑ کر رکھتا ہے) اوراس کا دروازہ روح کے لئے راحت اور ریحان ہے۔۔۔۔ایک دروازہ بنام ''میانہ در'' جو دھارے پر قائم ہے، اسم بامسمی ہے اور یہی دروازہ (شاہی محل کے) پرتکلف اندرونی حصے تک پہنچا تا ہے۔۔۔۸۷۱ھ (ہجری) اس کی تاریخ تعمیر ہے جوان ایام میں عیش وعشرت کا زمانہ ہے۔۔۔۔میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ جب تک باغات کی شاخوں پر پرندے چہچہاتے رہیں تب تک سلطان کی سلطنت قائم ودائم رہے۔

ترجمہ فارسی پیراگراف: جہاں پناہ، شاہ رکن الدنیا والدین ابوالمظفر سلطان باربک شاہ، اللہ اس کی مملکت اور حکومت کو ہمیشہ قائم رکھے، کے دورحکومت میں ۸۷۱ھ (مطابق ۱۴۶۶ء) میں نیم دروازہ کا قیام عمل میں آیا۔

محل تین حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ پہلا حصہ، جانب شمال، غالباً دربار منعقد کرنے کے لئے۔دوسرا حصہ بادشاہ کی نجی رہائش کیلئے، اور تیسرا حصہ حرم کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ ہر حصے میں ایک جداگانہ حوض تھا جن میں سے ایک حصہ کی پتھروں کے ذریعے فرش بندی کی گئی تھی۔اِس حقیقت کے پیش نظر کہ ''دربار کورٹ'' دیگر دوحصوں سے چھوٹا تھا، یہ بات عیاں ہے کہ دربار میں بہت ہی کم لوگ پہنچ پاتے تھے۔ یہاں مشرق سے مغرب کی طرف جاتی ہوئی دو دیواریں اور تھیں جومحل کے دوسرے کمروں کو تقسیم کرتی تھیں۔ ۱۸۰۱ء میں کریٹن کے ذریعے پیش کی گئی قلعے اور محل ،دونوں کے پلان کی ایک نقل رَونشا کی ''گور'' کے پلیٹ نمبر ۸ میں دیکھی جاسکتی ہے۔

﴿یادگار نمبر ۵﴾ خزانچی خانہ

محل کی احاطہ بندی کے شمالی حصے پر''دربار کورٹ'' کی مجوزہ شناخت کے سلسلے میں یہ بات بہرحال قابل ذکر ہے

کہ گور کے باشندے اس پلاٹ کو ''خزانچی'' کہتے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ ''خزانچی خانہ'' کی ایک بگڑی ہوئی (بلکہ آدھی) شکل ہے۔اس پلاٹ کے درمیانی حصے میں ایک بڑا سا تالاب ہے جس کی لمبائی ۳۱۵/فٹ اور چوڑائی ۲۳۵/فٹ ہے، مقامی باشندے اِسے ٹکسال دیگھی (غدیر الضرب) کہتے ہیں۔اس تالاب کے مغرب میں ۴۰/اسکوائر فٹ والی ایک چھوٹی سی یک قبہ عمارت کے آثار موجود ہیں۔مقامی مؤرخ منشی الٰہی بخش نے اپنی کتاب ''خورشید جہاں نما'' میں اس خیال کو ترجیح دی ہے کہ یہ پلاٹ محل سرا ہوا کرتا تھا اور وہ چھوٹا سا گھر حرم کے خواتین کا غسل خانہ تھا۔

﴿یادگار نمبر ۶﴾ مقبرہ حسین شاہ

(اس وقت موجود نہیں ہے، تقریباً ۱۸۴۶ء میں اسے مسمار کر دیا گیا۔تاریخ تعمیر ۱۵۱۹ء ہے)

محل کی احاطہ بندی کے باہر اور خزانچی خانہ کے شمال مشرق میں تقریباً ایک فرلانگ کی دوری پر ایک جگہ ہے جسے بنگلہ کوٹ کہتے ہیں۔یہ بنگلہ کوٹ گور کے مرحوم بادشاہوں کا قبرستان ہوا کرتا تھا۔اس کے جنوب مشرق میں املی کا ایک بڑا سا پیڑ موجود ہے اور اسی املی کے درخت کے جنوب میں تقریباً ۱۲/فٹ کے فاصلے پر دو پختہ قبریں ہوا کرتی تھیں جو اب ناپید ہو چکی ہیں۔قدم رسول کے خادم اور مادھیپور کے معمر لوگوں نے منشی الٰہی بخش کو بتایا تھا کہ یہ حسین شاہ اور اس کی بیوی کی قبریں تھیں مگر کریٹن کے زمانے میں دوسری قبر حسین شاہ کے بیٹے نصرت شاہ کی بتائی جاتی تھی۔سنگ سیاہ کا بڑا سا تابوتی تختہ، جس سے حسین شاہ کی قبر ڈھانپی گئی تھی، منشی الٰہی بخش نے کھاری گاؤں (؟ کھیرکی) کے نزدیک سے دریافت کیا تھا۔کہتے ہیں کہ ڈاکوؤں نے پوشیدہ خزانہ کی تلاش میں پتھر کو آگ سے جلا کر کافی ضرر پہنچایا تھا۔مقبرہ کے محل وقوع کے قریب ایک مربع احاطہ ہوا کرتا تھا جس کی دیواروں میں لگی اینٹیں گونا گوں رنگوں سے رنگی گئی تھیں۔

تفصیلات:

کریٹن نے اس مقبرہ کے دروازے کا ایک بہت ہی خوبصورت خاکہ بنایا ہے۔دروازہ سے متصل احاطہ بندی ۲۴/مربع فٹ پر مشتمل تھی۔لگ بھگ ۱۸۴۶عیسوی کے قریب یہ مقبرہ اور اس کے نزدیک بنی احاطہ بندی سب ڈھادی گئیں۔فرینکلن نے ۱۸۱۰ء میں مقبرہ کی تفصیلات اس طرح بتائی ہیں:

''آپ پتھروں سے بنے ایک حسین وجمیل محراب دار دروازہ کے ذریعے اندر داخل ہوتے ہیں۔دروازے کا اگلا حصہ اور اطراف نیلے اور سفید رنگوں کے ایک مخصوص نوع کی آمیزش سے بنی چینی ٹائیلوں کے ذریعے آراستہ کئے گئے ہیں جس سے ایک انوکھا نظارہ دیکھنے کو ملتا ہے۔چاروں گوشوں میں پتھروں پر گلاب کی بڑی بڑی تراشیں وضع کی گئی

ہیں۔ مینار یں، جن کی وجہ سے عمارت اندر سے کھوکھلی بن گئی ہے، پر اشتیاق بیل بوٹوں سے سجائے گئے ہیں۔ دروازہ کے اندر ایک بڑی سی چہار دیواری ہے جس میں حسین شاہ اور شاہی گھرانہ کے دیگر افراد کی لاشیں مدفوں ہیں۔ چہار دیواری کی سطحوں پر بھی نیلے اور سفید رنگوں کی آمیزش والی ٹائیلوں سے تہ چڑھائی گئی ہے''۔

کہتے ہیں کہ مقبرہ کے شمال میں تھوڑی ہی دوری پر ایک مسجد تھی اور اُس مسجد کے نزدیک بادشاہوں اور اُن کے رشتے داروں کی سو سے زائد قبریں موجود تھیں۔ ۹۲۵ھ (مطابق ۱۵۱۹ء) میں حسین شاہ نے وفات پائی۔

شاہان گور کے مقبروں کی روشنی کیلئے وقف شدہ املاک:

قبرستان، ساتھ ہی بانس کی جھاڑیاں اور ملحقہ پیڑ پودے وغیرہ لمبی مدت تک مادھیپور کے ایک باشندے میر ڈومن جو حسین شاہ کی نسل سے ہونے کے دعویدار ہیں، کے باپ داداؤں کے قبضے میں رہے۔ ۱۸۶۳ء میں ڈومن کے پوتے میر حانسہ کے پاس نواب معظم خان (میر جملہ) کا دستخط شدہ ایک وثیقہ موجود تھا، اور اس پر ۱۰۷۰ھ (مطابق ۱۶۵۹ء) کی تاریخ درج تھی جس کے مطابق بادشاہان گور کے مقبروں کی روشنی کے انتظامات کیلئے (شاہ) اورنگزیب کے حکم سے سید انبیاءؑ کو بنگلہ کوٹ گاؤں میں پچاس بیگھہ لگان معاف زمین دی گئی تھی۔ میر حانسہ نے آگے چل کر اس جائیداد کو مادھیپور ہی کے ایک باشندے سمیر کے پاس فروخت کر دیا مگر اس وقت سمیر کے وارثوں کے قبضے میں فقط ایک ملحقہ تالاب ہی رہ گیا ہے۔

تاریخی یادداشت:

کریٹن نے تاریخ نگار مسٹر آرم جس نے تقریباً ۱۷۶۶ء میں گور کا دورہ کیا تھا، کا ایک بیان یوں ریکارڈ کیا ہے کہ :قبروں سے متعلق کچھ پتھر ''فورٹ ولیم'' میں استعمال کرنے کیلئے ایڈمز نامی ایک کپتان نے بھی یہاں سے نکالے تھے، اور یہ کہ آرم نے وہ سارے پتھر ترسیل کے لئے تیار دریا کنارے پڑے ہوئے دیکھے۔ وہ کل پانچ سنگ سیاہ تھے۔ اُن میں اعلیٰ درجے کی صیقل گری کی گئی تھی۔ ہر پتھر لمبائی میں ۱۲ رفٹ اور چوڑائی و موٹائی میں ۲ رفٹ تھا، جس نے اقدامات کا ایک خاص حصہ تشکیل دیا۔

﴿یادگار نمبر ۷﴾ قدم رسول

(تاریخ تعمیر: ۹۳۷ھ مطابق ۱۵۳۱ء۔ نام بانی: سلطان نصرت شاہ)

یہ یادگار، ایک چوکور یک قبہ عمارت پر مشتمل ہے جو قلعے کی احاطہ بندی کے اندر ہی محل کے مشرق میں واقع ہے۔

اِس کی کل لمبائی ۶۳ رفٹ ۳ رانچ اور چوڑائی ۴۹ رفٹ ۱۰ رانچ ہے۔اصلی حجرہ ۲۵ رفٹ لمبا اور ۱۵ رفٹ چوڑا ہے،اور

﴿تصویر نمبر ۱۱﴾ عمارت قدم رسول اور مقبرہ فتح خان
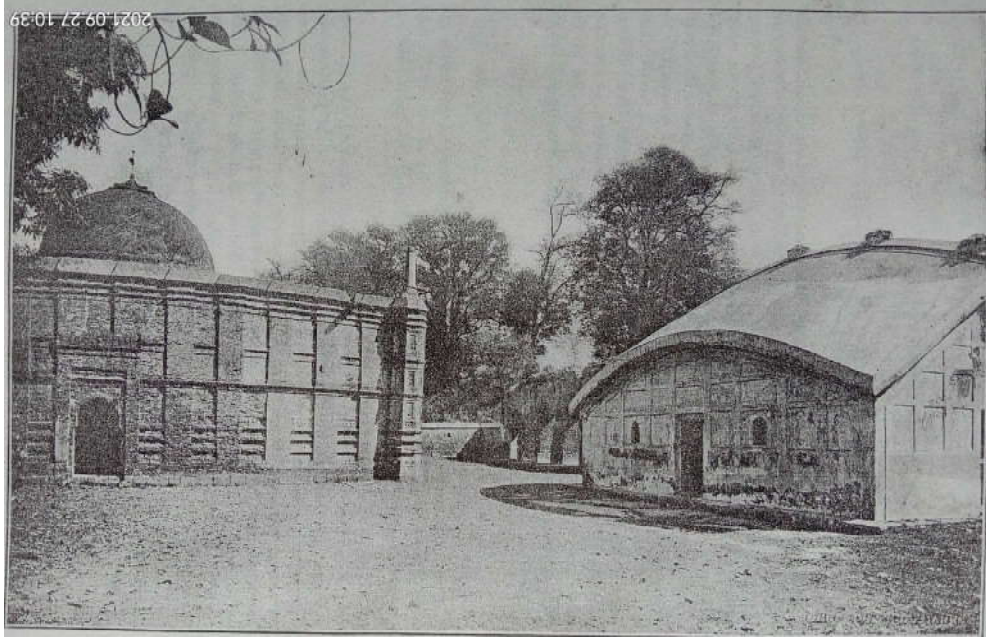
دیواریں ۵ رفٹ موٹی ہیں۔عمارت کے تین اطراف ۹ رفٹ کشادہ برآمدے ہیں۔

''کریٹن کے پلیٹ نمبر ۱۱ رمیں مسجد کا اگلا حصہ غلطی سے ایک سیدھے پشتے کے ساتھ پیش کیا گیا ہے جبکہ بنگالی طریق کار کے مطابق یہ پشتہ ذرا سا خمیدہ ہے۔رَوِنشا کے فوٹوگرافس کی پلیٹ نمبر ۱۳ رمیں اِسے دیکھا جاسکتا ہے۔ سامنے تین محراب دار دروازے ہیں جنہیں گراں بار سنگین ستونوں کے ذریعہ سہارا دیا گیا ہے۔دیواریں اینٹوں سے بنی ہیں اوراعلیٰ ترین طریقے پر مزین کی گئی ہیں۔سامنے کا سارا حصہ لکڑی کے آرائشی بیلوں کی مدد سے پینلوں میں تقسیم کیا گیا ہے، ہر گوشے میں ۱ رفٹ ۵ رانچ کا ایک ایک سجاوٹی برج ہے۔اس عمارت کے سر پر محض ایک ہی سنگین ستون یا مینار کا سہرا سجایا گیا ہے جس کا قطر فقط ۱ رفٹ ۵ رانچ ہے جو مینار کے ایک فیس کے برابر ہے'' (رپورٹ،از: کیوننگھم۔ ص: ۴۴، ۵۵)۔عمارت متأخر زمانہ اسلام کے طرز تعمیر کا نمونہ ہے۔یہ عمارت سلطان نصرت شاہ ابن سلطان حسین شاہ نے ۹۳۷ھ مطابق ۱۵۱۳ء میں بنوائی تھی،جیسا کہ دروازے کے اوپر تین سطروں میں موجود مندرجہ ذیل ''طغرا حروف'' سے عیاں ہے:

قال اللہ تعالی من جآء بالحسنة فله عشر امثالها— بنی هذا[1] الصفة المطهرةوحجرها التی فیه اثر قدم رسول الله صلی الله علیه وسلم السلطان المعظم المکرم سلطان بن السلطان ناصر الدنیا والدین ابوالمظفر نصرت شاہ السلطان بن حسین شاہ السلطان بن سید اشرف الحسینی خلد الله ملکه و سلطنته واعلی امره و شانه فی سنة سبع و ثلثین وتسعمأة۔

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جوایک نیکی کرے اس کے لئے اس جیسی دس نیکیاں ہیں۔ یہ مقدس سائبان اوراس کا کمرہ، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں کے نشان موجود ہیں، محترم ومکرم بادشاہ، سلطان ابن سلطان، ناصر الدنیا والدین، ابوالمظفر سلطان نصرت شاہ ابن سلطان حسین شاہ ابن سید اشرف الحسینی، اللہ اس کی مملکت و سلطنت کو ہمیشہ قائم رکھے اوراس کی شان وحال کو بلند فرمائے، نے ۹۳۷ھ (مطابق ۱۵۳۱ء) میں بنایا۔

ایک دوسرا کتبہ جو پڑھے جانے کے قابل نہیں تھا، بلوچ مین نے کہیں سے دریافت کیا اورآگے چل کرمنشی الٰہی بخش نے اُسے حل کیا۔ چنانچہ الٰہی بخش نے (کتبے کے طغراالفاظ کو) یوں نقل کیا ہے:

قال النبی علیه السلام من بنی مسجدًا لله بنی الله تعالی له سبعین قصرًا فی الجنة. بنی هذا المسجد فی عهد سلطان بن سلطان بن السلطان شمس الدنیا والدین ابو المظفر یوسف شاہ

1۔ یہاں مشارالیہ ''الصفة'' اسم مؤنث ہے، بنابریں اس کی صفت'' المطهرة'' بھی مؤنث ہی لائی گئی ہے، تو اب اصولی طور پر وجوبًا اس کا اسم اشارہ بھی مؤنث ہی آئیگا۔ سو'' هٰذا الصفة ''نہیں،''هٰذه الصفة' 'ہونا چاہئے۔ لگتا ہے کہ کتبہ سے طغراالفاظ کونقل کرنے میں ناقل سے خطا ہوئی ہے۔۔۔۔بعینہ یہی حال لفظ'' الحجر '' کا بھی ہے، ظاہر ہے کہ لفظ'' الحجر '' سے گھر مکان کی تعمیر کے کچھ اسباب تو متصور ہوسکتے ہیں لیکن باقاعدہ ایک گھر، مکان یا کمرہ متصور نہیں ہوسکتا، اس لئے یہ لفظ'' الحجر ''نہیں بلکہ'' الحجرة'' ہونا چاہئے۔ دوسری بات'' الحجر '' کے بعد جوصلہ'' التی ''لایا گیا ہے وہ بھی صیغہ مؤنث ہے تواب بروجہ تانیث اس ''صلہ'' کا تقاضہ یہ ہے کہ ماقبل میں اس کا جوبھی ''موصول'' ہووہ بہرحال صیغہ مؤنث ہی ہونا چاہئے، اورظاہر ہے کہ یہاں موصول کے طور پر'' الحجر ''تو خود کو پیش نہیں کرسکتے کیونکہ یہ ''جناب'' تو مذکر ہیں، اور درکار ہے مؤنث کی۔۔۔تو لامحالہ ماننا پڑیگا کہ یہاں بھی ناقل سے خطا ہوئی ہے اوراصلی موصول'' الحجر ''نہیں بلکہ'' الحجرة'' ہے جونحوی ضابطوں کے مطابق بھی ہے اور موقع محل کے مناسب بھی۔ (میزان)

السلطان بن باربکشاہ السلطان بن محمود شاہ السلطان. بنی ھذا المسجد خان اعظم و خاقان معظم مرصاد خان اتابک رایٰت اعلی بتاریخ ھژدھم ماہ مبارك رمضان سنة خمس و ثمانین و ثمانمأة.

ترجمہ: نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: جوکوئی اللہ (کی رضا) کے لئے ایک مسجد تعمیر کرے، اللہ اس کے لئے جنت میں ستر محل تعمیر کرے گا۔ یہ مسجد سلطان ابن سلطان ابن سلطان، شمس الدنیا والدین، ابوالمظفر سلطان یوسف شاہ ابن سلطان باربک شاہ ابن سلطان محمود شاہ کے عہد میں تعمیر کی گئی۔۔۔خان اعظم و خاقان اعظم مرصا دخان اتا بک رایات اعلی نے ۱۸؍رمضان المبارک ۸۸۵ھ (مطابق ۱۴۸۰ء) میں اس مسجد کی تعمیر کرائی۔

یہ کتبہ جواب چہار دیواری کے دروازے کے داخلی حصے میں اندر کی طرف داخل ہوتے وقت بائیں جانب لگا ہوا ہے، اغلب طور پر قدم رسول سے نہیں بلکہ ''تانتی پارہ مسجد'' سے تعلق رکھتا ہے۔ ایسی صورت میں (یہ بھی ماننا پڑیگا کہ کتبے پر کندہ شدہ) تاریخ تعمیر آخر الذکر عمارت کی ہے۔[1]

1۔فرینکلن نے اِس عمارت کی گزرگاہ کے بالائی حصے سے منسوب کرتے ہوئے ایک دوسرے کتبے کے بارے میں کہا ہے کہ اُسے یہ کتبہ ۱۸۱۰ء میں زمین پر پڑا ہوا ملا تھا۔ یہ کتبہ بعینہ اُن کتبات میں سے ایک کی طرح ہے جو دفتر کلکٹر، رنگ پور میں موجود ایک انتہائی قدیم اور بوسیدہ وثیقہ سے گور کی سرگزشت میں شامل کیا گیا ہے، اور جوای، جی، گلیزیَر کے ''رپورٹ آن ڈسٹرکٹ آف مالدہ''، مطبوعہ در کلکتہ، سن طباعت: ۱۸۷۳ء کے صفحہ نمبر ۱۰۷ تا ۱۱۰؍ میں شائع ہو چکا ہے۔ کتبے کے حروف اس طرح ہیں: **بنی ھٰذا الباب فی عھد السلطان العالم العادل سید السادات منبع السعادات خلیفة الله بالحجة و البرھان غوث الاسلام و المسلمین علاء الدنیا و الدین ابو المظفر حسین شاہ السلطان بن سید اشرف الحسینی خلد الله ملکه و سلطانه فی الثانی و العشرین من شھر محرم سنة تسع و تسعمأة۔**

ترجمہ: دانشور اور انصاف ور بادشاہ، سرداروں کے سردار، اقبال مندیوں کے سرچشمے، قوی دلیل اور پختہ ثبوت کے ذریعے نائبِ خدا، غوث الاسلام والمسلمین، علاء الدنیا والدین، ابوالمظفر سلطان حسین شاہ ابن سید اشرف الحسینی، اللہ اُس کی مملکت اور حکومت کو ہمیشہ قائم رکھے، کے عہد میں ۲۲؍محرم ۹۰۹ ہجری (مطابق ۱۵۰۳ء) میں یہ دروازہ تعمیر کیا گیا۔

نقش کف پائے رسول:

عمارت کے اندر گنبد کے نیچے سیاہ سنگ مرمر کی ایک چھوٹی سی منقش چوکی ہے جس میں حضرت محمد (صلی اللہ تعالی علیہ وسلم) کے نقش پا کی طرف منسوب ایک سنگین تصویر رکھی ہوئی ہے۔ یہ (نقش مبارک) پہلے پنڈوہ میں شاہ جلال الدین تبریزی کے چلہ خانہ کے اندر رکھا ہوا تھا، بعد میں حسین شاہ نے چار پاؤں والے ایک خوبصورت چوبی صندوق، جسے سونے چاندی سے مرصع کیا گیا تھا، میں رکھ کر اُسے گور میں منتقل کر دیا۔ یہ (نقش مبارک) تا ہنوز (پنڈوہ میں حضرت شاہ جلال الدین تبریزی علیہ الرحمۃ کی چلہ کشی والی) عمارت کے اندر محفوظ ہے۔ نواب سراج الدولہ کی حکومت کے دوران یہ نقش کف پائے رسالت مآب (صلی اللہ تعالی علیہ وآلہ وسلم) مرشد آباد بھی لیجایا گیا مگر میر جعفر نے اسے اس کی اصلی جگہ پر پہنچا دیا۔ اب یہ نقش مادھی پور کے رہنے والے زینت ملّا اور فراز ملّا نامی دو بھائیوں کی تحویل میں ہے۔ وہ لوگ اس نقش کو حفاظت کیلئے اپنے گھر میں رکھتے ہیں،[1] جب کبھی کوئی زائر آتا ہے کہ تو وہ لوگ اس نقش کو عمارت کے اندر اس کی اصلی جگہ پر رکھ دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ ایک بار اس "نقش پا" کی چوری ہو گئی تھی مگر بعد میں پولس نے اسے ڈھونڈ نکالا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ یہ نقش کف پائے رسالت مآب (صلی اللہ علیہ وسلم) سب سے پہلے مخدوم جہانیاں جہاں گشت

کیا نصرت شاہ نے محض قدم رسول کے پہلے سے موجود تبرکات خانہ کی دوبارہ تعمیر کرائی تھی؟ یا مشہور مقبرۂ فتح خان کی بھی؟ جو ہمارے مصنف کی رائے کے مطابق اورنگزیب کے زمانہ سے بھی کافی قدیم ہے۔ ایسے کسی سوال پر، جو برمحل کہیں بھی اٹھایا جاسکتا ہے، (کے جواب میں مندرجات کتبہ کے مطابق کہا جائیگا کہ) حسین شاہ نے یقیناً ایسی کسی عمارت کے دروازے کی تعمیر نہیں کرائی ہے کہ جو آنے والے وقت میں ۲۸ رسال بعد بھی تعمیر نہ ہو پائی تھی۔ کیپٹن ایڈمز کے ذریعے حسین شاہ اور نصرت شاہ کے مقبروں کی مسماری کے بارے میں کریٹن کے ذریعے پیش کی گئی آرم کی رپورٹ کے ساتھ رنگ پور دستاویز کے کلی طور پر میل کھانے کی وجہ سے اغلب طور پر ایسا لگتا ہے کہ رَنگ پور دستاویز (دراصل) ۱۷۶۶ء میں آرم کے دورۂ گور کی تفصیلات ہی کی نقل تھی۔ (یہ بات جو میں نے بعد میں نوٹس کی، مسٹر بیوریج نے بھی گور پر میجر فرینکلن کے تیار کردہ رپورٹ کی توضیح کرتے ہوئے کہی ہے)۔ ایچ، ای، اسٹیپلٹن

1۔ شاید خان صاحب کے زمانے میں یہ نقش کف پائے مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حفاظت کی نیت سے کسی گھر میں رکھا جاتا رہا ہو لیکن اب تو تبرکات خانہ ہی کے اندر رکھا جاتا ہے۔ (میزان)

نامی ایک بزرگ عرب سے یہاں لیکر آئے تھے، وہ اپنے ساتھ ایک جھنڈا بھی لائے تھے جو اب تک پنڈوہ میں حضرت شاہ جلال (تبریزی علیہ الرحمہ) کے تبرکات خانہ کے اندر محفوظ ہے۔

آثار یاتی نوٹ:

قدم رسول عمارت کے کونوں والے گنبدوں کی چوٹیوں پر جو دیدہ زیب سنگین حروف (مرقوم) ہیں وہ بہت ہی اچھی ڈیزائن کے ہیں، گوروپنڈوہ کی دیگر عمارتوں میں اس طرح کا ورک نظر نہیں آتا۔

آرام گھر:

قدم رسول کے سامنے ایک بغیر چھت کی عمارت ہے جو شاید زائرین کے لئے 'آرام گھر' ہوا کرتی تھی۔ طرز تعمیر مغل عہد حکمرانی کی ہے اور یہ عمارت ممکنہ طور پر شاہ شجاع کی تعمیر کردہ ہے۔ عمارت کی دیواریں بہت موٹی ہیں اور یہ عمارت کبھی ایک مسطح چھت کے ذریعہ ڈھکی ہوئی تھی۔ عمارت میں تین کمرے ہیں۔ وسطی کمرہ ایک بڑا ہال ہے جبکہ بازو کے دونوں کمرے پیمائش کے اعتبار سے (نسبتاً) چھوٹے ہیں۔ ہر کمرہ کے مغربی حصے میں ایک ایک محراب دار دروازہ بنا ہوا ہے۔

قبرستان:

''قدم رسول'' کے مغربی حصے میں ایک عمارت، چھت اور کچھ ایسی دیواروں کے باقی ماندہ آثار موجود ہیں جو اب منہدم ہو چکی ہیں۔ عمارت کے اندر کچھ قبریں شکستہ حالت میں موجود ہیں۔ ممکنہ طور پر یہ قبریں شہزادوں اور حسین شاہ اور نصرت شاہ کے اونچے عہدے داروں کی ہیں، یہاں تک کہ قدم رسول عمارت کے اندر بنا ہوا اونچا پلیٹ فارم، جس پر رسول (اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کا 'نقش کفِ پا' رکھا ہوا ہے، کچھ لوگوں کے مطابق وہ خود نصرت شاہ کی قبر ہے جس کی موت ۱۵۳۲ء (مطابق ۹۳۸ھ) میں واقع ہوئی تھی۔ تاہم غالب گمان یہ ہے کہ حسین شاہ کو اس کے والد کے نزدیک بنگلہ کوٹ میں دفنایا گیا تھا۔ یہاں عمارت کی احاطہ بندی کے اندر اور بھی کچھ دوسرے لوگوں کی قبریں موجود ہیں۔

جلالی تالاب:

قدم رسول عمارت کے مغرب میں شمال جنوب سمتوں میں بہنے والا ایک تالاب موجود ہے جو ''جلالی دیگھی'' کے نام سے معروف ہے۔ کہانی اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ اِس تالاب کو سلطان جلال الدین (جادو، ۱۴۱۸ء۔ ۱۴۳۱ء) نے کھدوایا تھا۔

مقبرہ فتح خان:

یہ عمارت قدم رسول کی احاطہ بندی کے اندر موجود ہے اور عمارت کی شکل وصورت گھاس پھونس کے کسی سائبان کی طرح ہموار ہے۔[1] فتح خان دلیر خان کا بیٹا تھا۔ دلیر خان کے بارے میں ایک روایت مندرجہ ذیل ہے:

شہنشاہ اورنگزیب نے، اپنے اِس شک کی بنیاد پر کہ مقامی بزرگ شاہ نعمت اللہ سلطان شجاع کو اُس کے خلاف جنگ آزمائی کا مشورہ دے رہے تھے، دلیر خان نامی اپنے ایک اہلکار کو (اِس حکم کے ساتھ) گور بھیجا کہ وہ ان کا سر دھڑ سے جدا کر دے، لیکن شیخ نے (فی الواقع) نہ تو ایسا کوئی مشورہ دیا تھا اور نہ ہی کبھی ایسا کوئی ارادہ رکھتے تھے۔ چنانچہ جب دلیر خان اپنے دونوں بیٹوں کے ساتھ گور پہنچا تو اس کا ایک بیٹا فتح خان خون کی الٹی کرنے لگا اور پھر اسی وقت اس کی موت واقع ہوگئی، اس واقعہ سے دلیر خان کو اتنی دہشت ہوئی کہ اُس نے شیخ کے سامنے محض آداب ہی بجالائے۔ جب اورنگزیب کو پورے معاملے کی اطلاع ملی تو شہنشاہ (بھی) اس کے بعد سے شیخ پر بھروسہ کرنے لگے۔

﴿یادگار نمبر ۸﴾ چیکا مسجد

قدم رسول کے جنوب مشرق میں تھوڑے ہی فاصلے پر ایک واحد گنبد والی عمارت ہے جسے مقامی لوگ ''چیکا مسجد'' یعنی چمگادڑ مسجد کہتے ہیں۔ دراصل یہ عمارت، مرمت کئے جانے سے پہلے، ان گنت چمگادڑوں سے بھری ہوئی تھی اور اندر سے آتی چمگادڑوں کی بدبو کی وجہ سے کوئی بھی شخص بہت مشکل ہی سے دروازے کے قریب جاسکتا تھا۔ دروازوں

1۔ حجرہ ۲۳رفٹ ۹رانچ لمبا اور ۱۳رفٹ چوڑا ہے اور عمارت کی بیرونی پیمائش ۳۰رفٹ ۸رانچ لمبی اور ۲۱رفٹ ۵رانچ چوڑی ہے۔ مصنف کا خیال ہے کہ عمارت ہندو راجاؤں (ممکنہ طور پر راجہ کانس) کے عہد کی ہے اور یہ کہ عمارت ایک مندر کے طور پر استعمال کی جاتی تھی، چھت کے درمیانی حصے میں ایک آہنی کیل کے ساتھ ایک زنجیر اور گھنٹی (باندھنے) کا انتظام اب بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ عمارت شمال وجنوب جہتوں میں پھیلی ہوئی ہے اور عمارت کے تین اطراف دروازے بنے ہوئے ہیں۔ اِن تمام حقائق سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ یہاں کسی ہندو دیوتا کی پوجا کی جاتی تھی۔۔۔ اورنگزیب اور شجاع کے ذکر سے اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ فتح خان کی تاریخ وفات ۱۶۵۷ء اور ۱۶۶۰ء کے بیچ رہی ہوگی۔ دلیر خان امکانی طور پر آگے چل کر ۱۶۶۲ء اور ۱۶۶۳ء کو آسام میں آخر الذکر کی چڑھائی کے وقت میر جملہ کا چیف جنرل بن گیا۔(Vide Blochmann,Koch Bihar and Asam 1872, J.A.S.B., PP.68-96) ایچ، ای، اسٹیپلٹن۔

پر اب تاروں کے جالی دار فریم مہیا کر دیئے گئے ہیں اور اندر چمگادڑوں کی پناگاہیں بھی نہیں رہی ہیں۔(فی الواقع یہ) عمارت کوئی مسجد نہیں ہے کیونکہ عمارت کے اندر نہ تو کہیں کوئی ممبر موجود ہے اور نہ ہی مغربی دیوار میں مسجدوں والے جھروکے پائے جاتے ہیں۔دروازوں اور سردلوں کے پتھروں پر مسخ شدہ حالت میں ہندوانہ مورتیاں نظر آتی ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عمارت کی تعمیر میں کچھ ہندومندروں کے قدیمی مواد اور مسالے استعمال کئے گئے ہیں۔جنرل کیوننگھم نے یوں تبصرہ کیا ہے کہ: یہ عمارت بڑی حد تک پنڈوہ کے''اِک لاکھی''مقبرہ سے مشابہت رکھتی ہے۔دونوں چوکور ہیں،ساتھ ہی دونوں عمارتوں کے کونوں میں مینارے بنے ہیں اور خمیدہ فصیلیں موجود ہیں۔ہر دو عمارت ایک اکیلے گنبد سے ڈھکی ہوئی ہے اور ہر ایک کے چار دروازے ہیں''۔مندرجہ ذیل خاکہ کی مدد سے دونوں عمارتوں کے طول وعرض کا موازنہ کیا جاسکتا ہے:

﴿اِک لاکھی مقبرہ﴾ اندرونی وسعت: ۴۸رفٹ ۶رانچ طول۔۴۸رفٹ ۶رانچ عرض۔۔ **دیواریں:** ۱۳رفٹ موٹی۔۔ **بیرونی وسعت:** ۷۴رفٹ ۶رانچ طول۔۷۴رفٹ ۶رانچ عرض۔

﴿چیکا مسجد﴾ اندرونی وسعت: ۴۲رفٹ طول۔۴۲رفٹ عرض۔۔۔ **دیواریں:** ۱۴رفٹ ساڑھے ۹رانچ موٹی۔۔۔ **بیرونی وسعت:** ۷۱رفٹ ۶رانچ طول۔۷۱رفٹ ۶رانچ عرض۔

سائز اور طرز میں اِن مماثلتی نکات کی وجہ سے جنرل کیوننگھم کا خیالِ غالب ہے کہ یہ عمارت محموداول، جلال الدین (جادو) کے بیٹے احمد شاہ اور اس کے وارثوں کا مقبرہ ہے،مگر (جنرل کیوننگھم کا نظریہ تسلیم کرنے کی صورت میں) یہ بات بڑی مشکل کے ساتھ ممکن ہوسکتی ہے کہ ان سب کی قبروں کے تمام نشانات مٹ جائیں۔مقامی لوگوں کی روایت یہ ہے کہ حسین شاہ ریاستی قیدیوں کیلئے اس عمارت کا استعمال کرتا تھا اور اس نے اپنے وزیر سناتن کو اسی کے اندر قید کر رکھا تھا۔یہ روایتیں جنرل کیوننگھم کے نظریہ کو ناقابل تسلیم قرار دیتی ہیں۔

چہار طرف کارنسوں اور کونوں میں موجود ستونوں میں متعدد رنگوں کے چمکدار ٹائلز لگائے گئے ہیں۔فرش پر جمع شدہ چمگادڑوں کی بیٹ،جو قرب وجوار میں شہتوت کی شجرکاری میں کھاد کے طور پر استعمال کی جاتی ہے،کو حاصل کرنے کیلئے کی گئی کھدائی کے ذریعہ عمارت کا فرش تباہ کر دیا گیا تھا۔کھدائی کا یہ عمل اب روک دیا گیا ہے اور فرش بھی ہموار کر دیا گیا ہے،مغربی دیوار کے ٹوٹے ہوئے حصے بحال کر دیئے گئے ہیں اور گنبد کو پن روک (واٹر ٹائٹ) بنا دیا گیا ہے۔

دفتری عمارت کے باقی ماندہ آثار:

اسی عمارت سے متصل جانب مغرب ایک اور کافی بڑی عمارت بھی تھی۔ اِس عمارت کی چھت تو منہدم ہو چکی ہے مگر گنبد اور عمارت کے درمیانی حصوں کو سہارا دینے والے سنگین ستون اب دوبارہ اُن کی جگہ پر نصب کر دیئے گئے ہیں۔ جائے وقوع کی جانچ سے پتہ چلتا ہے کہ مغربی حصے میں اور بھی دیگر عمارتیں تھیں۔ مقامی لوگوں کا کہنا ہے کہ یہاں پر سرکاری دفاتر واقع ہوا کرتے تھے۔

﴿یادگار نمبر ۹﴾ گومتی گیٹ

چیکا مسجد سے تھوڑی ہی دوری پر مشرق میں اور لُوکا چوری گیٹ (اگلی فصل میں ملاحظہ فرمائیں) کے جنوب میں ایک چھوٹی سی واحد قبہ عمارت موجود ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ قلعے کا شرقی دروازہ ہوا کرتا تھا۔ عمارت کے شمالی اور جنوبی کناروں کے ساتھ شہر پناہ کی دیواریں اب تک متصل دیکھی جاسکتی ہیں۔ کمرے کا اندرونی حصہ ۲۵/مربع فٹ وسیع ہے جبکہ دیواریں ۸/فٹ ۸/انچ موٹی ہیں۔ چار محرابدار دروازے ہیں۔ ہر دروازہ ۵/فٹ کشادہ ہے۔ عمارت کا بیرونی طول وعرض ۴۲/فٹ ۸/انچ اور ۴۲/فٹ ۸/انچ ہے اور چہار گوشوں میں چار دیدہ زیب ستون موجود ہیں۔ عمارت کا کتبہ تو ندارد ہے تاہم ممکنہ طور پر یہ حسین شاہ کا کارنامہ ہے کیونکہ ریکارڈ کے مطابق ۹۱۸ھ (مطابق ۱۵۱۲ء) میں اس نے قلعے کا ایک دروازہ تعمیر کرایا تھا۔ دروازے پر موجود یہ کتبہ اب شاہ نعمت اللہ، فیروز پور کے آستانہ میں دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ کتبہ جو۔ اے۔ ایس، بنگال، ۱۸۷۳ء، ص: ۲۹۵/ میں شائع ہو چکا ہے، یہاں ترجمہ کے ساتھ پیش کیا جارہا ہے: **بنی هذا الباب للحصن فی عهد السلطان المعظم المکرم علاو ألدنیا و الدین ابو المظفر حسین شاه السلطان بن سید اشرف الحسینی خلد الله ملکه و سلطانه فی سنة ثمان عشر وتسع مأة۔**

ترجمہ: قلعے کا یہ دروازہ عزت واحترام والے بادشاہ، علاء الدنیا والدین، ابوالمظفر، سلطان حسین شاہ ابن سید اشرف الحسینی، اللہ اس کی حکومت اور مملکت کو ہمیشہ قائم رکھے، کے عہد میں ۹۱۸ھ (مطابق ۱۵۱۲ء) میں تعمیر کیا گیا۔

منار یں:

کونوں میں واقع ستونوں کی زینت وزیبائش بڑی حد تک لٹّن مسجد (یادگار نمبر ۱۳/ میں ملاحظہ فرمائیں) کے

ستونوں کے ساتھ،مثلاً مینا کاری کی ہوئی متعدد قسم کی رنگ برنگی اینٹوں سے میل کھاتی ہے۔ستونوں کے زیریں حصے زمانہ ماضی میں ملبے کے اندر گاڑے گئے تھےلیکن اب ملبے ہٹ گئے ہیں۔دروازہ کے سامنے پتھروں سے بنی ایک پکی سڑک ہوا کرتی تھی۔دروازہ کے دونوں اطراف مشرق ومغرب میں اینٹوں کی مدد سےشکن دار خانے بنائے گئے ہیں اورعمارت چہار جانب آرائشی لکیروں کے ذریعے آراستہ کی گئی ہے۔قلعے کے اندر جانے کا یہ ایک چھوٹا سا دروازہ تھااوراسی دروازے کےقریب کچھ ایسے نشانات موجود ہیں جوممکنہ طور پرمحافظ کمرہ ہوا کرتا تھا۔اگر اِس مقامی روایت میں ذرا بھی سچائی ہے کہ مشہور چیکا مسجد ایک قید خانہ ہوا کرتی تھی تو گومتی ممکنہ طور پرجیل کی احاطہ بندی کا دروازہ رہا ہوگا۔[1]

﴿یادگار نمبر۱۰﴾ لُوکاچوری یا قلعے کامشرقی دروازہ

قدم رسول کے جنوب مشرق میں واقع یہ ایک بڑا ساسہ منزلہ دروازہ ہےاور خیال کیا جاتا ہے کہ قلعے کے اندرشاہی

﴿تصویر نمبر۱۲﴾ قلعے کا مشرقی دروازہ،گور
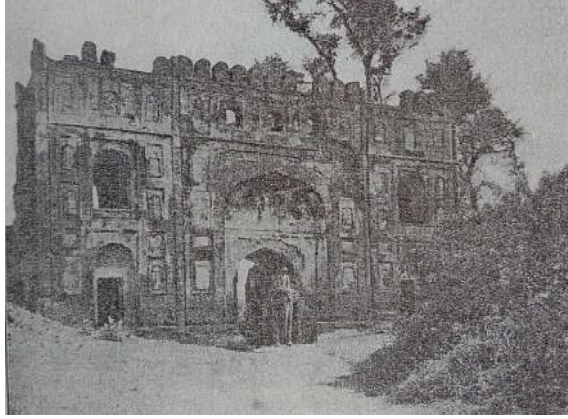
آمدورفت کادروازہ یہی ہوا کرتا تھا۔اِس دروازہ کے ہرطرف محافظ کمرے موجود ہیں اوران کمروں کےاوپر ایک نقار

1۔حالیہ دنوں۔۔ ۱۹۳۰ء میں۔۔گومتی گیٹ کوایک میوزیم میں تبدیل کر دیا گیا ہے جہاں پر دیگر نمائشوں کے درمیان نصرت شاہ کا کتبہ مؤرخہ ۹۲۶ھ بھی محفوظ ہے جوتعمیر دروازہ کی یاد دلاتا ہے۔وہ کتبہ (اصل انگریزی متن کے)صفحہ نمبر ۱۵۱رمیں پہلے ہی پیش کر دیا گیا ہے۔اوراس ترجمہ کے اندر’’قرب وجوار سے دریافت شدہ ایک کتبہ پر نوٹ‘‘ کے زیرِعنوان آپ اُس کتبے کوملاحظہ فرما چکے ہیں۔اسٹیپلٹن

خانہ ہے جس کی چھت اینٹوں کی مدد سے مکمل طور پر ہموار بنائی گئی ہے۔۔ دروازہ ۶۵ رفٹ لمبا اور ۴۲ رفٹ ۴ رانچ چوڑا ہے اور اصلی گزرگاہ صرف ۱۰ رفٹ کشادہ ہے۔ طرزِ تعمیر مغل حکومت کے عہد اخیر کی ہے اور دیگر عمارتوں کی تعمیراتی ساخت سے بڑی حد تک مختلف ہے۔ کہتے ہیں کہ شاہ شجاع نے لگ بھگ ۱۶۵۵ء میں شہر گور کو، لمبے عرصے تک ویران رہنے کے بعد، جب دوبارہ آباد کرنے کی کوشش کی تو اِس دروازے کی تعمیر کرائی۔ جنرل کیوننگھم نے اِس دروازہ کو گومتی گیٹ کے ساتھ گڈ مڈ کر دیا ہے۔

لوکاچوری نام کا ماخذ:

لوکاچوری (چھپو اور تلاش کرو) ایک قسم کا کھیل ہے جسے ''چھپا چھپی'' بھی کہتے ہیں۔ یہ نام اغلب طور پر مقامی لوگوں کی طرف سے دیا گیا ہے جب وہ دور مابعد میں گور کے قرب و جوار میں آباد ہوئے، مگر دروازے کے ساتھ اس نام کا تعلق کیا ہے؟ یہ پتہ نہیں چلتا۔ دروازہ کا اصلی نام ''شاہی دروازہ'' رہا ہوگا کیونکہ روایت یہ ہے کہ شاہ شجاع جب قلعے میں داخل ہوتا تو اسی دروازے کا استعمال کرتا، اور اسی مقصد ہی سے اُس نے یہ دروازہ تعمیر کرایا تھا۔

﴿یادگار نمبر ۱۱﴾ چام کٹّی مسجد

یہ مسجد، لُوکاچوری گیٹ کے مشرق اور موجودہ نواب گنج روڈ کے مغربی حصے میں واقع ہے۔ اس قدیم عمارت کے بالائی حصے پر باہر کی جانب میناکاری کی ہوئی رنگ برنگی آرائشی اینٹیں موجود ہیں۔ اُس کے نام کو دیکھتے ہوئے ایسا لگتا ہے کہ یہ مسجد ایک خاص مسلم طبقہ 'چام کٹّی' جو تاہنوز اولڈ مالدہ کے قریب چالیسا پارہ میں رہائش پذیر ہیں، کی جانب سے تعمیر کی گئی ہے۔ کریٹن کے مطابق یہ ایسے جاں نثار قسم کے لوگ تھے کہ مذہبی جنون میں چاقوؤں سے خود کو زخمی کر لیا کرتے اور اسی وجہ سے چام کٹّی (چمڑا کاٹنے والے) کہلاتے تھے۔

عمارت اگرچہ موسمیاتی مار کی وجہ سے کافی زیادہ متاثر ہو چکی ہے مگر شروع میں یہ عمارت کافی زیادہ خوبصورت اور نفیس ڈھانچے کی رہی ہوگی۔ برآمدہ کی چھت ایک خاص قسم کی محرابی عمارت کے رنگ ڈھنگ کی عکاس ہے اور مرکزی چیمبر میں محرابوں کے درمیان میناکاری کئے ہوئے بڑے بڑے تمغے اب تک محفوظ ہیں۔ حالیہ دنوں عمارت کے گنبد کی مرمت کر دی گئی ہے اور اسے پن روک بنا دیا گیا ہے۔

جنرل کیوننگھم کی تصریحات:

''عمارت ایک 'اکیلے کمرے' پر مشتمل ہے جو ۲۳ راسکوائر فٹ ۸ رانچ وسیع ہے، ساتھ ہی داخلی جانب یا مشرق میں

ایک برآمدہ ہے جو ۹ رفٹ ۱۱ رانچ کشادہ ہے اور ہر ایک کونہ میں ایک ہشت پہلو مینار ہے، دیواریں اینٹوں سے بنی ہیں۔ پوری عمارت ۵۰ رفٹ ۴ رانچ لمبی اور ۳۳ رفٹ ۸ رانچ چوڑی ہے۔

سامنے تین دروازے ہیں اور برآمدہ کے ہر ایک سرے پر ایک دروازہ ہے۔ مرکزی حجرے میں سمت مغرب کو چھوڑ کر ہر ایک سمت تین تین دروازے ہیں جہاں مروجہ محرابیں بنائی گئی ہیں۔ منڈیروں کے خطوط بنگالی طرز کے مطابق ہلکے سے خمیدہ ہیں اور مکمل عمارت ایک مجرد گنبد سے ڈھکی ہوئی ہے۔ عمارت کا کتبہ گم شدہ ہے تاہم جس پینل میں کتبہ کا تختہ نصب کیا گیا تھا وہ ۴ رفٹ ۶ رانچ کشادہ ہے، ممکن ہے کہ یہ پیمائش مستقبل میں کتبے کی شناخت اور دریافت میں رہنمائی کر سکے۔

بہر حال! میرا خیال یہ ہے کہ یہ کتبہ ہو بہو ۸۸۰ ہجری میں فرینکلن کے ذریعے محفوظ کئے گئے اُس کتبے کی طرح ہے جس کے بارے میں وہ کہتا ہے کہ اُس نے وہ کتبہ ایک مسجد سے نقل کیا تھا جسے مہا جن ٹولہ (مسجد) کہتے تھے اور جو لٹّن مسجد اور اسی قسم کی (دیگر) عمارتوں سے ملحق ہے۔ اب یہ کتبہ صرف چام کٹّی مسجد ہی پر منطبق کیا جا سکتا ہے جو لٹّن مسجد سے تقریباً نصف میل کے فاصلے پر موجود مہاجن ٹولہ کے بالکل بیچوں بیچ واقع ہے، اور جس کے ساتھ یہ کتبہ زمینی خاکہ اور طرز تعمیر دونوں میں کامل طور پر مطابقت رکھتا ہے''۔ بایں وجہ تمام امکانات اور احتمالات کے ساتھ (یہ کہا جا سکتا

﴿تصویر نمبر ۱۳﴾ تانتی پارہ مسجد، گور (جانب مشرق کا منظر)
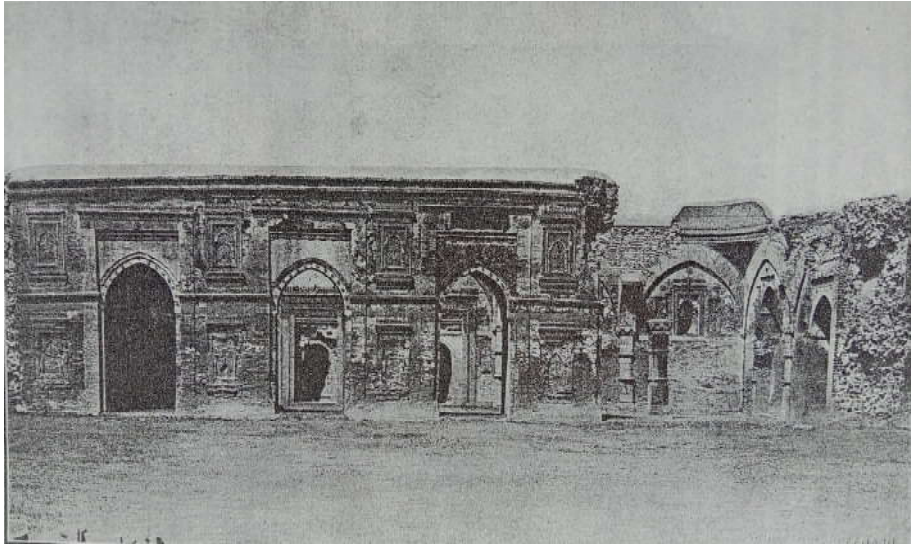
ہے کہ) یہ مسجد باربک شاہ کے فرزند ارجمند سلطان یوسف شاہ نے ۸۸۰ھ ہجری (مطابق ۱۴۷۵ء عیسوی) میں تعمیر کرائی تھی۔

﴿یادگار نمبر۱۲﴾ مسجد تانتی پارہ

(امکانی تاریخ تعمیر۔۔۔۔۔۔ ۱۴۸۰ء عیسوی)

توضیح... ازقلم: جنرل کیو ننگھم

یہ مسجد مستطیل اینٹوں سے بنی دوراہداریاں والی ایک ایسی عمارت ہے جو چار سنگین ستونوں کے ذریعے درمیان میں تقسیم شدہ ہے۔ یہ عمارت اندر سے ۸۷ رفٹ لمبی اور ۳۱ رفٹ چوڑی ہے اور باہر سے ۹۱ رفٹ لمبی اور ۴۴ رفٹ چوڑی ہے۔ ہر ایک گوشے میں ایک ہشت پہلو مینار ہے، دیواریں ساڑھے ۶ رفٹ موٹی ہیں۔ سامنے پانچ محراب دار

﴿تصویر نمبر۱۴﴾ تانتی پارہ مسجد، گور کا اندرونی منظر
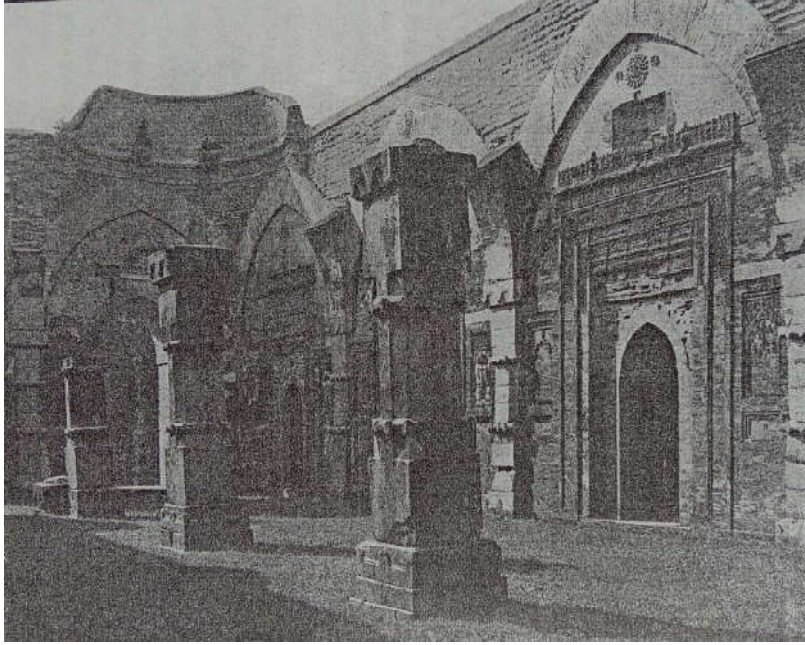
دروازے اور ہر کنارے پر دو دو دروازے ہیں۔ بیرونی حصے گلکاری والے دراز خطوط کی مدد سے بڑے بڑے پینلوں کے ذریعے آراستہ کئے گئے ہیں اور ہر پینل ایک نوکدار محراب کے ساتھ سجایا گیا ہے جس کے اندر گھنٹی نما مروجہ آشیاء آرائش موجود ہیں جو ایک لمبی زنجیر کے ساتھ آویزاں ہیں۔ مینار یں بھی اسی طریقے پر آراستہ کی گئی ہیں۔ سامنے کی منڈیریں پسندیدہ بنگالی طرز پر ذرا سا خمیدہ اور درمیان میں اٹھی ہوئی ہیں جن کے اوپر نیم کروی شکل کے دس گنبد قائم کئے گئے ہیں۔ (یہ تمام گنبد ۱۸۸۵ء عیسوی کے زلزلہ میں منہدم ہو چکے ہیں) میرے ذوق کے مطابق گور کی باقی ماندہ

تمام عمارتوں کے درمیان یہ مسجد سب سے عمدہ ہے۔اس کی زینت وزیبائش دلکش اوراثر آفریں ہےاور مسطح دیواروں کے برخلاف باہر بالائی حصے پر بڑے بڑے مزین پینل موجود ہیں ۔ پوری عمارت سرخ چمکدار رنگ سے ہم آہنگ ہے، یہ بات لٹّن مسجد کی زرق برق اور زیبائشی ٹائیلوں سے کافی زیادہ فرحت بخش ہے'' (رپورٹ، ص: ۶۱، ۶۲)۔
''تانتی پارہ'' کا مطلب ہوتا ہےنور باف طبقے کی رہائش گاہ۔یہ مسجد گرچہ اغلب طور پر مرصاد خان نے تعمیر کرائی تھی تاہم مقامی طور پر'مسجد عمر قاضی' سے معروف ہےاور کچھ لوگ نور باف طبقے کی رہائش گاہ سے موسوم کرکے بھی اسے پکارتے ہیں۔مسجد کے شمالی گوشے میں ایک تخت ہے(ایک اونچا پلیٹ فارم)جوممکنہ طور پر خواتین کی 'مسجد حاضری' کے لئے مخصوص تھا۔یہ بات قرین قیاس ہے کہ تخت کے نیچے دیوار کا اگلا حصہ اور پھر فوری بعد شمالی محراب کا زیریں حصہ ٹوٹ گیا تھا۔۔اگر تخت کے نیچے کوئی محراب رہی ہوتو۔۔۔یا پھر یہ تخت بالائی محراب سے بالکل الگ تھا۔شمالی اور جنوبی دیواروں میں جالی دار کھڑکیاں ہوا کرتی تھیں۔اب توان جالیوں کے نشانات بھی موجود نہیں ہیں اور یہ حصے کھلے رہ گئے ہیں۔

باوجودیکہ آثاریاتی پریکٹس کے مطابق یہ کوئی قاعدہ نہیں ہے پھربھی اگر کچھ مالداراور جوشیلے عوام مسلمین مشرقی دیوار کے ٹوٹے ہوئے حصے کی مرمت اوراز سرنو زینت وزیبائش کے اخراجات اٹھانے کی پیشکش کریں تو یہ ایک بہت ہی دلچسپ تجربہ ہوگا۔مقامی معمار وگلکار اپنی چھینیوں (ایک خاص قسم کے اوزار جوان میں زمانہ قدیم ہی سے اپنے آباء واجداد سے وراثت کے طور پر منتقل ہوتے رہے ہیں) سے اینٹوں پر گل کاری کرسکتے ہیں۔سادہ وسپاٹ اینٹیں چننے کا موجودہ نظم ونسق بہرحال کوئی خوشگوار اقدام نہیں ہے۔

اس مسجد کی خاکہ نگاری کے وقت کریٹن نے مسجد کے شمال مشرقی حصے میں ایک بہت بڑی عمارت کی موجودگی کا اشارہ بھی دیا ہے۔ایسا لگتا ہے کہ یہاں مسافروں کیلئے ایک بیرونی مکان تھا یا پھر ہوسکتا ہے کہ یہاں کوئی مدرسہ رہا ہو، تاہم یہ عمارت اب موجود نہیں ہے۔

﴿یادگار نمبر۱۳﴾ لٹّن مسجد

(امکانی تاریخ تعمیر: ۱۴۷۵ء۔۔۔بانی: سلطان یوسف شاہ)

یہ عمدہ ونادر مسجد نواب گنج روڈ سے چند گز مشرق میں گیارہویں سنگ میل کے نزدیک واقع ہے۔یہ عمارت کبھی تمام تر میناکاری کی ہوئی اینٹوں سے ڈھکی ہوئی تھی مگر اب تو سامنے کا بڑا حصہ تباہ ہو چکا ہے، (تاہم) بہت زیادہ ضرر رسیدہ حصے پرانی اینٹوں سے بحال کردیئے گئے ہیں۔کریٹن کے مطابق ایک کتبہ، جوقرب وجوار ہی میں دریافت ہوا

ہے، سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مسجد ۸۸۰ہجری (مطابق ۱۴۷۵ء) میں سلطان یوسف شاہ کی تعمیر کردہ ہے مگر کریٹن نے اس سے شاید مہاجن ٹولہ کتبہ مراد لیا ہے جسے کیونگھم نے چام کٹی مسجد سے منسوب کیا ہے۔ خیر! دونوں مساجد چوں کہ پلان میں ہم شکل ہیں اسلئے ہوسکتا ہے کہ دونوں مساجد ایک ہی بادشاہ کے ذریعے تعمیر کی گئی ہوں۔ مسجد کا فرش زمانہ ماضی میں یقینی طور پر ان لوگوں نے تباہ کردیا تھا جنہوں نے خفیہ خزانے کی تلاش میں متعدد مقامات پر سراخ اور گڈھے کھود دیئے تھے مگر اب ضرر رسیدہ حصوں کی مرمت کردی گئی ہے۔ مسجد کا اندرونی حصہ اچھی حالت میں ہے اور چمگادڑوں کو اندر آنے سے روکنے کیلئے دروازے اور کھڑکیاں تار کی جالیوں سے بند کردی گئی ہیں۔

جنرل کیوننگھم کی تصریحات:

لٹّن مسجد کا زمینی نقشہ ہو بہو چام کٹی مسجد کے زمینی نقشے کی طرح ہے۔ دونوں کی جائے وسعت مربع شکل کی ہے جو ایک مجرد گنبد سے ڈھکی ہوئی ہے، ساتھ ہی ایک برآمدہ یا راہداری ہے۔ لٹن مسجد کا مرکزی کمرہ ۳۴/مربع فٹ وسیع ہے جب کہ راہ داری ۳۴/فٹ لمبی اور ۱۱/فٹ چوڑی ہے۔ دونوں جانب کی دیواریں اور برآمدے کی محاذی دیوار ساڑھے ۸/فٹ موٹی ہیں تاہم مرکزی کمرے کی محاذی اور عقبی دیواریں ۱۰/فٹ ۷/انچ موٹی ہیں۔ سامنے راہ داری میں تین محراب دار دروازے ہیں اور ہر ایک کنارہ پر ایک دروازہ ہے۔ درمیانی محراب ۶/فٹ ۱۱/انچ، دونوں جانب کی محرابیں ۵/فٹ ۵/انچ اور کنارے کی محرابیں ۴/فٹ ساڑھے ۹/انچ محیط ہیں۔ سامنے اور بازوؤں میں خود مسجد کے تین دروازے ہیں جن کا طول وعرض راہداری کے تینوں محاذی دروازوں کے برابر ہے۔ عقبی دیوار میں تین محراب ہیں جو بقیہ تین دیواروں میں بنے دروازوں کے مشابہ ہیں۔ مرکزی حجرے کی شکلِ مربع ۱۷/انچ موٹی سیاہ سنگین ستونوں کی مدد سے قائم کی گئی محرابوں، جو ہندوانہ ہنرمندی کا کمال معلوم ہوتا ہے، کے ذریعے ہشت اضلاع والی شکل میں بدل گئی ہے۔ اس ہشت پہلو عمارت کے بالائی حصے پر ایک بالکل سپاٹ چھت ہے جس کے اوپر نیم کروی شکل کا قبہ بنایا گیا ہے۔

جیسا کہ ماقبل ہی میں مشاہدہ کیا جاچکا ہے کہ مسجد کی پوری اندرونی اور بیرونی سطح کبھی سبز، پیلے، نیلے اور سفید رنگوں کے متعدد پیٹرن کی شیشے جڑی ہوئی ٹائیلوں [1] سے ڈھکی ہوئی تھی۔ یہ ٹائیلیں، جو درمیانی خلاؤں میں باری باری

1۔ چمکدار رنگوں میں کاشی کاری والی ٹائیلیں بنانے کا فن سندھ میں اب بھی زندہ ہے۔ (عمارت) کی اینٹوں کا رنگ لگ بھگ غائب ہو چکا ہے اور دیواروں میں بڑی دراڑیں مسطح اور سپاٹ اینٹوں سے بھری گئی ہیں۔ باہر کی طرف

سے سفید اور نیلی استعمال کی گئی تھیں، مسدس شکل میں ڈھلی ہوئی تھیں جن کے گوشے ثلاثی الزوایا نمونے کو چھو رہے تھے۔۔۔فرینکلن نے اس مسجد کے جمال وزیبائی کے تئیں ایک بڑا ہی پرجوش بیان دیا ہے، اس کا خیال ہے کہ انداز کی دلکشی ،تعمیر کے ہلکے پن اور پرذوق سجاوٹ کے اعتبار سے ہندوستان بھر میں کوئی عمارت اس پر سبقت نہیں لے جاسکتی''۔کیوننگھم نے عمارت کی خوش نمائی میں تو کریٹن کے ساتھ اتفاق کیا ہے مگر اس کا کہنا ہے کہ ''تعمیر کا ہلکا پن ہی ایک ایسا نقطہ ہے جس میں بنگال کی اسلامی طرز تعمیر ناکام رہی۔۔۔۔(باقی) حسین نقشے، سجاوٹ کی زیبائی، شان و شوکت اور خوشنمائی کے اعتبار سے میں بہرصورت قدیم مینار، تانتی پارہ مسجد اور داخل دروازہ کو ترجیح دونگا۔(رپورٹ، ص:۶۲/تا۶۵)

لٹّن نام پر تبصرہ:

ایک مقامی روایت یہ ہے کہ اس مسجد کو ایک رقاصہ نے تعمیر کرایا تھا۔کسی بادشاہ کے منظور نظر ہونے کی وجہ سے اُس نے کافی زیادہ دھن دولت کمائی تھی سو اس نے ایک قابل تعریف اقدام کے طور پر اپنی کل جمع پونجی کے ذریعے یہ خوبصورت مسجد تعمیر کرائی۔کتبے کی تختی پر اس نے اپنا نام چھپایا اور بادشاہ کا نام درج کرایا۔لفظ ''لٹّن'' کا اصلی معنی ''قلاباز کبوتر'' کے آتا ہے۔اب اس تناظر میں رقاصہ کا نام ''لٹّن'' ممکنہ طور پر اس کے جادوگرانہ رقص کی وجہ سے رکھا گیا ہوگا۔اس موضوع پر متوفی ڈاکٹر بلوچ کی آراء حسب ذیل ہیں:

''لگے ہاتھوں مجھے یہ ذکر کردینا چاہئے کہ اس مسجد کے حالیہ نام 'لٹّن مسجد' کی توضیح عام طور پر 'رقاصہ کی مسجد' سے کی جاتی ہے اور یہ کہ یہ لفظ ''لٹّن''، رقاصہ کے معنی میں مستعمل بنگالی لفظ ''ناتن''۔۔۔۔در سنسکرت ''ناتی''۔۔۔۔کی ایک بگڑی ہوئی شکل سے عبارت ہے۔ مجھے سخت اچنبھا ہوگا اگر صحیح معنوں میں ایسا ہے کہ یہ مسجد ایک رقاصہ کے ذریعے تعمیر کی گئی ہے۔قدیم ہندوستانی کتبات سے ایسے متعدد واقعات کے بارے میں تو ہم یقینی طور پر جانتے ہیں کہ

دیوار میں بہت سے اینٹوں والے ضرر رسیدہ حصے اب بھی باقی ہیں جن کی مرمت اُسی طرح ضروری ہے جس طرح دیوار کے اندرونی حصے میں متاثر شدہ حصوں کی مرمت ضروری ہے، بوسیدہ حصوں میں سیمنٹ کی کی گئی لیپا پوتی یکسر بے سلیقہ نظر آتی ہے۔گوشوں میں قائم شدہ منارے، اگر ان کے بالائی حصے کی مرمت کردی جائے تو، زمانہ رفتہ کی زینت وزیبائی بڑی حد تک بحال کرسکتے ہیں۔مشرقی حصے میں ایک تالاب ہے جو قدیم وقتوں میں مسجد کے کمپاؤنڈ کے اندر موجود تھا۔(ایچ،ای،اسٹیپلٹن)

رقاصاؤں یا اسی طبقے کی دوسری خواتین نے، جنہیں سنسکرت میں 'گنیکا' کہا جاتا تھا، بدھست راہبوں یا راہبات یا پھر عام عزت دار مرد و خواتین کے ساتھ مل کر مقدس 'اِسٹوپا' یا اُن کے مذہبی مندروں کی تزئین میں حصہ لیا ہے۔ باوجود اس

﴿تصویر نمبر ۱۵﴾ لٹن مسجد
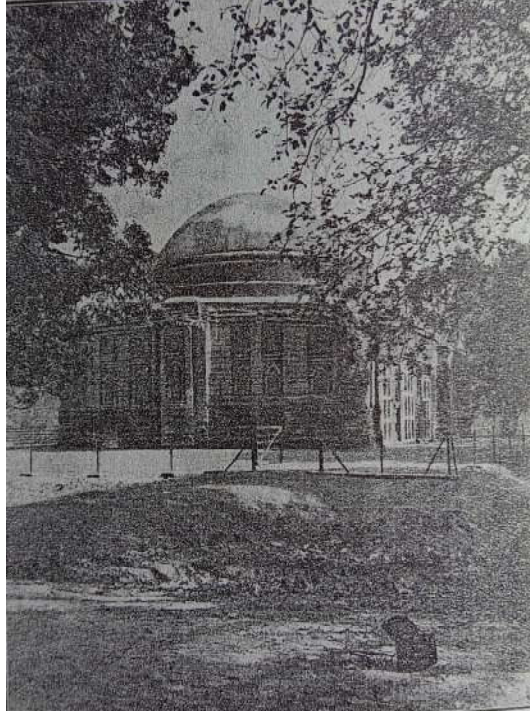
کے، میں اس بارے میں کافی زیادہ تردد کا شکار ہوں کہ کیا علماء، آئمہ اور خدام (حضرات) نے ایک رقاصہ کی طرف سے پیش کی گئی کسی مسجد کا تحفہ قبول کرنے کیلئے رضامندی ظاہر کی ہوگی؟ وہ بھی بنگال کی سلطنت اسلامی کے دارالحکومت میں، اگرچہ گزرے ہوئے ایام میں وہ ایک مقتدر عورت رہی ہو اور قدیم طور طریق کے مطابق اس نے نادم و تائب ہو کر اپنی گزشتہ زندگی کی تلافی کے ارادہ سے ایک قابل تعریف کارنامہ انجام دیتے ہوئے ایک مسجد کی تعمیر کرائی ہو۔۔۔ یہاں تک کہ اگر ہم اس طرح کے کسی نظریہ کو قبول کرلیں تو مجھے اس بات کا اندیشہ ہے کہ ہم ایک ایسے 'نام' پر بہت زیادہ زور دے رہے ہیں جس کے لئے ہم ان پڑھ دیہاتیوں جو اب قدیم دارالحکومت، بنگال کے محل وقوع میں رہائش پذیر ہیں، کی محض ایک حالیہ روایت پر انحصار کر رہے ہیں۔

لفظ ''لٹّن مسجد'' کی ایک دوسری تشریح میرے سامنے آئی ہے جسے ترجیحی طور پر کافی زیادہ زیادہ رغبت کے ساتھ میں قبول کروں گا۔ میں لفظ لٹن کی اس مروجہ توضیح کو تسلیم کرتا ہوں کہ ''لٹّن'' بنگالی لفظ 'ناتن' (سنسکرت ناتی) کی ایک

بگڑی ہوئی شکل ہے جس کا معنی رقاصہ کے آتا ہے مگر مسجد کو یہ نام اس لئے نہیں دیا گیا تھا کہ یہ کسی رقاصہ کی تعمیر کردہ ہے بلکہ یہ نام اُس کے دلکش اور زیبائشی منظر کی بنیاد پر دیا گیا تھا۔ مسجد اندرونی اور بیرونی دونوں سمتوں میں سفید، نیلے، پیلے اور ہرے جیسے چمکدار رنگوں کی شیشے جڑی ہوئی ٹائیلوں سے پورے طور پر آراستہ تھی۔ ان اسباب کی بنا پر موجودہ گور کے ناخواندہ دیہاتیوں کو یہ مسجد ایک ایسی رقاصہ کی طرح معلوم ہوتی تھی جو زرق برق لباس اور روشن زیورات سے ڈھکی ہوئی ہو۔ اِس طرح 'لٹّن مسجد' کا حقیقی معنی ہوتا ہے کہ ایک ایسی مسجد جو (اپنی آرائش وزیبائش) میں ایک رقاصہ کے مشابہ ہے، نہ کہ رقاصہ کی مسجد''۔ (کنزرویشن نوٹ، ایسٹرن بنگال اینڈ آسام، ۷/اپریل ۱۹۰۹ء)

﴿یادگار نمبر ۱۴﴾ پنج محرابی پل

(تاریخ تعمیر: ۸۶۲ ہجری مطابق ۱۴۵۷ عیسوی)

یہ پل، جولٹن مسجد اور کوتوالی دروازہ کے درمیان واقع ہے، پتھروں اور اینٹوں سے بنا ہوا ہے اور ہلکی چڑھائی اور اترائی پر مشتمل ہے۔ یہ کافی قدیم زمانے کا نظر آتا ہے۔ پل پانچ نوک دار محرابوں پر مشتمل ہے جن میں سے بیچ والی محراب ۱۱/فٹ ۶/انچ، اس کے دونوں بازوؤں والی محرابیں ۱۰/فٹ ساڑھے ۳/انچ اور ہر دو کنارے کی دونوں محرابیں ۹/فٹ ۱/انچ محیط ہیں۔ کھمبے بھی اسی طریقے پر چھوٹے ہوتے گئے ہیں۔ درمیانی دونوں کھمبے ۱۰/فٹ ۶/انچ جب کہ کنارے کے دونوں کھمبے ۹/فٹ ۳/انچ موٹے ہیں۔ سڑک کا درمیانی حصہ ساڑھے ۲۷/فٹ چوڑا اور ۲۷۵/فٹ لمبا ہے۔ اسی سے ملتا جلتا ایک پل ''گون مانت مسجد'' کے جنوب میں دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ دونوں پل ایک ندی کے اوپر بنائے گئے ہیں جس سے اہم ترین نالے اور شہر کے اندرونی حصے تک رسائی کے ذرائع کا قیام عمل میں آیا ہے۔ ایک کتبہ، جو کیوننگھم کو پل کے قریب ہی کہیں پڑا ہوا ملا تھا، اُسے بلوچ مین نے ''جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال'' (ج:۴۴، ص:۲۸۹) میں شائع کردیا ہے۔ اس کا ترجمہ مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا جاسکتا ہے:

سلطان ناصر الدنیا والدین، ابوالمظفر سلطان محمود شاہ کے عہد میں ۵/صفر، اللہ اس ماہ کو فتح وکامرانی کے ساتھ گزارنے کی توفیق عطا کرے، ۸۶۲ ہجری (مطابق ۲۳/دسمبر ۱۴۵۷ عیسوی) کو اس پل کی تعمیر عمل میں آئی۔

﴿یادگار نمبر ۱۵﴾ پیٹھا والی مسجد

یہ مسجد کوتوالی گیٹ کے شمال مغرب میں تھوڑے ہی فاصلے پر واقع تھی اور کہا جاتا ہے کہ اس مسجد کو ایک پیٹھا (آٹے یا میدے سے بنائی جانے والی ایک پیسٹری) بنانے اور بیچنے والی عورت نے تعمیر کرایا تھا۔ مسجد کی ٹوٹی پھوٹی عمارت، جو

اب بانس کی ایک جھاڑی میں واقع ہے، پبلک روڈ ہی سے دیکھی جاسکتی تھی۔ تقریباً ۱۸۶۱ء میں یہ مسجد تہس نہس کر دی گئی اوراب تو صرف ایک ٹوٹی ہوئی دیوار کی شکل میں عمارت کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ہی باقی رہ گیا ہے۔[1]

﴿یادگارنمبر۱۶﴾ کوتوالی دروازہ

مادھی پور کے نزدیک شہرگور کی جنوبی دیوار میں بنا یہ مرکزی دروازہ ہے۔اس دروازہ میں ایک شاندار محرابی گزرگاہ ہوا کرتی تھی جواب منہدم ہوچکی ہے البتہ انہدام سے پہلے کریٹن نے اس دروازے کا ایک عمدہ اورنفیس خاکہ بنایا ہے۔دروازہ میں اینٹوں سے بنی ایک محراب تھی جو۳۰رفٹ اونچی اور۱۶رفٹ ۹رانچ محیط تھی۔کہتے ہیں کہ پولیس (ڈپارٹمنٹ) کا حاکم اعلیٰ یہیں پر قیام کیا کرتا تھا۔دروازہ کے مشرقی ومغربی حصے میں منڈیریں بنی ہوئی ہیں اور ہمہ اطراف تاہنوز ایسے روشندان موجود ہیں جہاں سے دشمنوں پرآتش زدگی کی جاتی تھی۔جنرل کیونگھم کا کہنا ہے کہ''مجھے ایسا لگتا ہے کہ قلعے کے (دیگر) دروازوں کی بنسبت یہ دروازہ کافی زیادہ کہنہ طرزِتعمیر کا نمونہ ہے،اندرونی و بیرونی دونوں جانب دوڈھلان دارنیم مدور منارے ہیں جن کا قطر۶رفٹ ہے۔ان میناروں میں ہرطرف گہری طاقیں ہیں اورساتھ ہی نوک دارمحرابیں ہیں جوآراستہ وپیراستہ ستونوں پرقائم ہیں۔چونکہ یہ سارے مخصوص اوصاف یعنی ڈھلان دارمنارے،گہری طاقیں اوراعلیٰ طرز کے مزین ستون دہلی کے قدیم اسلامی طرزِتعمیر کی نمایاں خصوصیات ہیں اس لئے میرے نزدیک یہ بات ناممکن الوقوع نہیں ہے کہ یہ دروازہ بھی امکانی طور پراُسی عہد سے تعلق رکھتا ہے،یا پھرگور میں قدیم ترین اسلامی کتبہ کے پائے جانے کی تاریخ ۱۲۳۵ء یعنی دورالتمش اورعلاءالدین محمد خلجی کی وفات (۱۳۱۵ء) کے درمیانی زمانہ میں،جب لکھنوتی میں دہلی کا کافی زیادہ اثر ورسوخ ہوا کرتا تھا،اِس دروازے کی تعمیرعمل میں آئی''۔ (رپورٹ،ص:۷۰)

﴿یادگارنمبر۱۷﴾ ڈھنیچک یاراج بی بی مسجد

کوتوالی دروازرہ کے جنوب مشرق میں دوتالابوں بنام''بالوادیگھی''اور''خانیہ دیگھی''کے مابین واقع یہ ایک

1۔بوچانن کے ذریعے تھانہ'ناہ نگر' کی سرگزشت کے آخرمیں پیش کئے گئے حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ عورت، جس نے گورمیں اس مسجد کی تعمیر کرائی تھی،شاہ شجاع کے زمانہ میں حیات تھی۔اورعہدِحسین شاہ سے۱۵۰رسالہ پیشترتعمیر شدہ مرکزی سڑک،جوگوروپنڈوہ سے شروع ہوتی تھی،کے ساتھ ناہ نگرمیں جوڑنے کیلئے راج محل سے ایک سڑک بھی بنوائی تھی۔(ایچ،ای،اسٹیپلٹن)

چھوٹی سی مسجد ہے۔اول الذکر تالاب، ضلع بورڈ سڑک جو تالاب کے مغرب میں قریب ہی سے گزرتی ہے، کے ساتھ شمال جنوب سمتوں میں بہتا ہے جبکہ خانیہ دیگھی شمالی کنارہ، بالوادیگھی کے شمال مشرق میں چوتھائی میل کے فاصلے پر واقع مشرق ومغرب سمتوں میں بہنے والا نسبتاً چھوٹا تالاب ہے۔انگلش بازار سے بارہویں سنگ میل آخرالذکر تالاب کے شمال مشرقی گوشے کے پاس قائم ہوتا ہے۔ یہ مسجد ۶۲/فٹ لمبی اور ۴۲/فٹ چوڑی ہے۔ ایک بڑا گنبد ہے اور جانبِ مشرق تین چھوٹے چھوٹے گنبد ہیں۔اس طرح یہ مسجد طرز تعمیر کے اعتبار سے 'لٹن مسجد' سے مشابہت رکھتی ہے۔ اندرونی حجرہ ۲۸/مربع فٹ وسیع ہے۔

﴿یادگار نمبر ۱۸﴾ درس باڑی مسجد

(تاریخ تعمیر: ۸۸۴ہجری مطابق ۱۴۷۹عیسوی۔۔۔بانی: سلطان یوسف شاہ)

مادھی پور اور فیروز پور کے درمیان ایک جگہ ہے جسے لوگ ''درس باڑی'' کے نام سے پکارتے ہیں۔(درس باڑی: مطلب! لیکچر روم یا مدرسہ۔ایسا شاید اس لئے کہتے ہیں کہ یہاں ایک مسجد کے ساتھ متصل ایک مشہور مدرسہ ہوا کرتا تھا) یہاں پر اینٹوں سے بنی ایک کافی بڑی مسجد ہے جس کے ستون پتھروں کے ہیں۔ یہ مسجد ۱۱۱/فٹ ۶/انچ لمبی اور ۶۷/فٹ ۶/انچ چوڑی ہے مگر چھت پوری کی پوری منہدم ہو چکی ہے۔مشرقی اور جنوبی سمتوں کی دیواروں کے موجودہ حصے حالیہ دنوں مرمت کردیئے گئے ہیں اور دیواروں کا اوپری حصہ پن روک بنادیا گیا ہے، مسجد کا اندرونی حصہ پورا کا پورا نقش ونگار سے ڈھکا ہوا تھا جن میں سے اکثر اب ندارد ہیں، مسجد تین حصوں میں بٹی ہوئی تھی، مرکزی ہال کا طول و عرض ۵۱/فٹ برابر ۲۵/فٹ ۶/انچ تھا جو سلنڈر شکل کی چھت سے ڈھکا ہوا تھا، جانبی کمرے ۴۲/فٹ کشادہ تھے، جانبِ مشرق ۱۶/فٹ ۶/انچ کشادہ ایک برآمدہ بھی مسجد کے اندر شامل تھا۔ یہاں عمارت کے شمال مغربی گوشے میں ایک شہ نشیں برائے خواتین یا اونچا چبوترہ بھی تھا جس کا ایک چھوٹا سا ابھرا ہوا حصہ (۱۸/فٹ لمبا اور ۱۱/فٹ چوڑا) خوبصورت زیبائشی ورک کے ساتھ اب تک شمالی حصے میں دیکھا جا سکتا ہے۔مسجد کے مشرق میں تقریباً ایک چوتھائی میل کی دوری پر ضلع بورڈ سڑک کی دوسری طرف ''بالوادیگھی'' واقع ہے۔

کتبہ:

۱۸۷۶ء کو محل کے کوڑا کرکٹ کے ایک ڈھیر کے اندر سے منشی الٰہی بخش کو ایک بڑا سا خط پیچیدہ والا کتبہ ملا جس کی پیمائش ۱۱/فٹ ۳/انچ لمبی اور ۲/فٹ ۱/انچ چوڑی تھی۔ یہ کتبہ اب کلکتہ میوزیم میں موجود ہے جس کا نمبر شمار ۳۲۳۹/

ہےاوراس کی ایک نقل (کیوننگھم کے رپورٹ سے) پلیٹ نمبر۳ رمیں شامل دیکھی جاسکتی ہے۔کتبے کی زیادہ طوالت کو

﴿نمونہ کتبہ یوسف شاہ۔ بتاریخ: ۸۸۴ھ، درگور۔تصویراز: جے، کریڈوک﴾
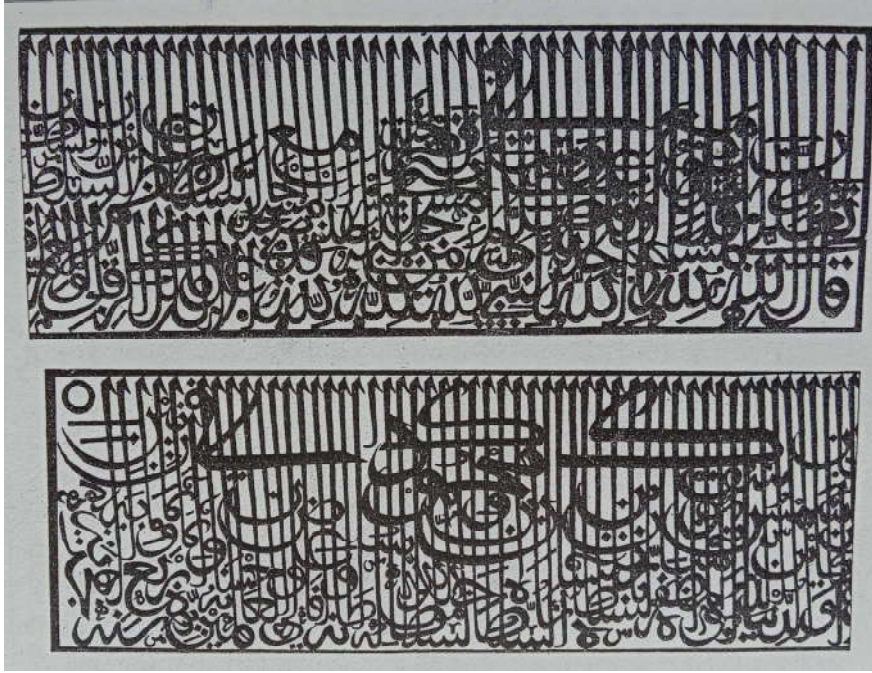
سنگی طبع: دفتر سرویئر جنرل، کلکتہ۔مؤرخہ: ستمبر ۱۸۸۲ء۔

پلیٹ نمبر۳

دیکھتے ہوئے اُسے دوحصوں میں تقسیم کردیا گیا ہے۔کتبے کا متن اورر جمہ مندرجہ ذیل ہے:

قال الله تعالیٰ و ان المساجد لله فلاتدعوا مع الله احداوقال النبی صلی الله علیه وسلم من بنٰی مسجدا لله بنی الله له قصرا فی الجنة مثله قد بنٰی هذا المسجد الجامع السلطان العادل الاعظم مالک الرقاب والامم سلطان بن سلطان بن السلطان شمس الدنیا والدین ابو المظفر یوسف شاه السلطان بن باربک شاه السلطان بن محمود شاه السلطان خلد الله ملکه وسلطنته و افاض علی العالمین احسانه وبره فی سنة اربع وثمانین وثمان مأة هجریه.

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے ارشادفرمایا: اور بے شک مساجد اللہ کے لئے ہیں تو اللہ کے ساتھ کسی کوشریک نہ ٹھہراؤ۔اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا: جس نے اللہ کے لئے ایک مسجد بنائی اللہ اس کے لئے اسی کی طرح جنت میں ایک محل بنائے گا۔عظیم انصاف ور بادشاہ، مالک خلق وامم، سلطان ابن سلطان ابن سلطان، شمس الدنیا والدین، ابوالمظفر

سلطان یوسف شاہ ابن سلطان باربک شاہ ابن سلطان محمود شاہ، اللہ اُس کی مملکت اور سلطنت کو ہمیشہ قائم رکھے اور تمام عالموں پر اُس کی بخشش اور خیر خواہی کو عام فرمائے، نے ۸۸۴ھ ہجری (مطابق ۱۴۷۹ عیسوی) میں اس جامع مسجد کی تعمیر کرائی۔

﴿یادگار نمبر ۱۹﴾ چھوٹی سونا مسجد، فیروز پور

(بانی: ولی محمد: در دورِ حکومت: سلطان حسین شاہ، ۱۴۹۳ء۔۔تا۔۔۱۵۱۹ء)

یہ مسجد جو انگلش بازار سے ۱۴/ میل کے فاصلے پر، نواب گنج روڈ کی جانب مشرق، گور کے بعید ترین جنوبی حصے اور پورب پچھم بہنے والے بڑے تالاب کے جنوب مغربی گوشے میں واقع ہے، چھوٹی سونا مسجد کہلاتی ہے مگر ہمیں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس مسجد کا دوسرا نام ''خواجہ کی مسجد'' ہے۔ روایت یہ ہے کہ اس مسجد کو ایک خواجہ سرا نے تعمیر کرایا تھا، [1] یہ مسجد اینٹوں سے بنی ہے اور اوپری حصے پر پتھر چن دیئے گئے ہیں عمارت ایک قائمۃ الزاویہ بلاک ہے جس کا بیرونی طول وعرض ۸۲/ فٹ برابر ساڑھے ۵۲/ فٹ ہے جبکہ اونچائی ۲۰/ فٹ ہے۔ اندرونی پیمائش ۷۰/ فٹ ۴/ انچ لمبی اور ۴۰/ فٹ ۹/ انچ چوڑی ہے جو تین طویل راہداریوں میں بٹی ہوئی ہے، ساتھ ہی سامنے ۵/ قوس نما دروازے ہیں۔ تینوں درمیانی حصے، جو چرچ کے مرکزی حصے کی شکل جیسے ہیں، بیچ میں ملے ہوئے چار مسطح گنبد سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ عمارت کے دیگر ۶/ بڑے حصے، ہر ایک جانب، چھوٹے چھوٹے نیم کروی شکل کے گنبدوں سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ مغربی دیوار کا ایک حصہ اور تین گنبد ۱۸۹۷ عیسوی کے زلزلہ میں گر گئے تھے مگر بعد میں (۱۹۰۰ء کو) حکومت کے ذریعے یہ سب بحال کر دیئے گئے ہیں اور دیواروں کے بالائی حصوں سے تمام پیڑ پودوں کو بھی صاف کر دیا گیا ہے۔ مسجد میں ۱۲/ نیم کروی اور ۳/ مخروطی شکل کے گنبد موجود ہیں، مخروطی شکل کے گنبد درمیان میں واقع ہیں اور ان کے پورے اندرونی حصے سجاوٹی گلابوں سے آراستہ ہیں۔

جیسا کہ ماقبل میں دی گئی تصویر میں دیکھا جا سکتا ہے کہ فیروز پور کی سونا مسجد میں بارہ دواری (یعنی پرشکوہ سونا مسجد، گور جو تقریباً سپاٹ ہی ہے) کے مقابلے میں کافی بہتر نقاشی کی گئی ہے۔ دروازوں میں کشادہ زیبائشی پٹیوں کی مدد سے بارڈر بنائے گئے ہیں مگر تراش اتنی ہلکی ہے کہ یہ نقش ونگار عمارت کے بالکل نزدیک پہنچے بغیر نظر نہیں آتے۔ اسی قسم کے نقش ونگار دروازوں کے درمیان بنی طاقوں میں بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔

1۔ مسٹر پورچ، متوفی کلکٹر ضلع مالدہ کا خیال ہے کہ اس مسجد کو شاہی حرم کے خرانچی نے تعمیر کرایا تھا۔

’’کتبے کی تختی، جو وسطی دروازہ کے اوپر نصب کی گئی تھی، کے دائیں ہاتھ کا بالائی گوشہ اور بائیں ہاتھ کا زیریں گوشہ ضائع ہو چکا ہے اور ساتھ ہی تعمیر مسجد کے ہجری تاریخ والے الفاظ مٹ چکے ہیں مگر چونکہ سلطان حسین شاہ کا نام

﴿تصویر نمبر ۱۶﴾ چھوٹی سونا مسجد، فیروز پور، گور
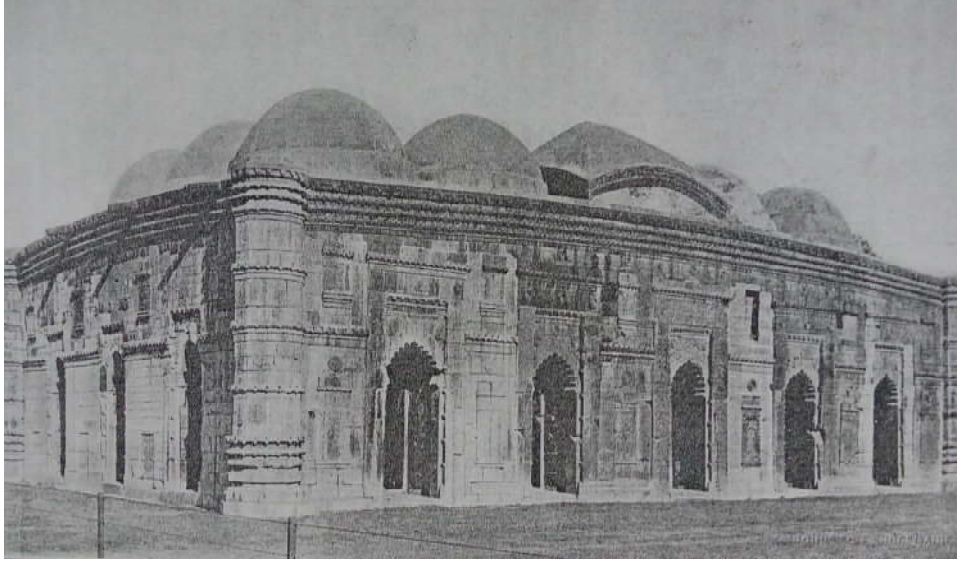
پیش کیا گیا ہے اس سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ یہ مسجد ۸۹۹ھ ہجری مطابق ۱۴۹۳ء عیسوی اور ۹۲۵ھ ہجری مطابق ۱۵۱۹ء عیسوی کے درمیان تعمیر کی گئی ہے‘‘۔ (کیونگھم نے کتبے کی قدرے تصحیح کی ہے)۔۔۔۔۔۔مندرجہ ذیل عبارت وسطی دروازہ کے اوپر نصب کی گئی کتبے والی تختی کا متن ہے:

بسم الله الرحمن الرحيم

قال الله تعالٰى انما يعمر مسجد الله من اٰمن بالله واليوم الاٰ خر واقام الصلوٰة واٰتى الزكوٰة ولم يخش الا الله فعسٰى اولٰئک ان يكونو ا من المهتدين وقال النبى صلى الله عليه وسلم من بنى مسجدا لله بنى الله له بيتا فى الجنة مثله . عمارة هذا المسجد الجامع فى عهد سلطان السلاطين سيد السادات منبع السعادات ارحم المسلمين والمسلمات معلى كلمات الحق والحسنات المؤيد بتائيد الديان المجاهد فى سبيل الرحمن خليفه الله بالحجة والبرهان غوث الاسلام و المسلمين علاء الدنيا والدين ابو المظفر حسين شاه السلطان الحسينى خلد الله ملكه وسلطنته بنى هذاا لمسجد الجامع خالصا مخلصا متو كلا على الله ولى محمد بن على

المخاطب بخطاب مجلس المجالس مجلس منصور نصره الله تعالیٰ فی الدنیا والآخرة و تاریخه المیمون فی الرابع عشر من شهر رجب المبارک رجب الله قدره وشانه .

اللہ کے نام سے شروع جو بہت مہربان رحمت والا

اللہ تعالیٰ نے ارشادفرمایا: اللہ کی مسجدیں وہی آباد کرتے ہیں جو اللہ اور قیامت پر ایمان لاتے اور نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے، پس امید ہے کہ یہ لوگ ہدایت پانے والوں میں سے ہو جائیں۔اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا: جس نے اللہ (کی رضا) کے لئے ایک مسجد بنائی، اللہ اس کیلئے اسی کی طرح جنت میں ایک گھر بنائے گا۔۔۔۔سلطان السلاطین، سید السادات، منبع السعادات، مسلمان مردوں اور عورتوں پر بڑی مہربانی کرنے والے، راست گوئی اور راست بازی کی صدائیں بلند کرنے والے، حساب لینے اور بدلہ دینے والے خدائے برتر کی اعانت پانے والے، راہ مولیٰ میں جہاد کرنے والے، روشن دلیل اور قطعی ثبوت کے ذریعے نائب خدا، اسلام اور مسلمانوں کے فریادرس، علاء الدنیا والدین، ابوالمظفر، سلطان حسین شاہ الحسینی، اللہ اس کی مملکت اور سلطنت کو سدا آباد رکھے، کے عہد میں اس جامع مسجد کی عمارت (قائم ہوئی)۔۔۔۔خلوص و نیک نیتی کے ساتھ اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے ولی محمد ولد علی، جو مجلس المجالس مجلس منصور کے لقب سے ملقب ہے، اللہ دنیا و آخرت میں اُس کی مدد فرمائے، نے اِس جامع مسجد کی تعمیر کرائی۔اور اس کی مبارک تاریخ چودہویں رجب المرجب ہے، اللہ اس کی قدر و منزلت میں اضافہ فرمائے۔(سال کی تاریخ والا حصہ ٹوٹ چکا ہے)

''اس کتبے کے درمیانی لائن میں تین آرائشی دائرے ہیں جن میں سے ہر ایک خدا کے ایک نام پر مشتمل ہے۔ درمیانی دائرہ میں درج ہے: **یااللہ**، مطلب: اے خدا۔۔اس کے دائیں بازو والے دائرہ میں درج ہے: **یاحافظ**، مطلب: اے نگہبان۔۔اور بائیں بازو والے دائرہ میں درج ہے: **یارحیم**، مطلب: اے رحمت والے۔۔یہ سارے اموراور ساتھ ہی کتبے کے دونوں گمشدہ حصے رَوِنشّاہ کی عکسی تصاویر، پلیٹ نمبر ۲۲ رمیں دیکھے جاسکتے ہیں''۔(رپورٹ، از: کیوننگھم۔ص:۵۷)

چھوٹی سونا مسجد کے اندر ہندوانہ تصاویر:

کریٹن نے اپنی ''Ruins of Gour'' میں وراہا۔اوَتارا، سیوانی (غالباً سرسوتی)، برَہمانی اور بھوانی (سیوا) جیسے ہندو دیوتاؤں اور دیویوں کی شکلوں کے خاکے شائع کئے ہیں جن کی تصاویر مسجد کے اندر پائی گئی تھیں، جن پتھروں

پہ یہ تصاویر بنی تھیں وہ پتھر شکلوں کو اندر کی طرف رکھ کر دیوار میں چنے گئے تھے اور باہر والی عقبی سطح پر تازہ زیبائشی کام کر دیا گیا تھا۔ کریٹن کی توضیح کے مطابق اسلامی حکمراں اپنی قلمرو میں کسی بھی ہندو مندر کا وجود پسند نہیں کرتے تھے اس لئے انھوں نے مندروں کو تہس نہس کر دیا اور (ان کے) مواد مسالے مسجدوں کی تعمیرات میں استعمال کئے۔[1] راقم السطور کو لگتا ہے کہ بانئ مسجد نے ہندو دیوتاؤں کی تصاویر پر مشتمل پتھر گور کے قلعے سے حاصل کیا ہوگا جہاں یقینی طور پر اگلے ہندو راجاؤں کے وقت کی مندریں رہی ہوں گی۔ بانی کو یہ امید نہیں ہوگی کہ یہ تصاویر کبھی منظر عام پر بھی آسکتی ہیں مگر گردش زمانہ نے مغربی دیوار کے ایک حصے کو زمین بوس کر دیا اور یہ تصویریں بے نقاب ہوگئیں۔[2]

1۔ کریٹن کا یہ موقف کہ:

"The Muhammadan rulers did not like to keep any Hindu temple in their dominion and so they destroyed the temples and utilised the materials in the construction of the mosques"

بہر حال محل نظر ہے، غور طلب پہلو یہ ہے کہ اگر اسلامی حکمراں اتنے ہی غیر روادار طبیعت کے حامل تھے تو پھر گوپی ناتھ بوس اور سناتن و روپ برادران کو کیونکر حسین شاہ کے اہم ترین وزیروں میں شامل ہونے کا موقع ملا؟ جبکہ حسین شاہ دیگر سلاطین بنگالہ کی بنسبت کہیں زیادہ مذہبی خیال، ذی علم اور عالی نسب تھے۔ دوسری بات یہ کہ تاریخ شاہد ہے کہ ظالموں کی حکومت کبھی بھی پائیدار نہیں رہی۔ وہ خواہ کتنے ہی باجبروت کیوں نہ ہوں، بہت جلد فنا ہوجاتے ہیں۔ ہندوستان میں برٹش امپائر اِس بات کی ایک واضح ترین مثال ہے۔ تو اگر مسلم حکمراں فی الواقع اتنے ہی خونخوار ہوتے تو بہت جلد ان کے خلاف ہندو اکثریت کی جانب سے بغاوت ہوجانی چاہئے تھی اور اُن کا دور اقتدار آناً فاناً ختم ہوجانا چاہئے تھا، حالانکہ اس امر کے برخلاف مسلم حکمراں ہمیں یہاں صدیوں تک چین وسکون کے ساتھ حکومت کرتے نظر آتے ہیں اور اُن کے دور حکومت میں رعایا بھی ہری بھری اور خوش وخرم نظر آتی ہے۔ عالی جناب! یہ صورت حال کس بات کی جانب اشارہ ہے؟ بہ آں کہ تو می گوئی یا بہ آں کہ من می گویم؟؟؟

اہم ترین بات یہ کہ اگر کہیں کسی اسلامی عمارت میں صنم بردار خشت وسنگ نکل آجائیں تو اس سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ مسلم حکمرانوں نے بے تحاشا اور بے وجہ اپنی ہندو رعایا کی مندریں توڑ ڈالیں اور ان کے مال میٹریل اپنے گھر اٹھا لائے؟ ایسا بھی تو ہوسکتا ہے اور بالکل ہوسکتا ہے کہ جس طرح سے گردش زمانہ نے چھوٹی سونا مسجد، گور اور دوسری ان

ہیں مگر گردش زمانہ نے مغربی دیوار کے ایک حصے کو زمین بوس کر دیا اور یہ تصویریں بے نقاب ہوگئیں۔[1]

شہ نشیں برائے خواتین:

مسجد کے شمال مغربی گوشے میں خواتین کی نشست کیلئے ایک سنگین شہ نشیں ہے، اس کا کچھ حصہ ٹوٹ چکا ہے اور گمشدہ پتھروں میں سے ایک، جو ۶ رفٹ ۳ رانچ لمبا اور ۲ رفٹ چوڑا ہے، شاہ نعمت اللہ کی درگاہ میں پڑا ہوا ہے۔ اگر یہ پتھر واپس لایا جائے تو مکمل طور پر خالی جگہ کو بھر دے گا۔

گنت تعمیرات اسلامی کو نقصان پہنچایا، اُسی طرح کوئی مندر بھی گردش زمانہ کی نذر ہوگئی ہو اور اُن کے خشت و سنگ وغیرہ بیکار پڑے رہنے کی وجہ سے وہاں سے اٹھوا لئے گئے ہوں، اگر ایسا ہے (جس کا قوی تر امکان ہے) تو پھر مسلم حکمرانوں پر انتہا پسندی، غیر رواداری اور انہدام مندر کی الزام تراشی کا کیا مطلب؟؟

یہاں سوچنے والی بات یہ بھی ہے کہ کریٹن نے مسلم حکمرانوں پر اتنا بڑا الزام بغیر کسی حوالے کے صرف اپنے خیال و گمان کی بنیاد پر عائد کر دیا جو علی وجہ الاطلاق تاریخ کے اصولوں پر جبر اور زیر بحث حکمرانوں کے ساتھ کھلی ناانصافی ہے۔۔۔۔۔ یا پھر بعض حد تک خان صاحب کی بات سے بھی اتفاق کیا جا سکتا ہے کہ جب مسلم فاتحین اپنی فتح گور کے بعد قلعہ گور میں داخل ہوئے ہوں گے تو وہاں اب مسلم بود و باش کی وجہ سے مندروں کی نہیں بلکہ مسجدوں کی ضرورت پیدا ہوگئی ہوگی چنانچہ قدیم مندروں کے اب وہاں غیر ضروری ہوجانے اور نئی طرح کی ضرورتیں پیدا ہوجانے کی وجہ سے کسی حکمراں نے ان مندروں کو وہاں سے ہٹانے یا منتقل کرنے کا حکم دیا ہو، سو اب قلعے میں ماقبل کی مندروں کے مواد مسالے بیکار پڑے رہنے کی وجہ سے وہاں سے اٹھوا کر دگر تعمیرات میں لگا دیئے گئے ہوں۔ اگر ایسا ہے تو اس صورت میں بھی مسلم حکمرانوں پر نفرت انگیزی یا بلا وجہ انہدام مندر کا الزام عائد نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ بر تسلیم مفروضہ، ان کا یہ عمل حالات کے تحت رونما ہونے والی ضرورتوں کا جبری اور فطری تقاضا تھا، نہ کہ کسی خاص طبقہ یا سماج کے خلاف ان کی عدم رواداری کا نمونہ۔ (میزان)

1۔ دوسری طرف منریق کا بیان ہے کہ اس نے ۱۶۴۱ء کو گور کے بعض سنگین تالابوں میں بتوں کے ایسے مجسمے دیکھے جو تراشیدہ اور عجیب و غریب پتھروں سے گھیری ہوئی طاقوں میں رکھے ہوئے تھے، (یہاں) یہ بات ضرور ممکن ہے کہ دور ستم رانی کے علاوہ گور کے مسلم حکمرانوں نے اپنے دار الحکومت میں بتوں اور ہندو مندروں کو قائم رکھنے کی اجازت دے دی ہوگی۔ (ایچ، ای، اسٹیپلٹن)

چھوٹی سونا مسجد کے تئیں متفرق بیانات:

(ا) مغربی دیوار جب گرگئی تھی اُس وقت دیوار کی محرابوں کے محاذی پتھروں کو ہٹادیا گیا تھا۔ایسا خیال کیا جاتا ہے

﴿تصویر نمبر ۱۷﴾
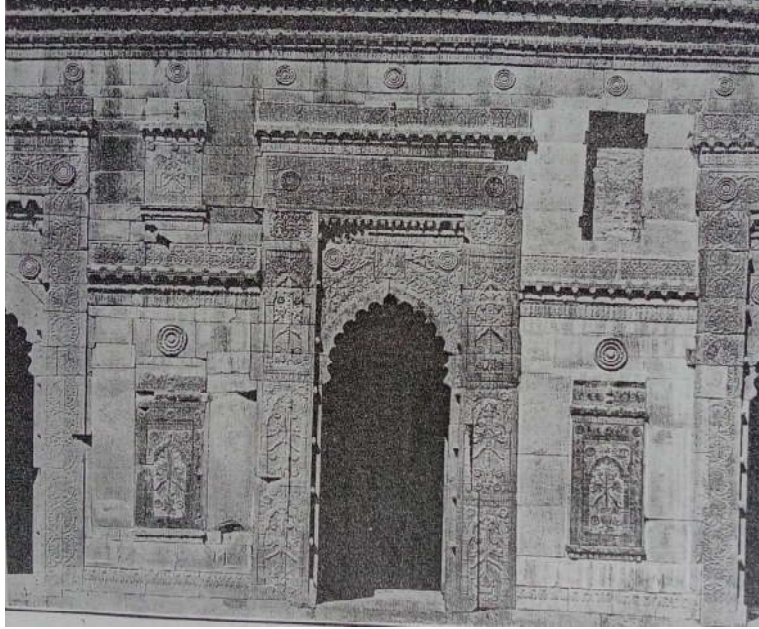
چھوٹی سونا مسجد، فیروز پور، گور کے گول دروازے پر تزئین کاری

کہ محرابوں میں سے ایک کا پورا ڈھانچہ انگلینڈ کے ایک میوزیم میں اب بھی موجود ہے۔

(ب) مسجد کے جانب مشرق شکستہ حالت میں ایک دروازہ موجود ہے۔شروع میں اس دروازہ کے اوپری حصے پر پتھر کاری کی گئی تھی مگر اب ساری سجاوٹ اور استر کاری ندارد ہے اور اندرونی حصہ ظاہر ہو چکا ہے۔کمپاؤنڈ کو تار کی چہار دیواری اور ایک آہنی دروازے کے ذریعے گھیر دیا گیا ہے۔

(ج) متوفی ڈاکٹر ٹی، بلوچ نے ۱۹۰۹ءعیسوی میں اس یادگار کے حفاظتی اقدامات کے بارے میں مندرجہ ذیل تبصرہ کیا ہے:

''اس مسجد میں نئے طور پر بنائے جانے والے کچھ گنبدوں کے سرمحراب کے اردگرد دوبارہ کیئے گئے'' ٹائل ورک'' سے مجھے بہت خوشی ہے، خصوصیت کے ساتھ اُس نئی خوشنما سنگین تختی کو دیکھ کر جو مرکزی محراب کے دائیں ہاتھ

عمارت کے بیرونی حصے پہ نصب کی گئی ہے۔اس کام کو بنارس کے ایک سنگ تراش، جس نے بائیں جانب نصب کی گئی خفیف سی ضرر رسیدہ مماثل لوحِ سنگ سیاہ کی نقل اتاری ہے، نے مکمل کیا ہے۔یہ کام بلاشبہ اتنا ہی اچھا ہے جتنا کہ کوئی قدیم کام ہوسکتا تھا اور اس سے یہ بات بھی مکمل طور پر عیاں ہوجاتی ہے کہ اگر ہمارے پاس ان قدیم مساجد میں سے کسی کا بھی نقشہ تمام ضروری تفصیلات کے ساتھ موجود ہوتا تو اُسے اُس کی اصلی شکل وصورت کی طرف لوٹانے کے عمل میں صرف لاگت کا سوال رہ جاتا''۔

(د) دوقبریں: مسجد سے تھوڑی ہی دوری پر ایک اونچے چبوترے، جس کی لمبائی ۱۵رفٹ اور چوڑائی ساڑھے ۱۰رفٹ ہے، کے اوپر دو قبریں موجود ہیں۔دونوں ہی قبروں کے سر یا شمالی سرے کی طرف کتبے نصب ہیں مگر ان کتبوں پر صرف اسم الٰہی اور کلمے لکھے ہوئے ہیں۔ اس بارے میں کریٹن کا خیال یہ ہے کہ یہ دونوں قبریں امکانی طور پر بانی (مسجد) اور اس کے کسی رشتہ دار کی ہیں''۔(کیونگھم) تاہم مقامی لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ یہ دونوں قبریں فرضی ہیں اور یہ کہ یہاں پر بانی نے اپنی دولت ذخیرہ کر رکھی تھی۔

﴿یادگار نمبر۲۰﴾ مقبرہ شاہ نعمت اللہ

یہ مقبرہ شمال جنوب سمتوں میں بہنے والے وسیع تر تالاب کے مغربی کنارے اور چھوٹی چھونا مسجد کے شمال مغرب میں تقریباً نصف میل کی دوری پر واقع ہے۔

یہ ایک عمدہ قسم کی واحد گنبد والی عمارت ہے جو شیخ کی قبر کے اوپر بنی ہے اور یہ عمارت مبینہ طور پر ۱۵رسوروپے سالانہ آمدنی والی ایک زمین کے ساتھ وقف کی گئی ہے۔

منشی الٰہی بخش کا بیان ہے کہ: شاہ نعمت اللہ صوبہ دہلی میں واقع کرنول کے باشندے اور ایک عظیم سیاح تھے۔اپنی سیاحت ہی کے سلسلے میں وہ راج محل آئے جہاں شاہ شجاع نے ان کی کافی زیادہ پذیرائی کی۔بالآخر وہ گور کی ایک جگہ فیروز پور میں رہائش پذیر ہوگئے جہاں ایک روایت کے مطابق ۱۰۷۵ھ مطابق ۱۶۶۴ء میں اور ایک روایت کے مطابق ۱۰۸۰ھ مطابق ۱۶۶۹ء میں انہوں نے وفات پائی''۔ان کی وفات کا فارسی مادۂ تاریخ ''نعمت اللہ بحرالعلوم مدام''۔۔نعمت اللہ ہمیشہ کے لئے ایک بحرالعلوم ہیں۔۔۔پیش کیا گیا ہے۔ان فارسی حروف کا عددی وصف ۱۰۷۵ھ سے کامل طور پر مطابقت رکھتا ہے۔

شاہ نعمت اللہ ایک عابد وزاہد مسلمان تھے۔کہتے ہیں کہ جب ٹانڈہ میں ہوئی ایک جنگ کے بعد شریف خان کو اس

کے چند زخمی رفیقوں کے ساتھ شاہ شجاع کے سامنے لایا گیا تاکہ ان سب کی گردنیں اڑا دی جائیں تو شیخ نے شاہ شجاع کے سامنے ان کو نہ مارنے کی خواہش ظاہر کی اور ان سب کی جانیں بچائیں۔اسی درگاہ میں حسین شاہ کا کتبہ والا دروازہ مؤرخہ ۹۱۸ھ مطابق ۱۵۱۲ء جس کا حوالہ یادگار نمبر ۹/ میں پیش کیا گیا ہے، موجود ہے۔ممکنہ طور پر اسی آستانہ کے احاطے میں ''سیر المتأخرین'' کے مصنف نے ایک دوسرا کتبہ بھی پایا تھا جس میں مؤرخہ ۱۰/ ذی الحجہ ۸۷۰ھ مطابق ۱۴۶۵ء کو رکن الدین باربک شاہ کے دور حکومت میں خان جہاں کے ذریعے ایک دروازہ کی تعمیر کا ریکارڈ ہے مگر اب غلطی سے یہ کتبہ میر غلام حسین خان کی مبینہ قبر پر لگا دیا گیا ہے۔شیخ کا مقبرہ ایک باقاعدہ بارہ دواری ہے کیونکہ یہ ایک مربع شکل کی عمارت ہے جس کے ہر ایک فیس میں تین تین دروازے ہیں۔ ہر چہار جانب (یہ عمارت) ۴۹/ فٹ وسیع ہے، ساتھ ہی ایک داخلی حجرہ ہے جو ساڑھے ۲۱/ مربع فٹ وسعت پر مشتمل ہے (اور یہی حجرہ) حقیقی مقبرہ کو محیط ہے۔
(رپورٹ، از: کیوننگھم۔ص:۷۶)

درگاہ سے متصل جامع مسجد:

درگاہ کے جنوب مغرب میں ایک تین گنبدوں والی مسجد واقع ہے، یہ اچھی حالت میں ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ مسجد شیخ نے تعمیر کرائی تھی، مسجد اور مقبرہ دونوں ہی مسلمانوں کے درمیان کافی معروف ہیں اور وہ وہاں ادائے نماز (اور زیارت وغیرہ) کی غرض سے کافی تعداد میں آتے رہتے ہیں۔

تہ خانہ یا موسم گرما کی عمارت:

یہ ایک اینٹوں سے بنی عمارت ہے جو ''وسیع تر تالاب'' کے مغربی کنارے اور جامع مسجد، فیروز پور کی جنوبی جہت کے بالکل بیچوں بیچ واقع ہے۔کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ دو منزلہ عمارت شاہ شجاع نے شاہ نعمت اللہ کے لئے تعمیر کرائی تھی تھی۔یہ عمارت شمال سے جنوب تک ۱۱۶/ فٹ لمبی اور ۳۸/ فٹ چوڑی ہے۔کئی سارے کمرے ہیں اور ساتھ ہی دونوں اطراف برآمدے بنائے گئے ہیں تاہم یہ برآمدے اس وقت کافی خستہ حالت میں ہیں۔چھت بالکل کھلی مسطح ہے۔وسطی حجرہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہاں شاہ شجاع بیٹھا کرتا تھا۔گور میں یہ واحد ایسی عمارت ہے جس کے چوبی شہتیروں کو انجمادی مواد (سیمنٹ وغیرہ) کے ذریعے مضبوط کیا گیا ہے۔یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جب شاہ شجاع اپنے مرشد شاہ نعمت اللہ کی زیارت کے لئے فیروز پور آیا تھا تو اس کے عارضی قیام کے لئے یہ عمارت بنائی گئی تھی۔ بڑے تالاب کے سمت مخالف سے جب اس عمارت کو دیکھا جائے تو یہ عمارت بڑی خوشنما معلوم ہوتی ہے مگر اب، کہتے ہیں

کہ، ہرسال برسات کے موسم میں خطہ میں شدید قسم کے بخار شروع ہو جانے کی وجہ سے عمارت کو مکمل طور پر ویران چھوڑ دیا گیا ہے۔

شہنشاہ اورنگزیب کی جانب سے شاہ نعمت اللہ فیروز پوری کی نسبت ایک فرمان کا خلاصہ:

''سادات، جو براہ راست رسول (اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) سے مربوط ہیں، کے شوق وخواہش کی تکمیل اورعزت واحترام کی گہری جڑیں سلطان (اورنگزیب) کے بے لوث اور صالح دماغ میں پیوستہ ہیں۔اس مبارک عہد کے دوران شاہی دادودہش کی ایک نظیر مرجع سادات، ماوائے سعادات، ملجائے رازدار حقیقت ومعرفت، شاہ نعمت اللہ کی نسبت پیش کی جاتی ہے۔۔مسکن نوازش وعنایت کی جانب سے ایک معزز فرمان اس طور پر جاری کیا گیا ہے کہ پرگنہ درسرک، سرکار جنت آباد، صوبہ بنگال کی جانب سے کل پانچ ہزار رقم اور فصل خریف کے شروعاتی مرحلے کا 'محاصل' شاہ نعمت اللہ کو ان کی اور ان کے اولاد واخلاف کی گرز بسر کیلئے عطا کر دیا جائے تا کہ وہ آرام وآسائش کے ساتھ اپنی زندگی گزار سکیں اور شہنشاہ کی روزافزوں ترقی کیلئے دعا کرتے رہیں۔

یہ شاہی فرمان تمام ریاستی منصب داروں کی جانب سے مستقل خیال کیا جائے اور مرقومہ ہدایات پر عمل کرتے ہوئے مذکورہ بالا پرگنہ کی طرف سے پانچ ہزار رقم کا مفاد انہیں ان کی ضرورت کے لئے دیا جائے۔بالا رقم مرحوم سلطان (شاہ جہاں) کے ایک سابق فرمان کی رو سے مقدس ہستی کو دی جانے والی مدد معاش پر ایک اضافہ خیال کی جائے اور جو کچھ اس فرمان میں مذکور نہیں ہے اُسے مسترد تصور کیا جائے''۔[1]

1۔اصلی فرمان کو تو دریافت نہیں کیا جا سکا تاہم اس فرمان کی دونوں مصدقہ کاپیاں۔۔۔۔ایک کاپی جو ربیع الثانی ۱۰۷۷ھ مطابق اکتوبر ۱۶۶۶ء میں شہنشاہ کورپورٹ کے طور پر بھیجی گئی تھی، اور شاہ جہاں کے سابق فرمان کی کاپی جس پر ۱۶/ربیع الثانی ۱۰۴۳ھ مطابق ۵/اکتوبر ۱۶۳۳ء کی تاریخ درج ہے۔۔۔مالدہ کلکٹریٹ میں موجود ہیں۔سابق فرمان کے اندر فیروزپور، گور میں شاہ نعمت اللہ کے ذریعے کھیتی باڑی کیلئے لی گئی ۴۰۰/بیگھہ زمین پر کسی بھی قسم کا خراج عائد کرنے سے منع کیا گیا ہے، اور انہی زمینوں کی پیداوار کے ذریعے وہ ایک مسجد اور ایک خانقاہ کے اخراجات اٹھاتے تھے جو انہوں نے یہاں پر قائم کی تھیں۔دونوں فرمانوں کی تاریخ سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ شیخ نے فیروزپور میں کم از کم ۳۳/سال قیام کیا تھا اور یہ کہ ان کی وفات کے تئیں ''ترسیم وقت'' کی مماثل تاریخ کی بنسبت ۱۰۸۰ھ کی تاریخ اغلب طور پر زیادہ صحیح ہے۔(ایچ،ای،اسٹیپلٹن)

﴿یادگار نمبر۲۱﴾

گُن مانت مسجد

(امکانی تاریخ تعمیر: ۸۸۹ھ مطابق ۱۴۸۴ء)

جنرل کیوننگھم کی تصریحات۔۔۔۔۔۱۸۷۹ء

اس قدیم تباہ حال مسجد کو گور کے عہدِ عتیق پر لکھنے والوں میں سے کسی نے بھی نوٹس نہیں کیا ہے، اس کی وجہ غالبًا یہ ہے کہ یہ مسجد اب پوری طرح کھنڈر میں بدل گئی ہے۔ یہ مسجد قلعے کے جنوب میں صرف نصف میل اور لٹّن مسجد کے مغرب میں نصف میل سے بھی کم فاصلے کی دوری پر، بھاگیرتھی یا قدیم گنگا کے کنارے، مادھی پور گاؤں کے نزدیک واقع ہے۔

گور

۱۔ جلال الدین فتح شاہ۔۔۔گُن مانت مسجد، مادھی پور، گور۔۔۔ ۸۸۹ ہجری مطابق ۱۴۸۴ عیسوی

۲۔ باربک شاہ۔۔۔ دیوتلہ۔۔۔ ۸۶۸ ہجری مطابق ۶۴-۱۴۶۳ عیسوی
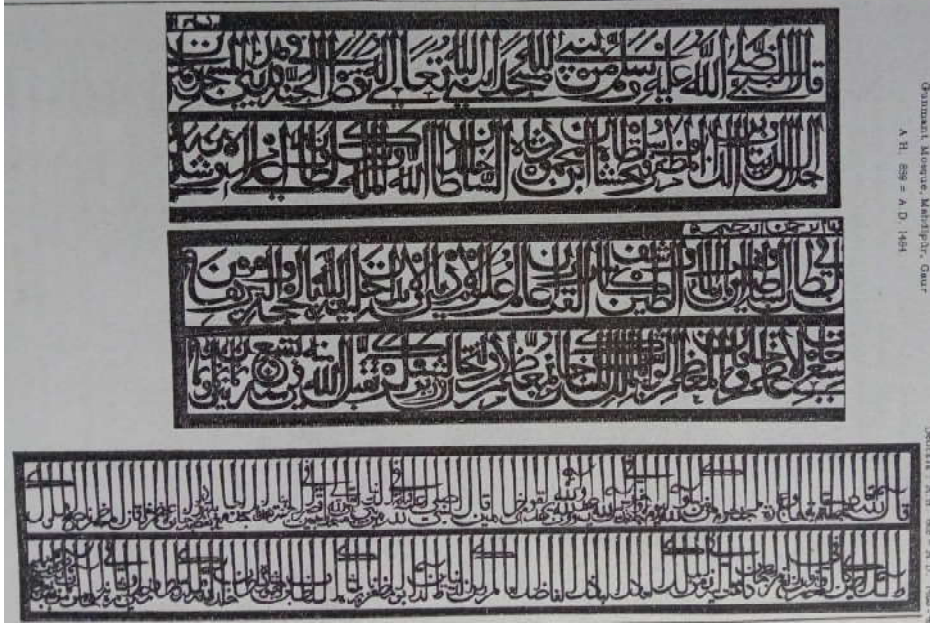
مسٹر کِنگ نے بہت ہی مختصر انداز میں اس مسجد کا یوں ذکر کیا ہے (ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ۱۸۷۵ء، ص: ۹۴): گُن مانت مسجد پتھروں سے بنی بغیر کتبے کی ایک عمارت ہے''۔۔اِن دنوں فتح شاہ کا ایک لمبا کتبہ مؤرخہ ۸۸۹ھ

مادھی پور میں پھونس کی چھت والی ایک عارضی مسجد کے باہر پڑا ہوا ہے۔اس کتبے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ تقریباً ۲۰/سال پہلے ایک ہندو شخص نے گاؤں کے جنوب میں واقع تباہ حال مسجد سے یہ کتبہ اٹھالایا تھا،مگر چونکہ اُس کے بعد جلد ہی اُس کا بیٹا مر گیا اس لئے اس آدمی نے لائے ہوئے پتھر کو اپ شگون خیال کیا اور اس سے پیچھا چھڑاتے ہوئے اپنے گاؤں کی چھپر والی مسجد میں اسے جمع کر دیا۔سو غالب گمان یہ ہے کہ یہ کتبہ ممکنہ طور پر 'گن مانت مسجد' سے تعلق رکھتا ہوگا کیونکہ یہ کتبہ جہاں ملا تھا وہ جگہ ''گن مانت مسجد'' سے دور نہیں ہے۔

یہ مسجد چوں کہ ندی کنارے واقع ہے اس لئے برسات کے موسم میں چوروں کے لئے یہاں تک پہنچنا آسان ہوگیا، چنانچہ عمارت کا نصف حصہ مرشد آباد اور دیگر مقامات کی طرف (یہ مال غنیمت لوٹنے والے) اٹھالے گئے۔ محرابوں کی اٹھان کے اوپر تک تمام زیریں حصے اندر کی طرف چنے گئے پتھروں اور ناہموار بلاکس یا بولڈرز کے ذریعے بنائے گئے تھے جبکہ ان کی ظاہری سطح تراش دی گئی تھی۔محراب اور گنبد سب کے سب اینٹوں کے تھے۔

اس مسجد کا زمینی نقشہ پنڈوہ کی پرشکوہ سونا مسجد کے مماثل اور گور کی تمام مسجدوں سے یکسر مختلف ہے۔اس کا مرکزی کمرہ ۵۱/فٹ لمبا اور ۱۶/فٹ ۱۰/انچ چوڑا ہے جو محاذی دیوار سے عقبی دیوار تک پھیلا ہوا ہے۔یہ ایک دھاری دار گنبد سے ڈھکا ہوا ہے جس کے سرے نوک دار ہیں۔عقبی دیوار میں محرابوں کے اوپر کافی بلندی پر ایک دریچہ ہے۔ ہر ایک جانب تین بغلی راستے ہیں، ساتھ ہی سامنے چار دروازے ہیں، اس طرح ہر ایک سائڈ میں بارہ اسکوائرس ہیں جو اینٹوں سے بنے نیم کروی شکل کے گنبدوں سے ڈھکے ہوئے ہیں اور یہ گنبد ۱/مربع فٹ ساڑھے ۷/انچ سنگین ستونوں پر قائم ہیں۔[1] چاروں وسطی ستون جن پر گنبدی چھت قائم ہے، ہشت پہلو ہیں اور ان کی بنیادیں ساڑھے

1۔مرکزی حصے کی شمالی جہت کے ۹/گنبد گر چکے ہیں مگر دیواریں قائم ہیں۔ایسا خیال کیا جاتا ہے کہ ''ادینہ مسجد'' ہی کی طرح یہاں بھی مسجد کے شمالی حصے میں خواتین کیلئے ایک شہ نشیں تھی۔زاغ بندی کے زیبائشی پتھروں کو، جو شہ نشیں کو سہارا دیتے تھے، انگلش بازار کے مجوزہ مقامی میوزیم کیلئے یہاں سے جمع کر لیا گیا ہے۔یہ سارے پتھر اب (۱۹۳۰ء) گومتی گیٹ میوزیم میں منتقل کر دیئے گئے ہیں۔خان صاحب نے اپنے اصل متن میں عمارت کی لمبائی کی اصلاح ۱۵۸/فٹ کے طور پر کی ہے اور جو خاکہ کیونگھم نے پیش کیا ہے وہ قطعی طور پر غلط ہے، کیونکہ جب میری گزارش پر مقامی ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولز نے عمارت کی پیمائش کی تو مندرجہ ذیل نتیجہ برآمد ہوا:

طول۔۔۔۔۔باہر کی طرف:۱۵۷/فٹ۔اندر کی طرف:۱۴۲/فٹ ۹/انچ۔

۴؍مربع فٹ محیط ہیں۔ مسجد کے ہر ایک فیس میں ایک چوکور ستون ہے جو بغلی راہوں کے چھوٹے ستونوں سے میل

عرض۔۔۔۔۔باہر کی طرف:۵۹؍فٹ۔ اندر کی طرف:۴۳؍فٹ ۹؍انچ۔

کیوننگھم کے ذکر کردہ اور اس کے رپورٹ کی پلیٹ ۲۳؍میں منقول کتبہ، جو بہت خوبصورت ہے مگر سرنامہ یوسف شاہ کے تحت وہ پوشیدہ ہے، کو میں یہاں پیش کر رہا ہوں۔ چونکہ یہ کتبہ واضح طور پر نہیں پڑھا جا رہا تھا اور گور یا غالبًا شرقی بنگال، جہاں جلال الدین فتح شاہ کی حکومت اور علمیت کے تئیں کئی کتبات دریافت ہوئے ہیں، کے جغرافیہ کے بارے میں بکثرت دلچسپ اشارات پر مشتمل تھا (بلوچ مین، جیوگرافی اینڈ ہسٹوری آف بنگال۔ جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ۱۸۷۳ء، ص:۲۸۲؍تا۲۸۶)اس لئے میں یہاں کتبے کا متن اور ترجمہ نیچے پیش کر رہا ہوں:

قال النبی صلی الله علیه وسلم من بنی مسجدًا لله بنی الله تعالیٰ له قصرًا فی الجنة قد بنی هذا المسجد فی زمان سلطان السلاطین قهرمان فی الماء والطین کاشف اسرار القرآن عالم علوم الادیان والابدان خلیفة الله بالحجة والبرهان جلال الدنیا والدین ابو المظفر فتحشاه السلطان بن محمود شاه السلطان خلد الله ملکه وسلطانه واعلی امره وشانه خان الاعظم و خاقان المعظم الواثق بالملک المنان خان المعظم دولتخان وزیر لشکر تقبل الله منه فی سنة تسع و ثمانین و ثمانمأة.

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے اللہ (کی رضا) کے لئے ایک مسجد بنائی، اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت میں ایک محل بنائے گا۔ شاہوں کے شاہ، جہان آب وگل کے دلیر سپاہی، قرآں کے رازہائے سربستہ کو آشکارا کرنے والے، علوم مذاہب واجسام کے واقف کار، روشن دلیل اور قطعی ثبوت کے ذریعے نائب خدا، جلال الدنیا والدین، ابو المظفر، سلطان فتح شاہ ابن سلطان محمود شاہ، اللہ اُس کے اقتدار اور قوت کو ہمیشہ قائم رکھے اور اُس کی شان وحال کو بلند فرمائے، کے عہد میں عالی مقام خان، انعام نواز بادشاہ پر بھروسہ کرنے والے وزیر لشکر، خان اعظم وخاقان معظم دولت خان، اللہ اُس کے عمل کو قبول فرمائے، نے ۸۸۹ھ (مطابق ۱۴۸۴ء) میں اس مسجد کی تعمیر کرائی۔

جنرل کیوننگھم کی تختی (جس میں جلال الدین کے بڑے بھائی باربک شاہ کے نام کا بھی ایک کتبہ مؤرخہ ۸۶۸ ہجری از دیوتلہ موجود ہے۔۔ آپ اُس کتبے کو اصل متن کے صفحہ نمبر ۱۶۹؍میں اور اِس ترجمہ کے اندر زیر عنوان 'دیوتلہ یا قصبہ تبریز آباد' ملاحظہ فرما سکتے ہیں) پلیٹ نمبر ۴؍کے طور پر نقل کر دی گئی ہے۔ (ایچ، ای، اسٹیپلٹن)

کھا تا ہے۔ عقبی اور جانبی دیواروں کی بالائی سطحیں پوری طرح اتر چکی ہیں مگر جب اس موجودہ مخدوش حالت میں بھی دیواروں کی پیائش کی جاتی ہے تو یہ ۷؍فٹ سے کچھ زیادہ ہی موٹی نکلتی ہیں، فی الواقع یہ دیواریں ۸؍فٹ سے کسی بھی طرح کم موٹی نہ رہی ہوں گی ۔۔۔ مسجد بیرونی اطراف میں ۱۴۰؍فٹ ۹؍انچ لمبی اور ۵۹؍فٹ چوڑی ہے۔ گنبدی چھت کے اب تک موجود ایک حصے سے ظاہر ہوتا ہے کہ پورے اگلے حصے کے ساتھ مسجد کا ایک کوریڈور بھی تھا، یہ کوریڈور چوڑائی کو تقریباً ۱۸؍فٹ تک بڑھا دیتا ہے، اس طرح مسجد کی کل چوڑائی ۷۷؍فٹ سے بھی زیادہ ہے جو وسیع ترسونا مسجد کے بالکل برابر ہے۔

(یادگار نمبر۲۲﴾ چھوٹی ساگر دیگھی اور بھیٹا چاند سوداگر (عرف: بیل باڑی مدرسہ)

گن مانت مسجد کے مغرب میں، تانتی پارہ مسجد کے دوسری طرف اور نواب گنج روڈ کے مشرق میں تقریباً اتنے ہی فاصلے پر شمال جنوب سمتوں میں بہنے والا نصف میل لمبا ایک عظیم تالاب موجود ہے جسے چھوٹی ساگر دیگھی کہتے ہیں۔ (لفظ ''چھوٹی''، گور کے شمال مغربی حصے میں واقع اصلی 'ساگر دیگھی' سے ممتاز کرنے کے لئے کہا جاتا ہے۔ آنے والے یادگار نمبر ۲۷؍ میں ملاحظہ فرمائیں) اس تالاب کے شمالی کنارے پر ایک لمبی چوڑی عمارت کے باقی ماندہ آثار دیکھے جاسکتے ہیں جو سیاہ اور خاکستری رنگ کے بہت سے صیقل کئے گئے ستونوں پر مشتمل ہے۔ اگرچہ مقامی لوگ اسے بھیٹا چاند سوداگر کہتے ہیں تاہم جنرل کیوننگھم اپنے نقشۂ گور میں اس محل وقوع کو 'بیل باڑی مدرسہ'' کے طور پر حوالہ دینے میں زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ اگر ملبے کو ہٹا دیا جائے تو اندر سے عمارت کے آثار ہی برآمد ہوں گے اور ایک پلان تیار کیا جاسکے گا۔[1]

﴿یادگار نمبر۲۳﴾ کمبھیر پیر تالاب

قدم رسول کے شمال مشرق میں تقریباً ایک میل کی دوری پر ایک پختہ مقبرہ ہے۔ متصل ہی ایک لمبا چوڑا تالاب ہے جس کا پانی بہت ہی صاف اور مگرمچھوں سے بھرا ہوا ہے۔ زمانہ قدیم ہی سے یہاں کے لوگوں کا ایسا اعتقاد رہا ہے کہ یہ سارے جانور شیخ کے خدمتگار ہیں اور کچھ لوگوں (خصوصیت کے ساتھ بوڑھی عورتوں) کا یہ عقیدہ ہے کہ ان میں بڑا والا مگرمچھ خود پیر صاحب ہیں۔ جب کبھی بکری یا مرغے کا گوشت نذر کے طور پر پیش کیا جاتا ہے تو یہاں کا خادم ہڈیوں

1۔ اس مدرسہ سے یا گور کے کسی دوسرے مدرسہ (مثلاً درس باڑی، یادگار نمبر ۱۸) سے متعلق ایک کتبہ اصلی متن کے صفحہ نمبر ۱۵۷؍تا ۱۵۸؍اور اس ترجمہ کے اندر زیر عنوان ''فیروز پور مسجد میں نصب کیا گیا کتبہ'' پیش کر دیا گیا ہے۔

اور چھڑا کو ایک پڈا (Pudda۔۔یاپنڈا، مطلب گٹھری) میں اکٹھا کرتا ہے اور اُسے تالاب میں پھینک دیتا ہے، اس وقت اگر باباشاہ خضر پڈا قبول کرنے پر راضی ہوجاتے ہیں تو ایک بڑا مگرمچھ پانی کے اندر سے باہر کنارے پر آتا ہے اور پڈا لیکر واپس چلا جاتا ہے۔کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ مگرمچھ نہیں آتا یا آتا ہے مگر منت سماجت کے باوجود پڈا نہیں لے جاتا تو نذر پیش کرنے والا ایسا خیال کرتا ہے کہ اس کی ہی کسی غلطی کی وجہ سے نذر قبول نہیں کیا گیا۔[1] یہ بات قابل ذکر ہے کہ پڈا پیش کرنے کی رسم اب زوال پذیر ہے اور یہ رسم اب اتنے جوش وخروش کے ساتھ ادا نہیں کی جاتی جتنے کہ زمانہ ماضی میں ادا کی جاتی تھی۔[2]

1۔میرا ایسا ماننا ہے کہ یہ سب کچھ کھلی توہم پرستی اور نرے جاہلوں کی ایجاد اور عمل آوری ہے۔۔بھلا کوئی پیر صاحب مگرمچھوں کا سردار بن کر پانی میں کیوں رہنے لگے؟ اچھا! آپ کے بقول رہنے لگے تو لگے لیکن یہ بات کہ آپ تو مرغ مسلم اور بکرے کے لذیذ ڈشز انجوائے کریں اور بیچارے اپنے ''مگرمچھ والے پیر صاحب'' کو اپنی چوسی ہوئی ہڈیوں اور ناقابل خوردنی چھڑوں پر جبرا قناعت کروائیں، کیا یہ بات مضحکہ خیز اور علی الاطلاق اللہ والوں کی شان میں توہین نہیں ہے؟ ممکن ہے کہ وہاں کسی پیر صاحب کی جائے چلہ یا قبر ہو اور ان سے پہلے یا بعد میں کسی طرح متصل تالاب میں مگرمچھ پہنچ گئے ہوں، برسات کے موسم میں تو یوں بھی چاروں طرف پانی بھر جاتا ہے اور کئی بڑی ندیاں بھی زمانہ ماضی میں اسی خطہ سے ہوکر بہتی تھیں، اب ایسے میں مگرمچھوں یا گھڑیالوں کا اس تالاب تک پہنچ جانا کوئی حیرت کی بات نہیں، پھر آگے چل کر جاہل اور ضعیف الاعتقاد لوگوں نے اس تالاب میں مگرمچھوں کی موجودگی اور متصل مقبرہ کو دیکھ کر سوچا ہو کہ یہاں بھلا مگرمچھ کیسے پہنچ گئے جبکہ علاقہ کے دیگر تالابوں، جھیلوں اور نالوں میں مگرمچھ کا کوئی نام ونشان ہی نہیں؟ سو ہو نہ ہو، یہ ضرور قبر والے پیر صاحب اور اُن کے وفا شعار خدمت گار ہیں، اس طرح امکانی طور پر ایک خود ساختہ ریت کو ضعیف الاعتقاد لوگوں نے اپنے اعتقاد کا جبری حصہ بنالیا ہو۔خود اِس ہیچمداں مترجم نے اس دیار میں بچپن سے لیکر جوانی تک مختلف اوقات میں تقریباً دس سال گزارے ہیں اور انتہائی معذرت کے ساتھ کہنا چاہوں گا کہ اپنے گزارے ہوئے اوقات کے پختہ شعور والے دنوں میں، میں نے یہاں کے ان پڑھ تو ان پڑھ، خود کئی سارے اونچے تعلیم یافتہ لوگوں کو بھی کافی حد تک ضعیف الاعتقاد پایا ہے۔اس لئے مذکورہ واقعہ کے ''ضعیف الاعتقادی کا ایک شاہکار نمونہ'' ہونے پر کم از کم مجھے تو کوئی حیرانی نہیں ہے۔(میزان)

2۔قدیم دورِ اسلامی سے یہ ایک رسم ہے۔مشرق میں خضر پانی اور ندیوں کا خدا ہے (العیاذ باللہ، ہمارا عقیدہ تو یہ

﴿یادگار نمبر۲۴﴾ پیاس باڑی تالاب

ہمارے سفر کی واپسی پر شمال کی جانب آگے بڑھتے ہوئے مرکزی سڑک کے مشرقی جانب وہ جگہ جہاں سے بارہ دواری (وسیع تر سونا مسجد) کی طرف جانے والی ایک ضمنی سڑک نکلتی ہے اور جس کے مغرب میں داخل دروازہ واقع ہے ،اُسی مقام کے قریب آٹھویں سنگ میل کے پاس ''چھوٹی ساگر دیگھی'' سے بس تھوڑا ہی چھوٹا ایک لمبا چوڑا تالاب موجود ہے جو''پیاس باڑی دیگھی'' کے نام سے معروف ہے۔

حالیہ دنوں یہاں اِس تالاب کے مغربی کنارے پر ڈسٹرکٹ بورڈ کی جانب سے ایک بنگلہ تعمیر کیا گیا ہے۔ روایت یہ بیان کرتی ہے کہ یہ تالاب پہلے کافی آلودہ اور صحت کے لئے نقصان دہ تھا اور یہ کہ سزا یافتہ مجرموں کو اس تالاب کے پانی کے علاوہ کوئی بھی دوسری چیز پینے کی اجازت نہ تھی ،اس طرح وہ مجرمین خود ہی ہلاک ہو جاتے تھے۔ ابوالفضل ہمیں بتاتا ہے کہ''دارالحکومت کی طرف سے سزا یافتہ مجرموں کو اس تالاب کے پانی کے ماسوا کوئی بھی دوسری چیز پینے کی اجازت نہ تھی مگر اکبر نے اِس عمل پر قدغن لگا دی''۔تاہم میجر فرینکلن موجودہ حالت میں اس تالاب کے پانی کو کافی عمدہ قرار دیتا ہے۔ یہ نام پیاس باڑی۔۔مطلب: مسکن تشنگی۔۔۔یقینی طور پر اس عمارت کی جانب منسوب

ہے کہ خضر علیہ السلام اللہ کے بندے ہیں،حوالہ:**فوجدا عبدا من عبادنا** ۔سورۃ الکھف،آیت:۶۵۔ایک قول کے مطابق وہ نبی ہیں اور ایک قول کے مطابق ولی ہیں، اکثر علماء نے قول آخر کو اختیار کیا ہے۔جلالین، در تفسیر آیت مذکورہ۔از: مترجم)مغرب میں انگلینڈ،ایس ٹی، جارج کا مربی شیخ ہے۔

پورے بنگال میں یہ نذر تالابوں اور ندیوں میں جمعرات کی شام کو پیش کی جاتی ہے مگر بھادو (اگسٹ یا ستمبر) کے آخری جمعرات کو، جبکہ سال کی بارش رخصت پذیر ہوتی ہے، یہ نذریں عابدہ عورتوں کے ذریعے کیلے کے پتوں یا کاغذ سے بنی زیبائشی کشتیوں میں روشنی کے ساتھ رکھ کر خدا کی تعظیم میں پانی کی سطح پر بہا دی جاتی ہیں۔اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ خدا ندیوں اور سمندروں میں سفر کرنے والے ان کے رشتہ داروں کی حفاظت فرمائے۔ ہمارے مصنف کی جانب سے پیش کردہ مگرمچھوں کو کھانا کھلانے کی تفصیلات قدرے تبدیلی کے ساتھ منشی الٰہی بخش سے ماخوذ ہیں اور بوچانن ہیملٹن کے ذریعے بیان کردمٹیاری کے ایک تالاب میں موجود دو مگرمچھوں کی عادات سے بھی بڑی حد تک میل کے دونوں بازو میں سطح آب سے لگ بھگ تین فٹ نیچے دو سنگین ہاتھی بنے ہوئے ہیں، اب ان ہاتھیوں کو یہاں بنانے کھاتی ہیں۔(ایچ،ای،اسٹیپلٹن)

ہے جس میں قیدیوں کو بند کر کے رکھا جاتا تھا۔تالاب کے مشرقی جانب اور بنگلہ کے نزدیک ایک پکی گھاٹ ہے، اس کا سبب کیا ہے؟ انہیں کس نے بنایا اور کیوں بنایا؟ یہ ساری باتیں اب تک نامعلوم ہیں۔

﴿یادگار نمبر ۲۵﴾ تمل ٹولہ، رام کلی

بارہ دواری مسجد اور پیاس باڑی بنگلہ کے مابین وسط راہ ایک چھوٹا سا گاؤں ہے جسے 'رام کلی' کہتے ہے۔ یہ گاؤں ضرور اس لائق ہے کہ بنگلہ میں قیام کرنے والے یا گاؤں کے پڑوس ہی میں واقع گور کی قدیم عمارتوں کے سیاح حضرات اِس گاؤں کا بھی دورہ کریں۔ حسین شاہ کی حکومت کے دوران بنگال کے عظیم مذہبی مبلغ چیتنیا نے اپنے ''برندہ بن'' کے سفر دوران جیٹھ (جون) کے مہینے میں یہاں آکر گاؤں کی ایک ایسی جگہ پر کچھ دنوں کیلئے قیام کیا تھا جو اب تمل ٹولہ کے نام سے مشہور ہے۔ تمل کا پیڑ، جس کے نیچے چیتنیا بیٹھا تھا، چار کیلی قدمبا پیڑوں کیدرمیان اب تک موجود ہے۔ کہتے ہیں اس مقام پر صرف حسین شاہ کے برہمن وزراء روپ اور سناتن ہی چیتنیا کے پیروکار نہیں بنے تھے بلکہ خود حسین شاہ نے بھی یہاں پر ماسٹر (چیتنیا) کے ساتھ ملاقات کی تھی۔

یہاں پر موجود پیڑ اب ایک چبوترہ کے ذریعے گھیر دیئے گئے ہیں اور حال ہی میں (۱۹۲۹ء) چیتنیا کی جائے استغراق کو ظاہر کرنے کیلئے ایک کندہ کی ہوئی تختی یہاں نصب کردی گئی ہے، یہاں ایک پتھر پر چیتنیا کا نقش پا بھی ہے۔ شمال جنوب سمتوں میں بہنے والے وسیع تر روپ ساگر' جو تقریباً ۸۰۰ رفٹ لمبا اور ۳۰۰ رفٹ چوڑا ہے اور جس کا ذکر ماقبل میں پہلے ہی آچکا ہے، کے علاوہ چبوترے کے شمال اور جنوب میں اور بھی چھوٹے چھوٹے چار تالاب موجود ہیں جنہیں سیاما کُنڈا، رادھا کنڈا، للیتا کنڈا اور بِسا کھا کنڈا کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ برندہ بن کے مماثل تالابوں کے نام پر یہ نام یہاں رکھے گئے ہیں، مقامی روایت یہ ہے کہ تمل ٹولہ میں موجود یہ چاروں تالاب روپ اور سناتن کے بھانجے یا بھتیجے جیو گوسوامی نے کھدوایا تھا۔

﴿یادگار نمبر ۲۶﴾ دوستون

نواب گنج روڈ کے ساتویں سنگ میل کے نزدیک، جانب مشرق، ایک درخت کے نیچے دو خوشنما سنگین ستون قائم ہیں۔ یہ دونوں ستون وسیع تر سونا مسجد کے سنگین ستونوں کے ساتھ بڑی حد تک میل کھاتے ہیں، سو اغلب طور پر انہیں کبھی اس مسجد کی لیڈیز گیلری کے جداگانہ حصے کے طور پر تشکیل دیا گیا ہے۔ تاہم مقامی روایت یہ ہے کہ یہ دونوں ستون ایک دیوان یا کسی بادشاہِ گور کے وزیر اعظم کے گھر سے تعلق رکھتے ہیں۔ ستونوں کی بنیادیں خاکی ورک کی مدد

سے مضبوط کر دی گئی ہیں اور کمپاؤنڈ کا اگلا حصہ تار کے جنگلے کے ذریعے بند کر دیا گیا ہے۔

﴿یادگار نمبر ۲۷﴾ وسیع تر ساگردیگھی

غیر معمولی طور پر بڑا یہ تالاب، گنگا سنان یا سعد اللہ پور میں گنگا کے سابق تلے پر واقع بھاگیرتھی کے سنان گھاٹ کے شمال میں اور انگلش بازار کے جنوب مغرب میں چھ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ تالاب لگ بھگ ایک میل لمبا اور نصف میل چوڑا ہے، صرف پانی کی معروضی پیمائش ۱۶۰۰ر گز لمبی اور ۸۰۰ر گز چوڑی ہے۔ شمال سے جنوب کی طرف لمبائی اِس بات کو ثابت کرتی ہے کہ تالاب کا نقطہ آغاز ہندوؤں سے ہے۔ تالاب میں ۶۰ر گز چوڑی والی چھ پکی گھاٹیں یا اترنے کی جگہ تھیں جن میں سے چار مشرقی اور مغربی کناروں میں روبرو تھیں، جبکہ شمالی وجنوبی کناروں میں ایک ایک گھاٹ موجود تھی۔ اب ان گھاٹوں کی تمیز فقط ان کی مواضع وقوع پر پڑی ہوئی اینٹوں اور پتھروں کی ڈھیر اور پانی کے کناروں کی طرف بتدریج اترتی ہوئی ڈھلانوں کو دیکھ کر ہی کی جاسکتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس عظیم کام کی شروعات بارہویں صدی عیسوی کے وسط میں لکھن سین کی حکومت کے دروان ہوئی تھی۔ [1] یہ تالاب تو اب گھاس پھونس سے بھرا ہوا ہے تاہم اب بھی ایک خوبصورت نظارہ دیکھنے کو ملتا ہے، جبکہ پانی اب تک پاک صاف اور میٹھا ہے۔

﴿یادگار نمبر ۲۸﴾ روضہ شیخ اخی سراج الدین عثمان

شیخ، جنہیں مقامی لوگ پیرانہ پیر (دراز عمر شیخ) یا پیران پیر (شیخ الشیوخ) [2] کہتے ہیں، کا روضہ ساگردیگھی کے شمال مغربی گوشے میں واقع ہے۔ یہ عمارت قدیم دیوارِ احاطہ، جو کسی مکان کی مداخلت کے بغیر مقبرے والی اصل عمارت کو محیط ہے، میں بنے تین خوشنما جھروکوں کی وجہ سے مشہور وممتاز ہے۔ مشرقی اور مغربی سمتوں میں یہ جھروکے ساڑھے ۷ر فٹ جبکہ داخلی دروازہ کے سمت مخالف جانب شمال میں ۶ر فٹ گہرے ہیں۔ سوراخ دار اور زیبائشی اینٹوں

1۔ رَونشاہ کی 'گور' صفحہ نمبر ۶ر کو ملاحظہ فرمائیں۔ کیونکہ تواریخ میں بہر حال یہ بھی مذکور ہے کہ ۹۱۶ھ مطابق ۱۵۱۰ء میں حسین شاہ نے بھی ایک عظیم تالاب کی کھدائی کرائی تھی۔ غالبًا اس زمانے میں ساگردیگھی کی ازسرنو کھدائی کی گئی تھی مگر چھوٹی ساگردیگھی کے شمال میں واقع ایک عمارت کے ساتھ حسین شاہ کے اغلب طور پر تعلق سے اس بات کو تقویت ملتی ہے کہ یہ آخر الذکر تالاب وہی ہے جس کا (کتب تواریخ میں) حوالہ پیش کیا گیا ہے۔ (ایچ، ای، اسٹیپلٹن)

1۔ اول الذکر لقب ہی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے، کیونکہ مجھ تک پہنچی اطلاعات کے مطابق ''پیران پیر'' کا لقب فقط مشہور شیخ عبدالقادر جیلانی (رضی اللہ تعالی عنہ) کے نام ہی کے ساتھ مربوط ہے۔ (ایچ، ای، اسٹیپلٹن)

کا کام، جس نے مشرقی جھروکہ کو بند کر دیا تھا، اب ندارد ہے اور مغربی جھروکہ بھی کافی زیادہ ضرر رسیدہ ہے۔ فقط شمالی حصہ ہی ایسا ہے جہاں پر کیا گیا اینٹوں کا کام کم وبیش اپنی اصلی حالت ہی میں باقی ہے۔

حالیہ دنوں (تقریباً ۱۹۰۰ء) دروازہ سمیت احاطہ بندی کی دیواروں اور شیخ کے مزار کے اوپر تعمیر شدہ سادہ سی عمارت کی مرمت کر دی گئی ہے اور موقع پر دریافت شدہ کتبوں میں سے دو کو روضہ شیخ پر مشتمل عمارت کے دروازے کے دائیں جانب اور دو کو بائیں جانب نصب کر دیا گیا ہے۔ دونوں اطراف کے کتبوں میں سے ایک ایک کتبہ سادہ طور پر قرآنی کلمات پر مشتمل ہے جبکہ دیگر دو کتبے مندرجہ ذیل ہیں:

بائیں ہاتھ والا کتبہ: قد بنی هذا الباب لروضة مخدوم شیخ اخی سراج الدین السلطان المعظم المکرم علاء الدنیا والدین ابو المظفر حسین شاہ السلطان بن سید اشرف الحسینی خلد الله ملکه وسلطانه سنة ست عشر و تسعمأة۔

ترجمہ: عظمت واحترام والے بادشاہ، علاء الدنیا والدین، ابوالمظفر سلطان حسین شاہ ابن سید اشرف الحسینی، اللہ اس کی مملکت اور سلطنت کو سدا قائم رکھے، نے ۹۱۶ھ (مطابق ۱۵۱۰ء) میں مخدوم شیخ اخی سراج الدین کے روضہ کے اس دروازہ کی تعمیر کرائی۔

دائیں ہاتھ والا کتبہ: بنی هذ االباب للروضة بامر السلطان المعظم المکرم سلطان بن السلطان ناصر الدنیا والدین ابو المظفر نصرتشاہ السلطان بن حسین شاہ السلطان خلد الله ملکه فی سنة احدی وثلثین وتسعمأة۔

ترجمہ: عظمت واحترام والے بادشاہ، شاہ ابن شاہ، ناصر الدنیا والدین، ابوالمظفر سلطان نصرت شاہ ابن سلطان حسین شاہ، اللہ اس کی مملکت کو ہمیشہ قائم رکھے، کے حکم سے ۹۳۱ھ (مطابق ۱۵۲۴ء) میں روضہ کے اس دروازہ کی تعمیر عمل میں آئی۔

جنرل کیوننگھم کے ذریعے ذکر کردہ (رپورٹ، ص:۷۱) ایک کتبہ جس میں ایک اور دروازہ کی تعمیر کا ریکارڈ ہے، اب نظروں سے غائب ہے مگر اسی جگہ سے متعلق ایک چوتھا کتبہ جس میں پینے کے پانی کی سپلائی کیلئے ایک سائبان کی تعمیر کا ریکارڈ ہے، انگلش بازار لے جا کر وہاں حالیہ دنوں تعمیر کی گئی ایک مسجد کے دروازہ کے اوپر نصب کر دیا گیا ہے۔ (آگے حیدر پور مسجد کی سرخی کے تحت ملاحظہ فرمائیں)

جنرل کیوننگھم نے اول الذکر کتبہ کی تاریخ کے پیش نظر بالکل صحیح نتیجہ اخذ کیا ہے کہ یہ روضہ حسین شاہ کے زمانے

میں پہلے ہی سے موجود تھا، مزید صوفیاء اسلام کی سوانح حیات پر مشتمل تحریروں میں موجود شیخ اخی سراج الدین (رحمۃ اللہ تعالی علیہ) کی سرگزشت سے بھی یہ بات یقینی ہوجاتی ہے۔ بلوچ مین کہتا ہے (جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ۱۸۷۳ء، ص: ۲۶۰) کہ: شیخ ایک لڑکے کی حیثیت سے دہلی کے (حضرت) نظام الدین اولیاء کے پاس آئے، انہوں نے انہیں تعلیم کے لئے فخر الدین زرادی (وفات: ۷۴۸ھ مطابق ۱۳۴۷ء) کے حوالے کر دیا۔ اس وقت کے مروجہ نصاب کے مطابق وہ بہت بڑے عالم بنے اور پھر انہیں بنگال جانے کے لئے کہا گیا جہاں ۷۵۸ھ یا ۱۳۵۷ء میں انہوں نے وفات پائی۔

ہفت اقلیم کے مطابق نظام (الدین اولیاء علیہ الرحمہ) نے انہیں ''آئینہ ہند'' کے نام سے پکارا اور یہ کہ انہوں نے پختہ عمر میں صرف (حضرت) فخر الدین سے خصوصی تعلیم حاصل کی۔ (حضرت) نظام کی وفات یعنی ۷۲۵ مطابق ۱۳۲۵ کے بعد وہ لکھنوتی گئے اور بنگال کے سارے سلاطین ان کے مرید بنے''۔ تاہم منشی الٰہی بخش کی ''خورشید جہاں نما'' کے مطابق یکم شوال ۷۴۳ھ مطابق ۱۳۴۲ء میں ان کی موت واقع ہوئی۔ ان کی وفات کا مادہ تاریخ ''زود گو کہ آں روز عید الفطر است: جلدی کہو کہ وہ عید الفطر کا دن ہے،، ہے۔ گور میں بھیجے جانے کے لئے ان کی درخواست کی ایک وجہ امکانی طور پر یہ تھی کہ ان کی ماں یہاں رہتی تھیں مگر حقیقت میں وہ اودھ کے رہنے والے تھے۔

فرشتہ کے مطابق (بمبئی ایڈیشن، جلد دوم، ص: ۳۷۷) شیخ اخی سراج الدین پنڈوہ کے شیخ نور قطب العالم کے دادا تھے، (نور قطب العالم کے سرنامہ کے تحت ملاحظہ فرمائیں) مگر یہ غلط ہے۔ حضرت اخی سراج کو شیخ نور قطب العالم کا صرف روحانی دادا کہا جا سکتا ہے کیونکہ آخر الذکر کے والد شیخ علاء الحق، حضرت اخی سراج الدین کے مرید (وخلیفہ) تھے۔ شیخ (اخی سراج علیہ الرحمہ) کا سالانہ عرس ہر سال عید الفطر کے دن وسیع ترسا گردیگھی کے پاس منایا جاتا ہے اور شیخ کے احترام کی ایک نشانی کے طور پر مخدوم جہانیاں جہاں گشت کا جھنڈا اور شیخ نور قطب العالم کے ہاتھ کا نقش شدہ پنجہ پنڈوہ سے وہاں بھیجا جاتا ہے۔ وہاں ہر سال عید الفطر اور بقر عید کے دن ایک بہت بڑا میلہ بھی منعقد ہوتا ہے۔

مقامی علماء کا کہنا ہے کہ شیخ کے روزمرہ کے استعمال کی ساری چیزیں مثلاً قرآن کریم، تسبیح اور رحل وغیرہ بھی شیخ ہی کے ساتھ اُن کی قبر کے سرہانے دفن کر دی گئی ہیں اور قبر کی غیر معمولی طوالت کی وجہ بھی یہی ہے۔[1]

1۔ مرحوم خان صاحب نے کچھ اینٹوں پر کھدوائے گئے ایک اہم ترین کتبہ، جواب ''انڈین میوزیم'' میں موجود ہے، کو نظر انداز کر دیا ہے جس کے بارے میں جنرل کیوننگھم کا آرگیومنٹ ہے یہ کتبہ روضہ حضرت اخی سراج الدین کے

صدر دروازہ کے اوپر موجود کلی طور پر کتبے ہی کی ناپ کے برابر ایک پینل، جو ۱۸۷۹ء عیسوی تک بھی واضح طور پر یہاں دیکھا جاسکتا تھا، سے آیا ہے۔ کیونگھم نے چوتھی اینٹ پر لکھے ہوئے آخری لفظ کو سبع مأۃ (۷۰۰) کے طور پر ریڈ کیا اوران اینٹوں میں سے ایک دوسری اینٹ پر 'اعظم شاہ' درج تھا، اسی بنیاد پر اس نے (من جانب) بادشاہ کے طور پر غیاث الدین (ابن سکندر شاہ) کو مراد لیا جس نے ۷۹۲ھ ہجری سے لیکر ۸۱۳ھ ہجری تک بنگال میں ایک واحد بادشاہ کے طور پر حکومت کی تھی۔ لگے ہاتھوں یہ بھی بتاتے چلیں کہ یہ لفظ تسع مأۃ کی طرح زیادہ نظر آتا ہے، ایسی صورت میں یہاں کتبہ کو نصب کرنے والا بادشاہ غیاث الدین محمود شاہ (ابن حسین شاہ) ہوگا جس نے ۹۳۹ھ سے لیکر ۹۴۴ھ تک حکومت کی تھی۔

بادشاہ کے نام کے حوالے سے تو اس کتبہ کی بہت زیادہ اہمیت نہیں ہے مگر یہ کہ آخری اینٹ پر 'شہر محمد آباد' کا نام واضح طور پر لکھا ہوا ہے، اگر (شیخ) اخی سراج الدین کے روضے کی طرف اس کتبے کو منسوب کرنے میں کیونگھم صحیح ہے تو تمام احتمالات اور امکانات کے ساتھ گور کے اس حصے کا مقامی نام 'محمد آباد' ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ ایسا تو مشکل ہی سے ہوسکتا ہے کہ یہ نام جلال الدین محمد (ولد راجہ کانس۔ ۸۱۸ھ) کے نام سے ماخوذ ہو کیونکہ اس بادشاہ کے کاروبار حکومت کی پوری مجلس پنڈوہ کے ساتھ مربوط تھی۔ اب چونکہ شاہان بنگال کے درمیان اس نام کا اور کوئی دوسرا بادشاہ نہیں ہے اس لئے غالب گمان یہ ہے کہ یہ نام دہلی کے محمد تغلق کے نام سے ماخوذ ہے جس نے تقریباً ۷۲۸ھ مطابق ۱۳۲۸ء میں بنگال کے سلطان غیاث الدین بہادر کو شکست دینے اور ذبح کر ڈالنے کے بعد ایک مختصر عرصہ کے لئے بنگال کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا تھا۔

خطہ میں ساگر دیگھی کے وجود کو دیکھتے ہوئے گمان غالب یہ ہے کہ ہندو راجاؤں جنہوں نے یہ عظیم ترین تالاب کھدوایا تھا، کے اقتدار کا مرکز (ہیڈ کوارٹر) اسی تالاب کے آس پاس کہیں رہا ہوگا مگر یہ بات محض تبھی نیچرل ہوگی جب بعد کے مسلم صوبہ دار اور شاہان بنگال (محمد تغلق کے مقرر کردہ گورنر قادر خان سمیت) ساگر دیگھی کے قرب وجوار کو اپنے صدر مقام کے طور پر استعمال کر رہے ہوتے۔ آرگیومنٹ کی معقولیت اور صحت مندی بڑی حد تک اس بات پر انحصار کرتی ہے کہ (حضرت) اخی سراج الدین کے روضہ کی طرف مذکورہ بالا کتبہ کو منسوب کرنے میں آیا کیونگھم صحیح بھی تھا یا نہیں؟ تاہم یہ حقیقت، کہ تقریباً چودہویں صدی عیسوی کے وسط میں (حضرت) اخی سراج الدین کو اس مقام پر دفنایا گیا تھا، اِس بات کی جانب اشارہ کرتی ہے کہ اُس زمانے میں اِس جگہ کی کچھ نہ کچھ اہمت تو ضرور تھی۔

﴿یادگار نمبر ۲۹﴾ جہانیاں مسجد

(تاریخ تعمیر: ۹۴۱ھ مطابق ۱۵۳۸ء۔۔۔دورحکومت: غیاث الدین محمود شاہ)

رَونشاہ نے اس مسجد کو ''مسجد جَن جَن میاں'' کے نام سے منسوب کیا ہے جبکہ مقامی لوگ اسے 'جہاں جہانیاں مسجد' کے نام سے پکارتے ہیں۔ غالبًا یہ سارے نام ایک بزرگ (حضرت) جہانیاں جہاں گشت، جن کا ذکر ماقبل میں آ چکا ہے، کے نام کی ایک بگڑی ہوئی شکل ہے۔ یہ عمارت، روضہ (حضرت) اخی سراج الدین کے جنوب میں تھوڑے ہی فاصلے پر واقع ہے۔

یہ مسجد ۵۶ رفٹ لمبی اور ۴۲ رفٹ چوڑی ہے جبکہ اندرونی طول وعرض ۴۰ رفٹ برابر ۲۶ رفٹ ۳ رانچ ہے۔'' یہ ایک مستطیل اینٹوں سے بنی عمارت ہے جس کے ظاہری حصے پر حاشیہ کاری کی گئی ہے، ساتھ ہی سامنے تین محراب دار دروازے اور تمام کونوں میں آٹھ اضلاع والے مینارے ہیں جو اوپر چھت کی سطح تک جا کر معمولی سے کنگروں کے ساتھ ختم ہوتے ہیں، چھت کافی بڑے چھ گنبدوں پر مشتمل ہے جس کو اندر سے سنگین ستونوں نے سہارا دے رکھا ہے۔ دیوار کا پورا بیرونی حصہ آرائشی بیلوں کی مدد سے ہم آہنگ پینلوں، جو نہایت درجہ قرینہ کے ساتھ یکے بعد دیگرے قائم کئے گئے ہیں، کی چار متوازی قطاروں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ تمام کارنس بنگالی تراش اور ساخت کے مطابق خفیف سے خمیدہ ہیں''۔ (رپورٹ، از: کیوننگھم۔ص: ۷۳) یہ ایک بہت ہی نفیس عمارت ہے اور وسطی دروازہ کے اوپر طغرا حروف میں ایک کتبہ نصب کیا گیا ہے جس کا متن اور ترجمہ نیچے پیش کیا جا رہا ہے:

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من بنی مسجدًا للہ بنی اللہ لہ بیتًا مثلہ فی الجنۃ بنی ھذا المسجد الجامع فی عھد سلطان بن السلطان غیاث الدنیا والدین ابو المظفر محمود شاہ السلطان بن حسین شاہ السلطان خلد اللہ ملکہ وسلطنتہ وبانیہ بی بی مالتی دامت سیرھا وادام اللہ معالیھا فی سنۃ احدی و اربعین وتسعمأۃ۔

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس نے اللہ کیلئے ایک مسجد بنائی، اللہ اس کیلئے اسی کی طرح جنت میں ایک گھر بنائے گا۔ شاہ ابن شاہ، غیاث الدنیا والدین، ابوالمظفر، سلطان محمود شاہ ابن سلطان حسین شاہ، اللہ اس کی

بہرحال! پیش کردہ بالا نظریہ پہلے سے غیر تشریح شدہ نام محمد آباد، جو ۸۸۰ھ سے لے کر ۹۱۳ھ کے درمیان جاری کئے گئے متعدد سکوں پر مضروب ملتا ہے، کی تھوڑی بہت تشریح ضرور پیش کرتا ہے۔ (ایچ، ای، اسٹیپلٹن)

مملکت اور سلطنت کو سدا آباد رکھے، کے عہد میں ۹۴۱ھ ہجری کو اس جامع مسجد کی تعمیر عمل میں آئی اور اس مسجد کو بنانے والی بی بی مالتی ہیں۔اللہ اس کے اونچے مقام کو ہمیشہ قائم رکھے اور اس کا جوہر اخلاق دراز ہو۔

اس کتبے کی معرفت ہمیں پتہ چلا کہ یہ مسجد ایک اونچے درجے کی خاتون کے ذریعے تعمیر کی گئی تھی۔اس سلسلے میں کیونگھم کا خیال یہ ہے کہ یہ خاتون ممکنہ طور پر برسر اقتدار بادشاہ محمود سوم کے گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ یہ عمارت شیر شاہ کے ہاتھوں میں بنگال کا اقتدار منتقل ہونے سے صرف تین سال پہلے ہی تعمیر کی گئی تھی، اس طرح اغلب طور پر ''لوکا چوری گیٹ'' کو چھوڑ کر گور میں تعمیر کی جانے والی عمارتوں میں یہ سب سے آخری عمارت ہے۔

جہانیاں مسجد اور روضہ شیخ اخی سراج الدین کی وراثت:

ناظم شش ہزاری اسٹیٹ، پنڈوہ کا یہ دعوی ہے کہ وہی ان عمارتوں کا مالک ہے کیونکہ (شیخ) اخی سراج الدین حضرت علاء الحق کے مرشد تھے۔ اسٹیٹ ہی وقف جائیداد کے کرائے وصول کرتی ہے جو انہی عمارتوں کے انتظام و انصرام کے لئے مخصوص ہے۔ مسجد اور مقبرہ کی فوری طور پر مرمت کی ضرورت ہے، اگر انہیں یوں ہی خستہ حال چھوڑ دیا گیا تو بہت جلد یہ عمارتیں مکمل طور پر منہدم ہو جائیں گی۔خصوصیت کے ساتھ مسجد کے گنبدوں کو مرمت کرنے اور واٹر ٹائٹ بنانے کی شدید ضرورت ہے۔

﴿باب سوم﴾

فصل دوم۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔پنڈوہ

پنڈوہ۔۔۔۔یا۔۔۔۔پروہ، ایک ویران شہر ہے جو گور کے شمال مشرق میں بیس میل اور انگلش بازار سے گیارہ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ مسلمانوں کی آمد سے کافی پہلے یہاں یقینی طور پر ایک ہندو دارالحکومت تھا۔ ریاض کے مطابق مسلمانوں کی تاریخ میں پنڈوہ کا ذکر سب سے پہلے اس وقت آتا ہے جب شمس الدین الیاس شاہ نے علاء الدین علی شاہ کو قتل کرنے کے بعد ''حضرت پنڈوہ'' میں بنگال کے تخت پر جلوس کیا، تاہم آخر الذکر بادشاہ کی جانب سے ۷۴۳-۴ھ ہجری مطابق ۱۳۴۲-۳ عیسوی کو فیروز آباد (پنڈوہ کا مسلم حکومت والا نام) میں سکے ڈھالنے کا ثبوت موجود ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ علاء الدین کا دارالحکوت بھی ضرور پنڈوہ ہی میں تھا۔[1] ۷۴۶ھ مطابق ۱۳۴۵ء میں علاء الدین

1۔ یہ نام فیروز آباد اس بات کی جانب اشارہ کرتا ہے کہ ۳۰/سال یا اس سے پہلے ہی شمس الدین فیروز شاہ (۱۳۰۱ء۔۱۳۲۲ء) نے پنڈوہ کو اپنا دارالحکومت بنالیا ہوگا اگرچہ اس بادشاہ کے ذریعے اس دارالضرب سے کسی سکے کا ڈھالا جانا تاہنوز منظر عام پر نہیں آیا۔ ۱۴۱۷ء اور ۱۴۱۸ء میں ہندو راجاؤں دنوجہ مردانہ دیوا (راجہ کانس) اور مہیندرا دیوا کی جانب سے جاری کئے گئے سکوں سے پتہ چلتا ہے کہ اُن دنوں اس جگہ کا نام پانڈونگر (پانڈوؤں کا شہر) ہوا کرتا تھا جس سے یہ رائے قائم کی جاتی ہے کہ یہاں اس وقت ایسی روایت تھی کہ اس شہر کی بنا قدیم ہندو تاریخ کے پانڈو برادران نے ڈالی تھی۔ دوسرے لفظوں میں، گزشتہ پندرہویں صدی عیسوی تک بھی ایسا مانا جاتا تھا کہ یہ جگہ عہد عتیق کی یادگار ہے۔ اب تک یہاں ایک روایت چلی آرہی ہے (پوری حکایت آنے والے ایک عنوان ''پانڈپ راجہ دالان'' کے تحت ملاحظہ فرمائیں) کہ: ستائیس گھرا دیگھی کی کھدائی ارجن پانڈا وا نے کی تھی اور تالاب کے جنوب مشرقی گوشہ میں جو عمارت ہے وہ ''پانڈو راجہ دالان'' ہے۔ اول نظر میں تاسیسِ پنڈوہ کی وجہ یہ ہے کہ یہاں مہانندا اور گنگا کے سابق تلہ کے سنگم کے نزدیک سرخ سیلابی مٹیاں ایک جزیرہ کی شکل میں جمع ہوگئی تھیں۔ پھر آگے چل کر جب گنگا کی اصلی دھارائیں مزید جنوب کی سمت مڑ گئیں اور مہانندا، جو اب تک مغرب میں شہر کی حفاظت کررہی ہے، نے اپنی گزرگاہ کو اولڈ مالدہ میں مہانندا اور کالندری (جو اب گنگا کی جگہ پر بہ رہی ہے) کے سنگم تک وسیع کردیا تو پنڈوہ کی 'حقیقی بندرگاہ' کی تشکیل عمل میں آئی۔ ضلع ہگلی میں ایک دوسرا پنڈوہ بھی ہے، اسی لئے دونوں کے درمیان کنفیوژن کو دور کرنے کیلئے جنرل کیوننگھم نے یہ تجویز رکھی ہے کہ ضلع مالدہ والے پنڈوہ کو ہمیشہ ''حضرت پنڈوہ'' کے نام سے پکارا جائے۔ ایچ،ای، اسٹیپلٹن

کی موت کے بعد الیاس شاہ نے دارالحکومت کو پنڈوہ ہی میں برقرار رکھا، کیونکہ تخت نشینی کے فوری بعد ۷۴۳ھ میں اور پھر ۷۵۱ھ میں جو سکے ڈھالے گئے ان پر فیروز آباد درج ہے اور پھر اس کے بعد الیاس (یا کسی بھی بعد میں آنے والے بادشاہ بنگال) کی جانب سے کسی بھی سکہ کا لکھنوتی میں ڈھالا جانا نامعلوم ہے۔ ناصرالدین محمود شاہ (۱۴۴۲ء ۔۔۔ ۱۴۵۹ء)، جس نے دارالحکومت کو دوبارہ گور کی طرف منتقل کیا، کے عہد سلطنت تک حکومت کا تخت و تاج پنڈوہ ہی میں قائم رہا۔

پنڈوہ کے بارے میں ڈاکٹر بوچانن ہیملٹن کی تصریحات:

ڈاکٹر بوچانن ہیملٹن نے لگ بھگ ۱۸۰۸ء میں اپنے سروے کے سلسلے میں ضلع مالدہ کے اِس زیر بحث مقام، جو اُس وقت وسیع ترین ضلع 'دیناجپور' کا ایک حصہ تھا، کا ذکر (ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، دیناجپور، ایڈیشن: ۱۸۳۳ء، ص: ۴۱ تا ۴۴ رمیں) یوں کیا ہے:

اینٹوں کے ذریعے پختہ کی گئی ۱۲ر سے ۱۵رفٹ چوڑی ایک سڑک ہے جو زیادہ راست اور ہموار نہیں ہے۔ یہ سڑک پورے شہر کی لمبائی میں گزرتی ہوئی نظر آرہی ہے اور 'بابِ مخدوم شاہ' کے تقریباً نصف میل جنوب سے شمال تک امکانی طور پر پانچ یا چھ میل مسافت پر پھیلی ہوئی ہے۔ سڑک کے دونوں جانب پڑی ہوئی اینٹوں کے ڈھیروں کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ یہ ایک برابر استعمال کی جانے والی سڑک تھی اور سڑک کے دونوں اطراف اینٹوں سے بنے مکانات ہوا کرتے تھے۔ کچھ عمارتوں کی بنیادیں تو تاہنوز دیکھی جاسکتی ہیں۔ دونوں شیوخ کے روضے، وسیع ترین ادینہ مسجد اور یادگار سلطان غیاث الدین (اک لاکھی مقبرہ) اسی سرزمین پر واقع ہیں اور مرکزی حصے میں بعض حد تک پتھروں سے تعمیر کیا گیا تین محرابوں والا ایک پل ہے جو ایک ندی یا نالہ کے اوپر قائم ہے۔ یہ کوئی بڑے سائز کا پل نہیں ہے اور تعمیر بھی انتہائی ناشائستہ اور بھدے انداز میں کی گئی ہے جو اس بات پر گواہ ہے کہ یہ پل ہندو آثار قدیمہ سے ہے کیونکہ وہی لوگ اپنی تعمیرات میں انسانوں اور جانوروں کی صورتوں کو بڑے ہی ناشائستہ انداز میں شامل کرلیا کرتے تھے۔

سڑک کے شمالی سرے پر ایک شہر پناہ کے نشانات ہیں اور وہاں ایک گزرگاہ بھی ہے جسے مقامی لوگ ''گڑھ دوار'' (یعنی قلعے کا دروازہ) کہتے ہیں۔ جنوبی سرے پر کافی ساری بنیادیں ہیں جو ایک دوسرے کو اور سڑک کو کراس کرتی ہیں اور ممکنہ طور پر اُن کا تعلق بھی دروازے سے ہے، مگر وہاں جنگل اتنا گھنا اور ناقابل عبور ہے کہ دیوار کو ٹریس نہیں کیا جا سکتا۔ اس جگہ کے جنوب میں بہت ساری اینٹیں بکھری پڑی ہیں اور ان منتشر اینٹوں کے عقب میں ایک فصیل ہے جو اغلب طور پر ایک 'آؤٹ ورک' (کسی حصار بند علاقے کے بیرونی حصے میں تعمیر کیا جانے والا ذیلی دفاعی ڈھانچہ) ہے،

قدیم شہر، پنڈوہ کا سائٹ پلان

یہ نقشہ مالدہ ٹاؤن، نیما سرائے، انگلش بازار، شہر گور کے شمالی علاقے،

علاوہ ازیں مہانندا اور کالندری ندیوں کے ساتھ پنڈوہ کے جغرافیائی تعلقات کو ظاہر کرتا ہے۔
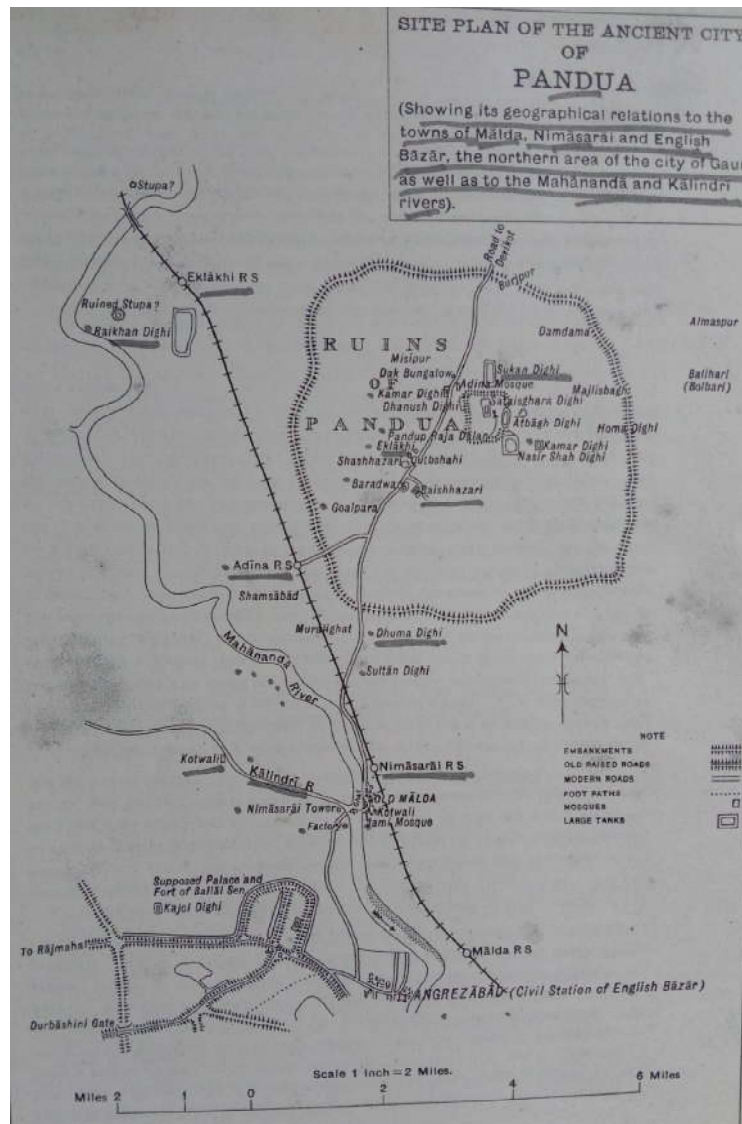
After Pemberton: Revised by H.E.S. from air survey

Photos by courtesy of the Arch.Survey of India,1930

REG NO. 1777. E. 30-1020. HELIO. S.I.O. CALCUTTA

کیون کہ مذکورہ بالا اساسوں سے آگے سڑک کا سراغ نہیں لگایا جا سکتا۔

سڑک کے نزدیک اور اینٹوں کے ڈھیروں کے درمیان بہت سارے چھوٹے چھوٹے تالاب ہیں اور میرا فکری میلان اس بات کی جانب ہے کہ مرکزی سڑک کے خواہ مشرق میں ہو یا مغرب میں، پورا شہر معدودے چند ہی راستوں پر پھیلا ہوا تھا۔ مقامی لوگ کہتے ہیں کہ روضہ قطب شاہ کے مشرق میں دو میل کے فاصلے پر ایک بڑا تالاب ہے جسے پہرت خان نے کھدوایا تھا اور اس تالاب کے بس ذرا ہی شمال میں ایک دوسرا تالاب بھی ہے جسے نصر شاہ کے بعد کا کہا جاتا ہے اور یہ کہ وہاں اب تک عمارتوں کے نشانات دریافت ہو سکتے ہیں۔ وہ لوگ مزید کہتے ہیں کہ جانب مغرب بھی کافی سارے نشانات پھیلے ہوئے ہیں تاہم تھوڑی ہی دوری پر جنگل اس قدر ناقابل عبور ہے کہ میں بادشاہ کے باقی ماندہ محل ہی کو ملاحظہ کرنے کے ساتھ وابستہ رہا جو مرکزی سڑک کے مشرق میں تقریباً ایک میل کے فاصلے پر واقع ہے مگر میں نے یہ پایا کہ یہاں ایسے نشانات باقی ہی نہیں رہ گئے ہیں جو یہ ظاہر کر سکے کہ شہر اتنی دور تک پھیلا ہوا بھی تھا تاہم اُسی وقت یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ یہاں ایسے کئی بڑے مضافات شہر بھی نظر آتے ہیں جو مالدہ کے قرب و جوار سے لے کر مشرق اور شمال کی طرف تقریباً ۱۲ر میلوں پر پھیلے ہوئے ہیں۔ مالدہ سے متصل شجاع پور، پھر فتح پور، پھر مہمان پور، پھر دَنیگل، پھر بیلواڑی اور پھر پورے کا پورا بہادر پور ''ضلع جگو دل'' میں واقع تھیں۔ ان جگہوں میں سے ہر ایک کا ایک قابل لحاظ رقبہ چھوٹے چھوٹے تالابوں اور خشت و سنگ کے انباروں پر مشتمل ہے''۔[1]

''مخدوم شاہ جلال اور قطب شاہ جو ماضی بعید میں بنگال کی شاہی حکومت کے دوران دو ممتاز ترین مذہبی شخصیتیں تھیں، سے متعلق قابل احترام مقامات ہی بڑی حد تک یہاں کی یادگاریں ہیں۔ ہر رُت اور ہر موسم میں پورے بنگال

1۔ شجاع پور (جسے مقامی لوگ سُرجاپور کہتے ہیں) پنڈوہ کے جنوب میں اولڈ مالدہ سے آتے ہوئے سڑک کے دائیں جانب ۴ر میل، فتح پور پنڈوہ کے جنوب مشرق میں ۲ر میل اور بہادر پور پنڈوہ کے شمال میں ۱۴ر میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ دیگر مقامات جو اوپر مذکور ہوئے ان کا پتہ نہیں لگایا جا سکا تاہم بیلواڑی امکانی طور پر بول باڑی ہی کا دوسرا نام ہے۔ جہاں تک بوچانن کے ذریعے ذکر کردہ تالاب پہرت خان کا تعلق ہے تو اس بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہاں اس نام کے حامل دو تالاب ہیں جو چھوٹی درگاہ کے جنوب مشرق میں تقریباً ایک میل کے فاصلے پر واقع ہیں۔ (ایچ، ای، اسٹیپلٹن)

سے ان گنت زائرین ان آثار کی زیارت کے لئے آتے رہتے ہیں، خصوصیت کے ساتھ مخدوم صاحب کے یہاں سالانہ عظیم ترین میلے کے موقع پر بڑی بھیڑ اکٹھی ہوتی ہے، اسی موقع پر قطب شاہ کی تقریباتی یادیں چار نشستوں (الوس) میں منائی جاتی ہیں۔ مذہبی فقرا صاحبان جو کسی بھی وقت آتے رہتے ہیں، کو تین دن تک کھانا کھلایا جاتا ہے جسے لنگر کہتے ہیں۔

دونوں مقامات پر قابل لحاظ مقدار و تعداد میں نذریں بھی پیش کی جاتی ہیں جنہیں عمارتوں کی مرمت، ان پریشان حال لوگوں کی امداد اور وافر تعداد خدام، جو پروا (پنڈوہ) کی آبادی کو آگے بڑھا رہے ہیں، کے قیام و نظام پر خرچ کیا جاتا ہے۔ ضلع کی وہ آراضی جو روضہ مخدوم شاہ سے متعلق ہیں، انہیں بائیس ہزاری کہتے ہیں، کیونکہ یہ آراضی مذکورہ تعداد بیگھہ پر مشتمل ہیں اور حکومت کی جانب سے مقرر کردہ ایک شخص اس ساری جائیداد کا بندو بست کرتا ہے۔ جو آراضی روضہ قطب شاہ سے تعلق رکھتی ہیں، وہ انہیں کی اولاد و اخلاف کے زیر انتظام ہیں اور انہیں شش ہزاری کہتے ہیں کیونکہ یہ آراضی چھ ہزار بیگھہ پر مشتمل ہیں''۔

''سونا مسجد قطب شاہ کے فوری بعد ہی جانبِ شمال اور مرکزی سڑک کے بھی وہی جانب ایک دوسری یادگار بھی ہے جسے ''اک لاکھی'' کہتے ہیں کیونکہ اس کی تعمیر میں ایک لاکھ رقم کا صرفہ آیا تھا۔ عمارت تو بنیادی طور پر اینٹوں ہی سے بنائی گئی ہے مگر یہ خطے کی ایک انتہائی خوشنما عمارت ہے۔ اگلے حصے میں یہ عمارت ۸۰/اسکوائر فٹ پر مشتمل ہے، ساتھ ہی ہر ایک گوشے میں ایک چھوٹا برج ہے اور چھت ایک واحد گنبد سے ڈھکی ہوئی ہے۔ دیواریں بیرونی حصے میں تراشیدہ نقش و نگار سے آراستہ ہیں اور گنبد اندر سے خوش اسلوبی کے ساتھ پلاسٹر کیا گیا ہے مگر عمارت کی ڈیزائن بے سلیقہ ہے۔ ہر چہار سائڈ میں بنائے گئے چار چھوٹے چھوٹے دروازوں کے ذریعے اندر روشنی آتی ہے اور دروازوں کے درمیان اطراف میں ہشت پہلو زاویوں میں چار تنگ و تاریک حجرے موجود ہیں، یہ ناپسندیدہ اور آفت زدہ کمرے غالبًا ان فقیروں کے رہنے کے مقصد سے بنائے گئے تھے جو شمعوں کا خیال رکھتے تھے۔ ان کمروں میں نہ تو ہوا ہے اور نہ ہی روشنی بلکہ چھوٹے سے روشندان کے ذریعے جو روشنی اندر آتی ہے، فقط اسی کے توسط سے یہ لوگ مرکزی ہال کے ساتھ رابطہ قائم رکھتے ہیں۔ یہ عمارت تین باوقار شاہی افراد کے مقبرے کے طور پر نظر آتی ہے جن کی قبریں فرش کے وسط میں واقع ہیں۔ یہاں رہنما کے طور پر کوئی کتبہ تو موجود نہیں ہے لیکن کہا جاتا ہے کہ یہ قبریں سلطان غیاث

الدین، زین العابدین اور وحوزالدین [1] کی ہیں۔ مشرقی دروازہ واضح طور پر کسی ٹوٹی پھوٹی ہندو عمارت سے لایا گیا ہے کیونکہ اس پر انسانی خدوخال کی تصویر موجود ہے''۔

''مقبرہ غیاث الدین کے دوسری طرف دو میل یا اس سے کچھ کم فاصلے پر اُس کے والد سکندر شاہ کی قبر ہے جو پرشکوہ ادینہ مسجد کے ایک حصے پر بنی ہے۔ یہ مسجد اس سرزمین کی سب سے بڑی عمارت ہے بلکہ قرب وجوار کے لوگ تو اسے تقریباً معجزاتی عظمت کی حامل قرار دیتے ہیں۔ یہ مسجد مرکزی سڑک کے جانب مشرق [2] سڑک اور ایک بڑے

1۔''و، ح، ز'' کے مادہ سے غالباً عربی زبان میں حروف ہی نہیں آتے، چونکہ بنگال کے باشندے علی العموم عربی یا فارسی ناموں کا غلط تلفظ اور کتابت کرتے ہیں، کبھی کچھ گھٹا دیتے ہیں تو کبھی بڑھا دیتے ہیں، سو بہت ممکن ہے کہ یہ نام بھی اسی قسم کی کسی علاقائی تحریف یا زیادتی کا شکار ہوا ہو اور ڈاکٹر ہیملٹن نے اس بات پر غور کئے بنا اسی معروف علاقائی نہج کے ساتھ انگریزی میں ''Wahuzud-din'' لکھ دیا ہو۔ اس بے مایہ مترجم کے خیال میں یہ نام ۔۔وحیج الدین۔۔ ہونا چاہئے، جس کا معنی ہوگا۔۔ دین کی پناہ لینے والا، یا دین کی پناہ میں آنے والا۔ (میزان)

2۔ مسجد کا جو'لینڈ مارک' یہاں پیش کیا گیا، ظاہر ہے کہ وہ ہیملٹن کے زمانے کا ہے سو بہت ممکن ہے کہ ہیملٹن کے زمانہ تک خطہ کی مرکزی سڑک ادینہ مسجد کے مغرب سے گزرتی ہو، سو مسجد کا محل وقوع مرکزی سڑک کے مشرق میں رہا ہو۔ اِس امکانی نظریہ کی تائید میں ایک معقول دلیل بھی پیش کی جاسکتی ہے، وہ یہ کہ آج بھی ادینہ مسجد کے مغرب سے ایک چھوٹی سی ذیلی سڑک گزرتی ہے۔ میں نے اس سڑک کو آج سے تقریباً ۲۰ سال پہلے کافی مخدوش حالت میں دیکھا تھا لیکن اب تو مقامی انتظامیہ کی توجہ سے اس کی حالت پہلے سے کافی بہتر ہے۔ زائرین کی ایک معتدبہ تعداد مخدومان پنڈوہ کی بارگاہوں میں حاضری دینے کے بعد جب زیارت کے لئے 'ادینہ مسجد' جاتی ہے تو علی العموم اسی ذیلی مغربی سڑک کا استعمال کرتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ سونا مسجد قطب شاہ، مقبرہ شاہ غیاث الدین یا جلال الدین، مزارات مخدومان پنڈوہ، چلہ خانہ حضرت شاہ جلال الدین تبریزی، ستائیس گھرا دیگھی اور پنڈپ راجہ دالان وغیرہ تمام آیات وآثار اسی مغربی سڑک سے متصل واقع ہیں سو انہیں دیکھ کر بھی اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ زمانہ ماضی بعید میں (ممکنہ طور پر ہیملٹن کے زمانے تک بھی) خطے کی مرکزی سڑک آج کی یہی ذیلی مغربی سڑک رہی ہوگی۔ تاہم آج کی تاریخ میں مرکزی سڑک ''ادینہ مسجد'' کے مشرق میں واقع ہے سو اگر موجودہ 'لینڈ مارک' کی بات کریں تو تاریخ کی یہ بے نظیر مسجد آج کی تاریخ میں مرکزی سڑک کے مغرب میں واقع ہوگی۔ (میزان)

تالاب، جواب لگ بھگ پورے کا پورا گھاس پھونس اور گھنی جھاڑیوں سے بھر گیا ہے، کے درمیان واقع ہے اور کافی زیادہ خستہ حال ہے۔بس اب (اس عمارت) کی اتنی ہی مقدار باقی رہ گئی ہے کہ جسے دیکھ کر ہم ایک ابتدائی خاکہ بنا سکیں اور اس بات کا فیصلہ کرسکیں کہ یہ مسجد کبھی کیسی پرشکوہ ہوا کرتی تھی"۔

زیارت پنڈوہ اور دلچسپی کے اہم ترین مقامات:

حالیہ دنوں ایک زائرِ پنڈوہ، نیما سرائے ریلوے اسٹیشن اولڈ مالدہ سے گاڑی پکڑ کر غبار آلود راستوں سے گزرتے ہوئے ادینہ مسجد کے نزدیک واقع "ڈاک بنگلہ" تک پہنچ سکتا ہے یا پھر ادینہ اسٹیشن جو ڈاک بنگلہ سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر واقع ہے، تک جا کر ریل گاڑی سے اتر سکتا ہے۔ بہرصورت! سڑک کے ایک خاص مقام پر وہ ایک ایسی بیس میل محیط قدیم حصار بندی کے لائن کو کراس کرے گا جسے ایک تازہ ہوائی سروے نے قدیم وقتوں کی مورچہ بندی کے طور پر پیش کیا ہے۔(ملاحظہ فرمائیں پلیٹ نمبر ۵)

اس طرح سے پنڈوہ کے نزدیک پہنچ جانے پر سب سے پہلے دو عمارتیں آپ کے توجہ کی طلب گار ہوں گی، اول تبرکات خانہ مخدوم شاہ جلال جو سڑک کے دائیں جانب اور دوم روضہ حضرت نور قطب العالم جو سڑک کے بائیں جانب واقع ہے۔ان آستانوں کو ترتیب وار بڑی درگاہ اور چھوٹی درگاہ کہتے ہیں۔ان گنت زائرین ان مقامات پر تاہنوز آتے رہتے ہیں، ہر سال یہاں دو بڑے میلے منعقد ہوتے ہیں، ایک رجب کے مہینے میں بڑی درگاہ کی طرف اور دوسرا شعبان میں چھوٹی درگاہ پر منعقد ہوتا ہے، ان میلوں میں ہزاروں لوگ جاتے ہیں اور ہر دو میلہ چار سے پانچ روز تک قائم رہتا ہے۔ بائیں طرف مزید آگے بڑھیے تو مسجد قطب شاہ آتی ہے اور پھر اک لاکھی مقبرہ، پھر آخری نقطے پر دائیں طرف (ڈاک بنگلہ کے سمت مخالف) پرشکوہ ادینہ مسجد واقع ہے۔ یہاں مزید یہ بات بھی شامل کر دینی چاہیے کہ اکثر بنیادی مقامات تک ڈاک بنگلہ سے آسانی کے ساتھ چل کر بھی پہنچ سکتے ہیں اگرچہ قلعہ بندی کی تمام تر تفتیش اور معائنہ کیلئے بہتر یہی ہے کہ اگر ممکن ہو سکے تو اپنی مدد اور آسانی کیلئے کسی ہاتھی کی خدمات حاصل کر لی جائیں۔[1]

1۔گھبرائیے نہیں، یہ کافی پرانی باتیں ہیں، اتنی پرانی کہ اب پنڈوہ میں ان باتوں کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا۔آج کی تاریخ میں نہ تو آپ کو غبار آلود راستوں کا سامنا کرنا ہوگا اور نہ ہی سڑکوں پہ دندناتے ہاتھی نظر آئیں گے۔اب تو ماشاءاللہ کافی لمبی چوڑی سڑک بن چکی ہے۔بس سروس بھی فعال ہے، ہر دو چار منٹ پر گاڑیاں مل جاتی ہیں، حسب منشا نجی گاڑیوں کی خدمات بھی حاصل کر سکتے ہیں۔اب تک یہ جگہ کوئی شہر یا قصبہ تو نہیں ہے مگر پہلے جیسا جنگل یا بیابان بھی

پنڈوہ کے قدیم آثار:

پنڈوہ کی باقی ماندہ قدیم عمارتوں اور تالاب وغیرہ کے حوالے سے مندرجہ ذیل مضامین انتہائی اہم اور (تاریخی) محافظت ونگہداشت کا بہترین بیانیہ ہیں۔

﴿یادگار نمبر ا﴾ بڑی درگاہ یا چلہ خانہ شاہ جلال

الف۔۔۔عمارتوں کی تفصیلات:

بڑی درگاہ۔۔جامع مسجد جس کے شمالی حصے میں شیخ کا اصلی چلہ خانہ موجود ہے، اور دیگر اُن تمام تعمیرات پر مشتمل ہے جو حضرت شاہ جلال تبریزی جو غالباً سلہٹ کے بھی سرپرست بزرگ تھے، کی یاد میں نذر کی گئی ہیں۔ پنڈوہ کا اصلی چلہ خانہ غالباً شیخ کے کہنے پر ۱۳۴۲ء میں سلطان علاءالدین علی شاہ نے تعمیر کرایا تھا کیونکہ مسجد کے مستطیل ستون انتہائی انوکھے اور جداگانہ طریقے پر استوار کئے گئے ہیں اور پنڈوہ کی دوسری عمارتوں مثلاً ادینہ مسجد وغیرہ کے مشاہدات کے برخلاف یہاں کی اصلی عمارت میں ہندو مندروں کے مواد مسالوں کے استعمال سے قطعاً گریز کیا گیا ہے۔

عمارتوں پر مشتمل اصلی کمپاؤنڈ مرکزی دیوکوٹ روڈ سے ۲۰۰/یا ۳۰۰/گز کے فاصلے پر واقع ہے تاہم اس روڈ پر سلامی دروازے کا وجود اس امکان کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ عہد ماضی میں اُس تنگ راستہ کے دونوں طرف عمارتیں ہوا کرتی تھیں جو جنوب مشرقی سمت میں سلامی دروازہ سے موجودہ اصلی احاطے تک جاتا تھا۔

نہیں ہے، بنیادی اسباب حیات آسانی کے ساتھ دستیاب ہوجاتے ہیں۔جن دو میلوں کا ذکر ہیملٹن نے کیا ہے وہ بیشک اب بھی جاری ہیں بلکہ پہلے سے زیادہ شاندار اور وسیع پیمانے پر منعقد ہوتے ہیں، بس یوں سمجھ لیجئے کہ لگ بھگ ۱۸/رجب تا ۱۸/شعبان میلہ ہی کا سماں رہتا ہے جس میں لاکھوں افراد شرکت کرتے ہیں۔مزید یہ کہ بنگال کے اِس قدیم دارالحکومت میں حضرت علامہ سید مجتبیٰ اشرف کچھوچھوی علیہ الرحمۃ نے تقریباً دو دہائی قبل جامعہ جلالیہ علائیہ اشرفیہ کے نام سے ایک دینی ادارے کی بنیاد رکھی تھی جو اب الحمدللہ نہ صرف بنگال بلکہ پورے ہندوستان کا ایک ممتاز دینی ادارہ بن چکا ہے اور اُن کے فرزند ارجمند، عالی تبار، حضرت علامہ سید محمد جلال الدین اشرف اشرفی کچھوچھوی کے زیر سرپرستی دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے۔(خدا اسے اشرار سے محفوظ رکھے اور قدیم اسلامی بنگال کی علمی و ادبی وراثت کا امین بنائے)اس ادارے کا سالانہ جلسہ دستار و عرسِ بانئ ادارہ بھی ۲۲/رجب ہی کو منعقد کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے بھی زائرین کی تعداد کافی بڑھ جاتی ہے اور مجمع میں ایک علمی رنگ چڑھ جاتا ہے۔(میزان)

ہوا کرتی تھیں جو جنوب مشرقی سمت میں سلامی دروازہ سے موجودہ اصلی احاطے تک جاتا تھا۔

ایک چھوٹے سے دروازے کے ذریعے کمپاؤنڈ کے اندر داخل ہونے پر آگے جنوب مشرقی گوشہ میں ایک ویران اور اکیلی عمارت نظر آتی ہے جس میں چاند خان (اسی نے بھنڈار خانہ تعمیر کرایا تھا، آگے فصل ''ج'' کے تحت ملاحظہ فرمائیں)، اس کی بیوی اور بیٹے کی قبریں موجود ہیں۔ مقبرہ چاند خان کے سمت مخالف ایک مختصر سی گزرگاہ ہے جو کمپاؤنڈ کے اندرونی حصے تک جاتی ہے اور اس گزرگاہ کے شمالی حصے میں ایک جالی دار چلمن ہے جس کا ایک عکس تصویر نمبر ۱۸/ میں پیش کیا گیا ہے۔ گزرگاہ سے باہر نکلتے وقت جامع مسجد بالکل سامنے نظر آتی ہے اور لکھن سینی دالان بائیں طرف ایک چھوٹے سے تالاب کے مشرقی کنارے پر نظر آتا ہے۔ دائیں طرف حاجی ابراہیم کی قبر اور بھنڈار خانہ ہے اور بھنڈار خانہ کے مغربی سرے میں شیخ کا دوسرا چلہ خانہ ہے جبکہ تنور خانہ، بھنڈار خانہ کے جانب مشرق، شمال مشرقی گوشہ میں واقع ہے۔

حضرت شاہ جلال:

شاہ جلال کی پیدائش ایران کے شہر تبریز میں ہوئی اور اسی شہر کے شیخ ابو سعید کے مرید ہوئے۔ اپنے مرشد کی وفات کے بعد شیخ شہاب الدین سہروردی کی خدمت میں رہنے لگے اور ان کی ایسی خدمت کی کہ کسی دوسرے شیخ کے خادم نے کبھی اُن کی ویسی خدمت نہ کی ہوگی۔ کہا جاتا ہے کہ شیخ شہاب الدین ہر سال حج کیلئے مکہ جاتے تھے مگر بڑھاپے اور کمزوری کی وجہ سے دورانِ سفر مہیا کی جانے والی غذا کو ہضم کر پانا ان کے لئے ممکن نہ تھا اس لئے شیخ جلال الدین اپنے سر پر ایک انگیٹھی اور دیگچی رکھ لیتے اور انگیٹھی کو ہمیشہ جلائے رکھتے تا کہ جب کبھی شیخ کھانا مانگیں تو ان کے سامنے گرم گرم کھانا پیش کیا جا سکے۔ کہتے ہیں کہ شیخ الاسلام خواجہ نجم الدین صغری کے زمانے میں شیخ جلال الدین دہلی تشریف لائے مگر (حضرت) جلال الدین پر ایک جھوٹا الزام عائد کئے جانے کی وجہ سے آپ اتنے دل برداشتہ ہوئے کہ آپ نے دہلی کو خیر باد کہا اور بنگال تشریف لے گئے۔ جب وہ بنگال پہنچے تو آرام کرنے کیلئے ایک ندی کے کنارے بیٹھے مگر پھر اچانک اٹھے اور تازہ وضو بنایا اور پھر لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ شیخ الاسلام (دہلی) کا ابھی ابھی انتقال ہو گیا ہے، نماز جنازہ پڑھیں، اور پھر بعد میں ان کی بات ایک امر حقیقت ثابت ہوئی[1]۔ نماز جنازہ ادا کرنے کے بعد

1۔ اخبار الاخیار میں حالاتِ شیخ کے تحت تو مذکور ہے کہ یہ واقعہ قیام بنگال ہی کے زمانے کا ہے تاہم خزینۃ الاصفیاء، جلد دوم، ص: ۹۸۔ مکتبہ نبویہ، لاہور میں ہے کہ یہ واقعہ شیخ کے قیام بدایوں کے زمانے میں پیش آیا تھا۔ (میزان)

انہوں نے حاضرین سے فرمایا کہ ''چوں کہ شیخ الاسلام نے ہم کو دہلی سے باہر کیا اس لئے ہمارے شیخ ملا بھائی [1] نے اسے دنیا سے باہر کر دیا''۔شیخ نے پنڈوہ اور بنگال کے دیگر مقامات مثلاً دیوتلہ (وغیرہ) میں قابل لحاظ املاک پائی تھیں اور یہ جائیداد تاہنوز فقراء وغرباء کے افادہ کیلئے ایک متولی کے قبضے میں ہے۔شاہ جلال جب بنگال تشریف لائے تو انہوں نے اصنام کو مٹانا شروع کیا چنانچہ جگہ جگہ پر موجود شیخ کے چلہ خانے، غالباً اُن جگہوں کے قدیم ہندو پرستش گاہیں ہونے کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

شیخ کا عرس رجب کے مہینے میں منایا جاتا ہے اور اس خصوص میں مہینے کی پہلی تاریخ سے لیکر ۲۲رویں تاریخ تک تمام طرح کے زائرین اکٹھے ہوتے ہیں تاہم چلہ خانہ میں پورا ہی سال مسافروں کو کھانا کھلایا جاتا ہے۔کہتے ہیں کہ شیخ کی وفات ۷۳۸ھ مطابق ۱۳۳۷ء میں واقع ہوئی،[2] جیسا کہ اس فارسی مادۂ تاریخ سے ظاہر ہے: جلال الدین جلال الله جلال عرفاں بود۔۔ترجمہ: جلال الدین، اللہ کے جلال اور صوفیوں کے وقار تھے۔[3]

1۔شیخ کے پیرو مرشد تو حضرت ابوسعید تبریزی تھے۔علاوہ ازیں شیخ نے جن کاملان حق سے استفادہ فرمایا تھا ان میں بھی کسی کا نام یا لقب بطور ''ملا بھائی'' ہمارے ناقص علم میں نہیں ہے۔دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ شیخ کے تذکرہ نگاروں میں سے بھی کسی کے ہاں شیخ کے زیر نظر قول کو نقل کرتے ہوئے کسی 'ملا بھائی' کا ذکر نہیں ملتا۔حضرت محقق علی الاطلاق نے اس ضمن میں شیخ الشیوخ کا اسم گرامی پیش کیا ہے۔(میزان)

2۔شیخ کی تاریخ وفات کے سلسلے میں کافی زیادہ اختلاف ہے، چنانچہ فارسی اشعار میں ترسیم وقت یوں مذکور ہے:

شد چو از دنیا جلال الدین بخلد۔۔۔سال وصل آں والا مکان

زبدئہ دیں صاحب توحید گو۔۔۔ نیر اکبر جلال الدینؒ بخواں (۶۴۲ھ)

شعر دوم کے مصرع آخر سے تاریخ وفات ۶۴۲ھ برآمد ہوتی ہے اور اسی تاریخ کو 'تذکرۂ اولیاء پاک وہند' میں اختیار کیا گیا ہے جبکہ خزینۃ الاصفیاء میں تاریخ وفات ۶۴۵ھ بتائی گئی ہے۔اخبار الاخیار میں سوانح شیخ کے سرنامہ میں تاریخ وفات ۶۲۳ھ درج ہے۔علاوہ ازیں مندرجہ ذیل حاشیہ میں اسٹیپلٹن نے جو ایک امکانی تاریخ وفات کا ذکر کیا ہے وہ بھی کافی حد تک قابل غور ہے۔(میزان)

3۔مصنف نے اس تاریخ کو قبول کر کے واضح طور پر اس حقیقت سے اغماض کیا ہے کہ مشہور افریقی سیاح ابن بطوطہ، جو ۱۳۴۵ء اور ۱۳۴۶ عیسوی کو بنگال میں موجود تھا، نے کامرو کی پہاڑیوں میں شیخ کے ساتھ اُن کی خلوت گاہ میں

مزار حضرت شاہ جلال:

حضرت شاہ جلال کا مزار پنڈوہ میں نہیں ہے بلکہ سلہٹ یا بعض لوگوں کے مطابق جزائر مالدیپ میں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ شیخ کی موت کے وقت ان کے مریدوں میں سے ایک حاجی ابراہیم بیک وقت اُن سارے چلہ خانوں میں

﴿تصویر نمبر ۱۸﴾ سنگین جالی دار چلمن، چلہ خانہ شاہ جلال
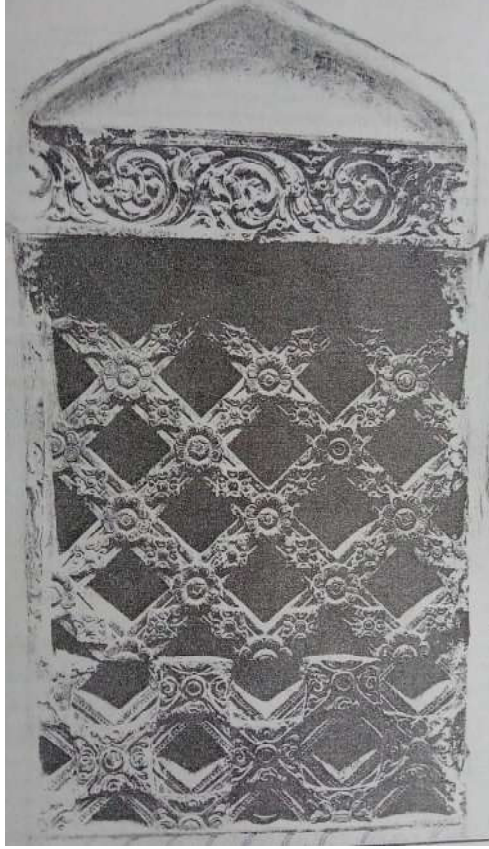
نمودار ہوئے جہاں جہاں شیخ نے چلہ کشی فرمائی تھی اور اُن تمام مقامات پر، شیخ کے وصال کی خبر دیکر، خود اُن کی بھی

ملاقات کی تھی اور ابن بطوطہ کا یہ بیان ہے کہ اُس نے ایک یا دو سال بعد اُس وقت شیخ کے وصال کی خبر سنی جب وہ چین پہنچ چکا تھا۔ اس لئے غالب گمان یہ ہے کہ حضرت جلال نے تقریباً ۱۳۴۶ء یا ۱۳۴۷ء (مطابق علی الترتیب ۷۴۶ھ یا ۷۴۷ھ) میں وفات پائی، جیسا کہ منشی الٰہی بخش نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ مذکورہ بالا مادۂ تاریخ میں امکانی طور پر محض اُس وقت کا بیان ہے جب شاہ جلال نے پنڈوہ کو آخری اور دائمی طور پر الوداع کہا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شیخ نے

موت واقع ہوگئی اس لئے ملک بھر میں متعدد مقامات پر حاجی ابراہیم کی قبریں واقع ہونے کی روایت موجود ہے۔ ایسا مانا جاتا ہے کہ حاجی (موصوف) کوئی اور نہیں، بلکہ خود شیخ ہی تھے۔ پنڈوہ میں بنا ہوا معروف مقبرہ ۹ر فٹ ۶ر انچ لمبا اور ۶ر فٹ ۲ر انچ چوڑا ہے۔

ب: جامع مسجد:

جیسا کہ یہ بات ماقبل ہی میں تحریر کی جا چکی ہے کہ اصلی مسجد روایتوں کے مطابق ۱۳۴۲ء میں سلطان علاء الدین علی شاہ کے ذریعے اُسی مقام پر تعمیر کی گئی ہے جہاں شاہ جلال مراقبہ کے لئے بیٹھا کرتے تھے۔ عہد ماضی میں شیخ کی نشست گاہ ایک نقرئی جنگلہ کے ذریعے گھیر دی گئی تھی۔ ۱۰۷۵ھ مطابق ۱۶۶۴ء میں فیروز پور، گور کے شاہ نعمت اللہ نے مسجد کی مرمت کا کام کرایا تھا۔ مخدوم جہانیاں جہاں گشت کا جھنڈا، اور علاوہ ازیں ایک اور قدیم علم اس عمارت میں اب تک محفوظ ہیں۔۔۔ عمارت کی مشرقی دیوار میں نصب کیا گیا کتبہ بایں طور موجود ہے:

چوں ایں عالی عمارت یافت ترتیب۔۔۔ شدہ تاریخ روشن آستاں باد (۱۰۷۵ھ)

ترجمہ: جب یہ پرشکوہ عمارت مکمل ہوئی، اس وقت ''روشن آستاں باد'' کی تاریخ تھی۔ (روشن رہے آستانہ)

ایک دوسری جگہ پر یہ عبارت لکھی ہوئی ہے:

ایں عمارت حضرت شاہ جلال است۔۔۔ راست کردہ شاہ نعمت اللہ

ترجمہ: یہ عمارت حضرت شاہ جلال کی ہے جس کی مرمت شاہ نعمت اللہ نے کرائی ہے۔

محرابوں اور گنبدوں کو سہارا دینے کیلئے عمارت کے اندر قائم کئے گئے سنگین ستون کافی زیادہ گراں بار ہیں۔ پتھر کی سلیں، جو چاروں طرف دیوار کے بالائی حصے پر آرائشی لکیروں کو پروجیکٹ کرتی ہیں، لگتا ہے کہ وہ ادینہ مسجد کے ''بادشاہ کا تخت'' والی شہ نشیں سے لائی گئی ہیں اور اِن سنگین تختوں میں سے ایک تختہ جس پر ایک طویل کندہ شدہ نقش موجود ہے، لازمی طور پر دوبارہ نصب کئے جانے کا تقاضا کرتا ہے تا کہ کتبہ پڑھا جا سکے اور تختہ محفوظ ہو۔ عمارت ۵۷ر فٹ لمبی، ۲۴ر

کافی دراز عمر پائی تھی، کیونکہ وہ خود کہتے ہیں کہ وہ اس وقت جوان اور بغداد میں موجود تھے جب ۱۲۵۸ء میں آخری خلیفہ مامون باللہ کی موت واقع ہوئی تھی۔ یہاں اس امر کی طرف بھی ضرور اشارہ کر دیا جانا چاہئے کہ شاہ جلال کے تمام دہلی والے معاصرین نے ساتویں صدی ہجری کے اوائل ہی میں وفات پالی تھیں سو یہ بات بہت ممکن ہے کہ دو یا دو سے زائد شیوخ کے درمیان ایک ہی نام مشترک ہونے کی وجہ سے کچھ اخلاط واقع ہو گئے ہیں۔ (ایچ، ای، اسٹیپلٹن)

فٹ چوڑی اور ۲۴ رفٹ اونچی ہے۔ مسجد کے جانبِ جنوب سجدہ گاہ کی مغربی دیوار پر ایک کتبہ موجود ہے اور یہ کتبہ قرآن کے دوسرے پارے سے سورہ البقرہ کی کچھ آیتوں پر مشتمل ہے۔

اندرونی احاطہ میں موجود تراشیدہ سنگین ستون اور دیگر قابل ذکر مشاہدات:

مسجد کے عین سامنے دو انتہائی خوبصورت تراشیدہ سنگین ستون ہیں جو بلاشک وشبہ کسی ہندومندر سے لائے گئے ہیں، قریب ہی ایک پتھر ہے جس پر شیخ غسل کیا کرتے تھے۔ علاوہٗ ازیں ایک گراں بار ستون کی بنیاد ہے جس پر مبینہ طور پر تقسیم خیرات کے وقت شیخ جلوس فرمایا کرتے تھے۔

﴿تصویر نمبر ۱۹﴾ بڑی درگاہ میں موجود تراشیدہ سنگین ستون
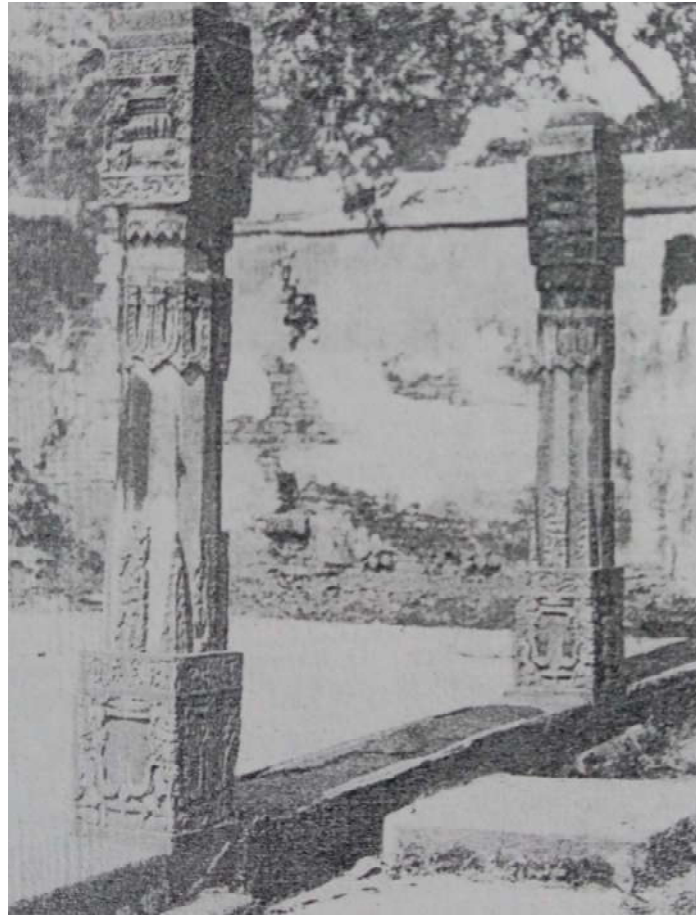
احاطہ کے اندر ایک کٹھل کا اور ایک انار کا درخت بھی پروان چڑھ رہا ہے، کہتے ہیں کہ ان دونوں درختوں کو حضرت شیخ جلال نے یہاں لگایا تھا۔ آخر الذکر درخت کی ڈالیاں اینٹوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکروں کے ذریعے نیچے کی طرف

جھکادی گئی ہیں۔جن لوگوں کے یہاں اولاد نہیں ہوتی یا دیگر امراض کے شکار ہیں وہ لوگ ان شاخوں پر اس غرض سے کپڑوں کی پٹیاں باندھتے ہیں کہ شیخ اُن کی بپتا دور کرنے میں ان کی مدد کریں گے۔

ج: بھنڈارخانہ:

۱۰۸۴ھ مطابق ۱۶۷۳ء میں یہ عمارت چاند خان نے تعمیر کرائی تھی، بظاہر یہ بھنڈارخانہ شاہ جلال کے آستانہ دوم پر مشتمل قدیم عمارت کا ایک شرق رو سلسلہ نظر آتا ہے۔آخر یہاں پر دو آستانوں کا اہتمام کیوں کیا گیا؟ اِس بارے میں مقامی روایت یہ ہے کہ جب حضرت شاہ جلال کے پیر [1] شیخ شہاب الدین سہروردی پنڈوہ تشریف لائے تو شاہ جلال نے انہیں مسجد کے اندر اپنی نشست گاہ پر بٹھایا، جب ان کے پیر رخصت ہوئے تو انہوں نے شمال مشرق میں تھوڑے ہی فاصلے پر اپنے لئے ایک دوسرا آستانہ تعمیر فرمالیا، کیونکہ وہ نشست گاہ جسے ان کے پیر نے استعمال کیا تھا، اُسے انہوں نے دوبارہ اپنے لئے استعمال کرنا بالکل ہی نامناسب خیال کیا۔

مشرق میں واقع آستانہ دوم سمیت پوری عمارت ۶۲ رفٹ ۴ رانچ لمبی، ۳۰ رفٹ ۶ رانچ چوڑی اور ۱۵ رفٹ ۱۰ رانچ اونچی ہے اور محاذی دیوار پر مندرجہ ذیل کتبہ نصب کیا گیا ہے۔

یا منعم۔۔ وتمم بسم الله الرحمن الرحيم بالخير۔۔ یا منتقم

جلال الدین شه تبریز مولد	که در مدحش زبانها شد گهر ریز
بر ایش چاند خان کرده ایں عمارت	که او از عرض اخلاص است لبریز
اگر پرسند که بود جلوه فرما	دریں معمار مینا وصفاخیز
دهن را شست وشو ده همچو ساحر	پس آنگه با زبان معنی خیز
جوابش در لباس سال تاریخ	بگو شاه جلال الدین تبریز (۱۰۸۴ھ)

از مصرعه آخر سنه هزار وهشتاد وچهار هجری بر می آید۔

ترجمہ: اللہ کے نام سے شروع جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا۔۔۔اے نعمتیں عطا کرنے والے! اے انتقام لینے

1۔حضرت شاہ جلال الدین تبریزی، حضرت ابوسعید تبریزی سے بیعت وارادت رکھتے تھے تاہم اپنے شیخ کی وفات کے بعد انہوں نے کافی عرصے تک شیخ الشیوخ حضرت شہاب الدین سہروردی کی خدمت میں رہ کر اُن سے

والے! خیروخوبی کے ساتھ اسے پایہ تکمیل تک پہنچا۔

اکتساب فیض کیا تھا۔۔۔مگر یہ مقامی روایت کہ ’’شیخ شہاب الدین سہروردی پنڈوہ تشریف لائے تو شاہ جلال نے انہیں مسجد کے اندر اپنی نشستگاہ پر بٹھایا‘‘ کلی طور پر من گھڑت اور تاریخی حقائق سے اغماض ہے۔۔۔’’تاریخ سہروردیہ ‘‘میں ہے کہ: سلسلہ سہروردیہ شیخ ابونجیب سہروردی سے شروع ہوا، آپ کے بھتیجے اور خلیفہ شیخ شہاب الدین عمر سہروردی نے سلسلہ سہروردیہ کو پھیلایا۔ یہ دونوں بزرگ ہند میں کبھی نہیں آئے۔ان کا سلسلہ ہند میں پہنچانے والے شیخ شہاب الدین سہروردی کے خلفاء ومریدین ہیں۔(تاریخ سہروردیہ،ص:۱۳۱،از: پرورفیسر ڈاکٹر محمد سعید،مطبوعہ: گیلانی پرنٹرز،کراچی)علاوہ ازیں صاحب طبقات الشافعیہ امام تقی الدین سبکی علیہ الرحمہ وغیرہ نے بھی شیخ الشیوخ کے جو احوال بیان کئے ہیں،اُن سے بھی واضح طور پر یہی پتہ چلتا ہے کہ شیخ الشیوخ حضرت شہاب الدین سہروردی کبھی ہندوستان تشریف ہی نہیں لائے، بلکہ شیخ بہاءالدین زکریا ملتانی، شیخ نورالدین مبارک غزنی، شیخ شرف الدین عراقی اور شیخ مجد الدین حاجی وغیرہم کی وساطت سے شیخ الشیوخ کا سلسلہ سہروردیہ ہندوستان میں پہنچا۔۔۔بعض حضرات نے اِس ضمن میں حضرت جلال الدین تبریزی کا اسم گرامی بھی پیش کیا ہے۔دراصل چونکہ شیخ جلال الدین تبریزی کچھ سال شیخ الشیوخ حضرت شہاب الدین سہروردی علیہ الرحمہ کی خدمت میں رہے اِسلئے کچھ حضرات نے انہیں سلسلہ سہروردیہ کا بزرگ تصور کرلیا، چنانچہ سلسلہ سہروردیہ کی اکثر کتابوں میں آپ کو ایک سہروردی بزرگ کی حیثیت سے متعارف کرایا گیا ہے۔اس خصوص میں خزینۃ الاصفیاء، زیرعنوان ’حضرت شیخ جلال الدین تبریزی قدس سرہ‘ کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں :(آپ)ابتدائی سلوک کے سات سال شیخ الشیوخ سہروردی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں رہے، غالبًا اسی وجہ سے بعض حضرات آپ کو سہروردیوں میں شمار کرتے ہیں،(کچھ جملوں کے بعد) کچھ عرصہ بعد آپ کی ملاقات حضرت خواجہ معین الدین سنجری قدس سرہ سے ہوئی، وہاں ہی آپ نے حضرت خواجہ قطب الدین اوشی کو دیکھا۔حضرت خواجہ قطب الدین نے آپ کو اپنی روحانی تربیت سے درجہ کمال تک پہنچا دیا، اور اس طرح ان کے خلیفہ خاص بنے اور خانوادہ چشت میں معروف ہوئے‘‘۔۔۔خیر! فی الحال بحث یہ نہیں ہے کہ شیخ جلال الدین تبریزی سہروردی تھے یا چشتی؟ بلکہ بحث یہ ہے کہ شیخ الشیوخ کبھی برصغیر میں تشریف لائے تھے یا نہیں؟ تو زمینی حقائق کے مطابق شیخ الشیوخ برصغیر ہندوپاک میں کبھی تشریف ہی نہیں لائے بلکہ برصغیر میں سلسلے کی یہ وسیع ترین نشرواشاعت اُن کے مریدین وخلفاء کی وساطت سے ہوئی اور اُنہی خلفاء ومریدین میں سے بعض حضرات نے شیخ جلال الدین تبریزی کے اسم گرامی کو بھی پیش کیا ہے۔اب

(۱) شاہ جلال الدین، جو تبریز میں پیدا ہوئے، کی مدح وثنا میں زبانیں گہر پاش ہیں۔(۲) چاند خان، جو پر خلوص نیتوں سے لبریز ہے، نے ان کے واسطے یہ عمارت تعمیر کرائی۔ (۳) اگر لوگ پوچھیں کہ اس شاندار اور چمکدار عمارت میں کون جلوہ فرما ہیں؟(۴-۵) (تو سب سے پہلے) ساحر کی طرح اپنے منہ کو باوضو بناؤ، پھر اس کے جواب میں معنی خیز زبان کے ساتھ سال تاریخ کے لباس میں کہو "شاہ جلال تبریز"۔ ۱۰۸۴ھ ۔۔۔۔ مصرع اخیر سے ۱۰۸۴ھ ہجری (مطابق ۱۶۷۳ء عیسوی) کی تاریخ برآمد ہوتی ہے۔

د: لکھن سینی دالان:

لکھن سینی دالان، بھنڈار خانہ کے جانب مخالف اور ماقبل میں بطور حوالہ پیش کئے گئے تالاب کے شمالی کنارے پر واقع ایک چھوٹی سی عمارت ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اسے ایک بیٹھک خانہ کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ عمارت اس لئے قابل ذکر ہے کہ اس کے مغربی دیوار پر ایک کتبہ نصب کیا گیا ہے، اسے دیکھ کر لگتا ہے کہ یہ کتبہ زمانہ ماضی میں شاہ جلال کے آستانہ اول یعنی جامع مسجد والی عمارت کے اوپر نصب کیا گیا تھا۔ کتبہ مندرجہ ذیل ہے:

آستانہ معظم حضرت مخدوم شاہ جلال تبریز از سید شاہ نعمت اللہ مرتب شدہ۔ چوں جنوب رویہ استقامت پشتہ نداشتہ بنا بر بتولیت مولوی ہیبت اللہ عمارت عظمی قدرے جنبش کردہ بود۔ محمد علی ساکن برجیہ متصدی گری قرار یافتہ۔ در استقامت (؟) رام رام پسر بیکل راج را مقرر نمودہ

سوال یہ ہے کہ جب مستند حوالوں کے مطابق حضرت شیخ الشیوخ برصغیر میں کبھی تشریف ہی نہیں لائے تو پھر یہ مقامی روایت کہ: جب حضرت شاہ جلال کے پیر شیخ شہاب الدین سہروردی پنڈوہ تشریف لائے تو شاہ جلال نے انہیں مسجد کے اندر اپنی نشست گاہ پر بٹھایا۔۔۔ الی آخرہ" بھلا کیونکر صحیح ہوسکتی ہے؟ ایسا لگتا ہے کہ بڑی درگاہ کے اندر دو چلہ خانے موجود ہونے کی "یقینی وجہ" پتہ نہ ہونے کی وجہ سے کسی شخص نے اپنی طرف سے ایک وجہ پیش کردی ہوگی اور چونکہ ہر نئی بات عوام کو بھلی معلوم ہوتی ہے، خاص طور سے اگر وہ بات دور دراز کی کوڑیوں پر مشتمل ہو اور یہ بات تو پنڈوہ سے لیکر بغداد تک جاتی تھی تو بھلا عوام کی طرف سے اِس کی پذیرائی کیوں نہ ہوتی؟ سو عوام نے اِس من گھڑت "وجہ" کو بغیر کسی تردد کے فوراً اہی آمنا وصدقنا کہا ہوگا اور پھر نسلاً بعد نسل یہ "وجہ" منتقل ہوتی رہی ہوگی جسے خان صاحب نے بھی بغیر جانچے پرکھے مقامی مزاج کے مطابق اپنی کتاب میں درج کردیا ہے(میزان)

بتاریخ ۲۲رجب المرجب سنہ ۱۱۳۴ ہجری مطابق سنہ ۱۱۱۹ بنگلہ مرتب گردید۔

ترجمہ: حضرت مخدوم شاہ جلال تبریزی کے باعظمت آستانہ کی سید شاہ نعمت اللہ نے اصلاح ومرمت کرائی تھی مگر چونکہ اس کے جنوبی حصے کی دیوار زیادہ مضبوط نہ تھی بنابریں مولوی ہیبت اللہ کے زمانہ تولیت میں یہ عظیم عمارت ہلکی سی جنبش کرگئی، اس لئے بَرجی کے رہنے والے محمد علی نے (آستانہ عالیہ کے) منیجر ہونے کے ناطے رام رآم پسر بیکل رآج کو (عمارت کی اصلاح ومرمت کے لئے) مقرر کیا۔ مرمت کا یہ کام ۲۲/رجب المرجب ۱۱۳۴ھ ہجری مطابق ۱۱۱۹ھ تاریخ بنگلہ (۱۷۲۲ء) میں مکمل ہوا۔

اس بات کی تحقیق بہت ہی دلچسپ ہوگی کہ یہ عمارت کیسے ''لکھن سین دالان'' کے نام سے معروف ہوگئی؟ اس حوالے سے کچھ لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ کچھ عرصہ کیلئے لکھن سین نام کا ایک آدمی آستانے کا متولی بن گیا تھا۔

ر: تنور خانہ:

یہ عمارت جو بھنڈار خانہ کے مشرق میں واقع ہے، اینٹوں سے بنی ہے اور ۴۹/فٹ لمبی، ۲۷/فٹ چوڑی اور ۱۶/فٹ ۶/انچ اونچی ہے۔ اِس مکان کے اندایک تنور (انگیٹھی) ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ شیخ دوران سفر اُسے اپنے سر پر رکھا کرتے اور اپنے مربی (شیخ الشیوخ) کے لئے گوشت اور روٹیاں پکایا کرتے تھے۔ عمارت پر نصب کئے گئے کتبے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ عمارت ۱۰۹۳ھ ہجری (مطابق ۱۶۸۲ء) میں سعد اللہ نامی کسی شخص کے ذریعے تعمیر کی گئی تھی۔ کتبہ مندرجہ ذیل ہے:

وتمم بسم الله الرحمن الرحيم بالخير

جلال الدین شه آں مقبول باری	فرشته خوی شاه دین و دنیا
مریدش ساخت سعد الله از جان	بعالم ایں بنای راحت افزا
زهے معمور بنیادے که از وے	خلائق راست تحصیل تمنا
خرد گفته چه سان است ایں عمارت	که آساید درو پیوسته دلها
سروش غیبتش در گوش دل گفت	گود والا مکان فیض آما

از مصرعه اخر سنه هزار ونود وسه هجری برمی آید۔

ترجمہ: اللہ کے نام سے شروع جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا۔۔۔(اے اللہ!) خیر وخوبی کے ساتھ اسے پایہ تکمیل تک پہنچا۔(۱) شاہ جلال الدین مقبول حق، فرشتہ صفت اور دین و دنیا کے بادشاہ تھے۔(۲) اُن کے مرید سعد اللہ نے انتہائی نیک نیتی کے ساتھ روئے زمین پر اس آرام دہ عمارت کی تعمیر کرائی۔(۳) آفریں! اس نفیس در پر جہاں پر خلائق کی آرزوئیں برآتی ہیں۔(۴) دانشوروں نے پوچھا کہ یہ کس قسم کی عمارت ہے جس کے اندر دلوں کو ہمیشہ سکون میسر آتا ہے؟(۵) تو جہان غیب سے ایک فرشتہ نے اس کے کان میں سرگوشی کی کہ فیض سے معمور یہ ایک عالیشان عمارت ہے۔ ۱۰۹۳ھ۔۔۔مصرع اخیر سے ۱۰۹۳ ہجری کی تاریخ برآمد ہوتی ہے۔

س: سلامی دروازہ:

یہ دروازہ مرکزی سڑک کے دائیں ہاتھ پر واقع ہے اور کامل ۲۲رفٹ لمبا اور ۷رفٹ ۹رانچ چوڑا ہے۔ دروازہ کے سامنے ایک چبوترہ ہے۔ کہتے ہیں کہ شیخ اسے بیٹھنے اور عبادت گزاری کے لئے استعمال کیا کرتے تھے۔ یہ دروازہ اینٹوں اور پتھروں سے بنا ہوا ہے۔ ابھی حالیہ دنوں آستانہ کے داروغہ نے دروازے کی چھت غلط طریقے پر ازسرنو تعمیر کرادی ہے، چنانچہ پہلے کی مسطح چھت اب کسی جھونپڑے کی شکل میں بدل گئی ہے۔ دروازہ کے اوپر کی سنگین چوکھٹ پر عربی حروف میں **اللہ، شاہ جلال** مکتوب ہے۔

دروازہ کے جنوب میں قریب ہی ایک بہت پرانا نیم کا درخت ہے۔ ایسا سننے میں آتا ہے کہ یہ درخت ایک مسواک، جس سے شیخ اپنے دانت صاف کرتے تھے، سے بنا ہے۔۔ دروازہ کے جانب مخالف ''گل چین'' نامی پھول کا ایک درخت ہے۔ مقامی لوگ بتاتے ہیں کہ یہ درخت روزانہ سڑک کے اوپر شیخ کے چبوترے تک جھک آتا ہے اور اس پر کافی سارے تازہ پھول بکھیر دیتا ہے۔ اس ڈالی کے بارے میں ایک دوسری کہانی یہ ہے کہ ایک مرتبہ ایک ہندو داروغہ (اورسیئر) کے مزدوروں نے اس ڈالی کو کاٹ دیا، جونہی ڈالی زمین پر گری، وہ داروغہ بھی اپنے ٹٹو پر سے گرا اور مرگیا۔ کہتے ہیں کہ کچھ مزدوروں نے بھی خون کی الٹیاں کرنا شروع کیں اور پھر ان سب کی موت واقع ہوگئی۔

آستانہ کے تئیں متفرق بیانات:

پوتھی مبارک۔۔۔یا۔۔۔کتاب مبارک: عہد ماضی میں شیخ کے قدیم آثار کے درمیان سنسکرت میں لکھی گئی ایک کتاب بھی تھی جو شیخ کی حیات اور کارناموں پر مشتمل تھی، مگر وہ کتاب اب نایاب ہے اور محض اس کا ایک ہی نسخہ باقی رہ گیا ہے۔ مسٹر یو، سی، باتویال آئی، سی، ایس، متوفی ضلع مجسٹریٹ، مالدہ نے زیر بحث عنوان پر مندرجہ ذیل نوٹ قلمبند

کیا ہے: ''میں نے ۷رنومبر ۱۸۹۲ء کو اس مسجد کی زیارت کی، مسجد کے اندر ایک صندوق میں کپڑے یا پھر زنبیل سے لپیٹ کر بنگلہ رسم الخط میں لکھے گئے دو قلمی نسخے محفوظ رکھے گئے ہیں جن میں سے ایک کھجور کے ورق پر اور دوسرا کاغذ پر ہے۔ یہ نسخے کرم خوردہ ہیں، جو نسخہ کھجور کی پتی پر ہے وہ بالکل ہی ریزہ ریزہ ہو چکا ہے اور دوسرا نسخہ جو کاغذ پر ہے اس کا اکثر حصہ نا قابل مطالعہ ہے، کیونکہ اوراق آپس میں باہم دگر چمٹ گئے ہیں۔ آستانہ کے داروغہ سید وحید علی نے مجھے بتایا کہ قدیم زمانے میں ایک ہندو شخص رکنکا رنارائن چودھری ان اوقاف کا متولی تھا۔ اسے گرفتار کرلیا گیا اور ڈھا کہ لیجا کر اس سے کہا گیا کہ وہ اپنے عہدے کا کوئی تحریری ثبوت پیش کرے، چونکہ وہ ایسا کوئی ثبوت پیش نہ کر سکا اس لئے اسے جیل میں ڈال دیا گیا۔ ایک رات اس نے شیخ کی طرف عریضہ پیش کیا تو اسے خواب میں بتایا گیا کہ تمام وثائق ''گنگا'' کے قبضے میں ہیں اور یہ کہ ''ندی کی دیوی'' ان دستاویزوں کو اوپری سطح پر پیش کردیگی بشرطیکہ نواب اس بات پہ راضی ہو کہ وہ ایک نقل بنالیگا اور اصلی وثائق کو دیوی کے حوالے کردے گا۔ چنانچہ اگلی صبح نواب نے رکنکا رنارائن کے ساتھ ایک محرر کو ندی کنارے بھیجا جہاں پر دو کتابیں موجوں کے سہارے تیرتی ہوئی آرہی تھیں، دونوں کتابیں نقل کی گئیں اور بعد ازاں دوبارہ ندی میں پھینک دی گئیں۔ موجودہ مسودات انہی نوشتوں کے نقل شدہ نسخے تھے۔[1] کہتے

1۔ وثائق کی بازیابی سے متعلق بیان کردہ واقعہ سے ہمیں نہ صرف اختلاف ہے بلکہ ہمارا ایقان یہ ہے کہ یہ واقعہ اِن تصورات کے ساتھ قطعاً محال اور نا قابل وقوع ہیں۔ غور طلب بات یہ ہے کہ شیخ ایک مرد مومن تھے، ولی کامل تھے، انہوں نے پوری زندگی احقاق حق اور ابطال باطل میں گزاری تھی، سوان کے بارے میں یہ تصور بھی محال ہے کہ وہ کسی گنگا کے تصرف یا کسی من گھڑت ندی کی دیوی (river goddess) پر یقین رکھتے تھے۔ یہ تو ایسی ہی بات ہوگئی جیسے کوئی کہے کہ یہ آگ یخ بستہ ہے یا یہ کہے کہ سورج کی کرنیں آج تو بے حد تاریک ہیں۔ ظاہر ہے کہ جس طرح زیر نظر دونوں جملوں کا مفہوم محال ہے کیونکہ دریں صورت اجتماع ضدین لازم آتا ہے، بعینہ اُسی طرح شیخ اور ''تصرف گنگا'' یا ''ندی کی دیوی'' کا تصور محکم دلائل اور یقینی شواہد کی بنا پر ایک دوسرے کی ضد ہیں، سواب اگر بالا واقعہ کے مندرجات کو صحیح تسلیم کرلیا جائے تو فوراً ہی 'اجتماع ضدین' لازم آجائیگا جو عقل سلیم کے نزدیک یکسر باطل اور محال ہے۔ غالبًا ان باتوں کا اندازہ سابق ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ آف مالدہ مسٹر یو، سی، باتویال کو بھی تھا، چنانچہ واقعہ کو نقل کرنے کے بعد اس کی صحت کی ذمہ داریوں سے پلہ جھاڑتے ہوئے انہوں نے رقم کردیا کہ: I give the story,as I heared it from Saiyid Wahid Ali, a daroga of dargah.(یہ) واقعہ میں نے اُسی

ہیں کہ مرحوم متولی، مولوی صدر الدین نے بنگلہ زبان میں کتاب کا ترجمہ بھی کیا تھا۔ [1]

''میں نے نسخوں کی زبان سنسکرت پائی، انتہائی احتیاط اور توجہ کے ساتھ وہ نسخے محفوظ رکھے گئے تھے۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ ایک برہمن ان نسخوں کی عبادت کیلئے آیا کرتا تھا۔ کہتے ہیں کہ لنکا رنا راین کو اس کے بعد ہی آزادی ملی تھی۔ علاوہٗ ازیں نواب نے کوتوال چاند خان [2] کو ایک لاکھ روپے کے ساتھ بھیجا تھا کہ وہ ان روپوں کو خیرات میں خرچ

طرح پیش کر دیا، جیسا درگاہ کے داروغہ سید وحید علی سے سنا تھا۔۔ گویا صحت کی بات آئے تو آپ جانو اور وحید صاحب جانیں، میں تو بس سنے ہوئے کو آپ تک پہنچا رہا ہوں۔ لیجئے! خود واقعہ نویس کی نظروں میں واقعہ کی اہمیت یہ ہے، باقی آپ اندازہ لگا لیں۔

حرف آخر کے طور پر راقم السطور کی توضیح یہ ہے کہ: حضرت جلال الدین تبریزی کی شخصیت کافی زیادہ مشہور تھی بلکہ ہے اور شہرت عامہ کا خاصہ ہے کہ اس میں بتدریج افسانویت شامل ہو جاتی ہے۔ جب صحابہ کرام کی مقدس زندگیاں ان افسانوی باتوں سے محفوظ نہ رہ سکیں، حد تو یہ ہے کہ احادیث مبارکہ میں بھی بدخواہوں نے من چاہی باتیں (موضوع احادیث) شامل کرنے کی تمام کوششیں کر ڈالیں تو پھر ہمہ شما کا کیا شمار؟ یقینی طور پر یہی کچھ حضرت شیخ کے ساتھ بھی پیش آیا، وہ شہرت عامہ کے حامل تھے سو ان کے کچھ بدخواہوں یا نادان احباب نے ان کے ساتھ بھی کچھ ایسی باتیں شامل کر دیں جو بہر صورت محال اور نا قابل وقوع تھیں جن میں سے ایک زیرِ نظر واقعہ بھی ہے۔ (میزان)

1۔ یہ صاحب بوہار، ضلع بردوان کے رہنے والے تھے، نام سید صدر الدین عرف نواب جان تھا، عظیم اسکالر تھے اور انہوں نے اپنی عربی و فارسی کتابوں کی شاندار 'لائبریری' کو ''امپیریل لائبریری'' میں محفوظ رکھنے کے لئے لارڈ کرزن کے حوالے کر دیا تھا۔ ان کی وفات ۱۹۰۵ء میں واقع ہوئی۔ (ایچ، ای، اسٹیپلٹن)

2۔ اگر یہ وہی چاند خان ہے جس نے بھنڈار خانہ تعمیر کرایا تھا تو بیان کردہ واقعہ اور کتابوں کے نقل کئے جانے کی تاریخ ۱۶۷۳ء سے پہلے کی ہے۔ چاند خان اُس دریا خان کا بیٹا تھا جس کی سنگ موسی سے تعمیر کی گئی قبر منشی الٰہی بخش کے مطابق شاہ پور کے مشرق میں ایک جنگل کے اندر پائی گئی ہے اور جس نے ۱۰۸۴ھ مطابق ۱۶۷۴ء میں ''سمہاسن بتیسی'' (تخت کی بتیس کہانیاں) کا ترجمہ بعنوان ''کتاب سریز'' کیا تھا۔ خان صاحب نے بھی یہ رقم کیا ہے کہ ''بامن گولہ'' کے شمال میں ۱۰ میل کے فاصلے پر واقع ''بھائی پور'' کا ایک شخص گریس چندر ارائے ولد ایشور چندر ارائے کا یہ دعوی ہے کہ وہ لنکا رنا راین چودھری ہی کی نسل کا ایک فرد ہے۔ (ایچ، ای، اسٹیپلٹن)

کرے۔واقعہ میں نے جس طرح آستانہ کے داروغہ سید وحید علی سے سنا تھا اسی طرح پیش کردیا۔افسوس کی بات ہے کہ یہ نسخے بحال کئے جانے کی کسی کوشش کے بغیر گلنے سڑنے کے عمل سے گزر رہے ہیں۔[1]

آستانہ شاہ جلال کی وقف املاک:

شاہ جلال تبریزی کے آستانے سے جڑی ہوئی املاک وقف جائیداد ہیں اور آستانے کی تولیت مع وقف املاک، جو شروع ہی سے آستانے کے تصرف میں ہیں، کی دیکھ بھال ایک ایسے متولی کے حوالے ہوتی ہے جو اوریجنل گرانٹ کے مسلمہ شرائط کے تحت وقف جائیداد کی آمدنی اور پیداوار کو اعراس کی انجام دہی، روشنی، آستانے کی مرمت اور تعلیم طلبا پر خرچ کرے۔اُس متولی پر یہ بھی لازم ہے کہ وہ ''لازوال حکومت'' کی بقا کیلئے دعا کرتا رہے۔وقف جائیداد کی موجودہ سالانہ آمدنی ۲۳۰۰۰/ہزار روپے ہے اور اِس رقم کے خرچ وصرف میں ایک کمیٹی متولی کی مدد کرتی ہے۔

1۔مسٹر باتویال نے وثائق کو ادھار لیا اور ان کی ایک کاپی تیار کرنے کے لئے بابو ہریداس پالت اور پنڈت رجنی کانتا چکرورتی، مالدہ کی خدمات حاصل کیں، مگر اس کے کچھ ہی دنوں بعد مسٹر باتویال کا ٹرانسفر ہوگیا اور پھر ۱۸۹۸ء میں ان کی موت واقع ہوگئی۔بعدازاں ان وثائق یا پھر نقل شدہ کاپی کی بابت کچھ پتہ نہ چل سکا۔تاہم بابو ہریداس پالت کے تصرف میں ایک مسودہ (rough copy) باقی رہ گیا تھا جس میں سے اس تحریر کا ایک ایڈیشن ۱۹۲۷ء میں کلکتہ کے بابوسُکو مارسین نے 'شیخ شُو بھودیا' (شیخ کا ورود مسعود) کے عنوان سے شائع کردیا ہے۔اندرونی تحریری شہادتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ''ورک'' بلاشبہ سولہویں صدی عیسوی کے اواخر کی ایک جعل سازی یا جعلی دستاویز ہے جو اغلب طور پر دور اکبری میں ٹوڈرمل کے کرایہ رول (rent roll) کاروائی کے دوران ''بائیس ہزاری اسٹیٹ'' پر حق ثابت کرنے کیلئے تیار کیا گیا تھا۔۔اِن نسخوں کا مصنف لکشمن سین کے ایک وزیر ''ہالا یودھا مسرا'' کو خیال کیا جاتا ہے مگر چونکہ اس میں اوڈیشہ کے راجہ کپیلیس ورا (۱۴۳۴ء۔۔۱۴۷۰ء) اور بنگال کے سلطان حسین شاہ (۱۴۹۳ء۔۔۱۵۱۸ء) دونوں ہی کا ذکر کیا گیا ہے سو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتاب ضرور ۱۵۰۰ء کے بعد مرتب کی گئی ہوگی۔اِس کتاب میں شاہ جلال کے ذریعے پانڈونگر گاؤں (ضلع ورنڈرا) جسے انہوں نے ایک کرامت کے ذریعے حاصل کیا تھا، میں ایک مسجد کی تعمیر کا ذکر ہے۔علاوہ ازیں، اس کتاب میں دیوتلہ گاؤں کے لکشمن سین کے ذریعے ان کو دیئے گئے تحفے کا بھی ذکر ہے۔راماوتی (گور) کا بھی ذکر کیا گیا ہے اور یہ بات بالکل صحیح طور پر بیان کی گئی ہے کہ تُرک جانب مشرق ''وِہاراپٹانا'' (بہار) سے ۱۱۲۴ سال ساکا مطابق ۱۲۰۲ء میں آئے تھے۔(ایچ،ای، اسٹیپلٹن)

﴿یادگار نمبر۲﴾ چھوٹی درگاہ

چلہ خانہ شاہ جلال کے شمال مغرب میں تقریباً چوتھائی میل کی دوری پر واقع اِس مشہور درگاہ کے احاطے کے اندر شیخ نور قطب العالم اوران کے والد (حضرت) علاء الحق کے مزارات (دیگر بہت ساری قبروں کے ساتھ) موجود ہیں۔ ان شیوخ کا اغلب طور پر یہ دعوی ہے کہ یہ عرب کے قبیلہ قریش، بالخصوص قدیم دورِ اسلامی کے مشہور ترین سپہ سالار (حضرت) خالد بن ولید کی اولادو اخلاف میں ہیں۔ اس طرح یہ حضرات بھی اسی نسب سے تعلق رکھتے ہیں جس سے (حضرت) محمد رسول (اللہ صلی اللہ تعالی علیہ وآلہ وسلم) تعلق رکھتے تھے۔

حضرت نور قطب العالم:

یہ مشہور شیخ اپنے والد کے روحانی جانشیں تھےاور کہا جاتا ہے کہ اِنہوں نے اپنے دنیادار بھائی اعظم خان، جوسکندر شاہ یا اس کے بیٹے غیاث الدین اعظم کے وزیر یا سپہ سالار تھے، کی جانب سے پیش کی گئی دربار میں ایک عہدہ قبول کرنے کی دعوت کوٹھکرادیا تھا۔ شیخ کی وفات کا مادۂ تاریخ 'نور بنور شد' ہے۔[1] ۹/ذی قعدہ ۸۱۸ھ مطابق ۱۴۱۵ء میں اپنی وفات سے قبل شیخ نور قطب عالم نے اُن واقعات میں اہم کردار ادا کیا تھا جو پندرہویں صدی عیسوی کے ربع اول میں رونما ہوئے تھے۔ اُن دنوں دو ہندو راجاؤں دَنوجہ مردانہ اور مہیندرا کی عارضی تخت نشینی عمل میں آ گئی تھی سو شیخ نے اول الذکر کے فرزند جلال الدین، جسے شیخ ہی نے داخل اسلام فرمایا تھا، کے ماتحت مسلم اقتدار کی فوری بحالئی نو کیلئے بالواسطہ بھرپور اپنا تعاون پیش کیا۔ ۱۸۰۸ء میں ہیملٹن نے ریمارک کیا ہے کہ مقامی لوگوں نے اُسے بتایا تھا کہ یہ ایک سچ ہے کہ بنگال کے اصلی بادشاہ یہی مشائخ تھے، کیونکہ ان کی خوشنودی کے باعث ہی ایسا ہوسکتا تھا کہ دنیادار بادشاہ حکومت کرسکتے تھے۔

روضہ نور قطب العالم کے اردگرد موجود ستون:

شیخ کا مزار ایک سفید لیلن والے شامیانہ، جو چار سرخ سنگین ستونوں پر قائم ہے، سے ڈھکا ہوا ہے۔[2] مزار کے

1۔ بلوچ مین نے مادۂ تاریخ 'شمس الہدایۂ' پیش کیا ہے جو ۸۵۱ھ مطابق ۱۴۴۷ء سے ہم آہنگ ہے مگر مابعد میں پیش کئے گئے شجرۂ نسب سے یہ بات واضح ہے کہ یہ مادۂ تاریخ درست ثابت نہیں ہوسکتا ہے۔ (ایچ، ای، اسٹیپلٹن)

2۔ شاید پہلے ایسا تھا، اب تو پکی چھت، گنبد اور اردگرد سینے تک آہنی جنگلہ کے ساتھ الگ ستونوں پر ایک کھلا ڈھانچہ قائم کردیا گیا ہے۔

سرہانے کی طرف ایک پانچواں ستون بھی ہے جس پر مندرجہ ذیل فارسی کتبہ نصب کیا گیا ہے۔ کتبے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۰۲۰ھ مطابق ۱۶۱۲ء میں ان ستونوں کو پیرزاد نامی ایک شخص نے پیش کیا تھا۔ کتبے کا پڑھنا تو کافی مشکل ہے تاہم وہ کچھ اس طرح نظر آتا ہے:[1]

کمترین گدا ابن حاتم الملت پیرزاد خان ایں ستونہا را از ملک اسپانیہ به آستانہ حضرت برہان الحق والدین شیخ نور قطب العالم به نذر فرستاد بتاریخ شہر ربیع الاول سنه ہزار و بیست (باحتمال ؟) کمال ابن درویش مالمی واستاد گوپال۔

ترجمہ: ماہ ربیع الاول ۱۰۲۰ھ (مطابق ۱۶۱۲ء) میں کمترین گدا، ابن حاتم الملت پیرزاد خان نے ملک اسپانیہ سے حضرت برہان الحق والدین شیخ نور قطب العالم کے آستانہ کیلئے یہ ستون کمال ابن درویش مالمی اور استاد گوپال کی نگرانی میں بطور نذر بھیجے ہیں۔ (خان صاحب کے لفظوں میں کتبے کے آخری جز کا ترجمہ یوں ہوگا کہ: یہ ستون کمال ابن درویش مالمی کے چارج میں بھیجے گئے تھے اور گوپال کی نگرانی میں نصب کئے گئے۔)

سرخ سنگین ستونوں کے حوالے سے ایک مقامی روایت یہ ہے: آدم سوداگر نامی ایک ایرانی تاجر بیش قیمت اسباب تجارت کے ساتھ پانی جہاز کے ذریعے ہندوستان آرہا تھا، اس کے ساتھ یہ ستون بھی تجارت ہی کیلئے تھے مگر اثنائے راہ سمندر میں ایک شدید طوفان نے اسے گھیر لیا، اس نے شیخ نور قطب العالم کی (روحانی) قوت کے بارے میں سن رکھی تھی سو اُس نے پوری انکساری کے ساتھ اپنے بچاؤ کے لئے شیخ کے حضور التجائیں پیش کرنے لگا اور یہ منت مانی کہ اگر وہ اس مصیبت سے نجات پالے تو پنڈوہ میں حضرت شیخ کی تعظیم بجالائے گا اور اپنا آدھا مال شیخ کی خدمت میں پیش کردے گا۔ جب وہ اس طرح سے التجائیں کررہا تھا، اُس وقت شیخ پنڈوہ اپنے گھر میں خط بنوار ہے تھے۔

1۔ میں منت کش ہوں مولوی نجم الحسین معاون ناظم اسلامی تعلیمات برائے مدارس راج شاہی ڈویژن کا کہ انہوں نے نہ صرف اس پر نظر ثانی کی بلکہ دیگر کتبات کے سلسلے میں کافی تعاون دیا، مثلاً اگلے دو سیکشن میں ذکر کردہ کتبے جو اب حضرت علاء الحق کے روضے کے گرد احاطہ بندی پر موجود ہیں۔ میں اُن کا اس لئے بھی منت کش ہوں کہ انہوں نے اس کتاب کے آخر میں دیوتلہ کے مسلم نام کی اہم ترین تصحیح کی جسے بلوچ مین نے ''تبریز آباد'' کی بجائے غلطی سے ''تیرو آباد'' رقم کردیا تھا۔ (ایچ، ای، اسٹیپلٹن)

اچانک آپ نے حجام سے خط سازی بند کرنے اور اپنی آنکھیں بند کرنے کیلئے کہا اور شیخ نے اس وقت تاجر کی طرف سے اللہ کی بارگاہ میں دعا کی۔ کہتے ہیں کہ تاجر کو اسی وقت مدد ملی اور اس کا جہاز بندرگاہ میں پہنچا دیا گیا۔ کچھ دیر کے بعد شیخ نے حجام سے کہا کہ وہ اپنی آنکھیں کھولے اور اپنا کام جاری رکھے۔ حجام نے دیکھا کہ آپ کا ہاتھ پانی سے تر ہے تو اس نے شیخ سے پوچھا کہ اس کا سبب کیا ہے؟ شیخ نے اولاً انکار کیا، تاہم اس کے شدید اصرار پر جو کچھ واقع ہوا تھا، بتادیا۔ کہتے ہیں کہ جب وہ تاجر ہندوستان پہنچا تو سب سے پہلے وہ شیخ کی بارگاہ میں آیا اور اپنی نصف دولت انہیں پیش کرنی چاہی مگر شیخ نے قبول کرنے سے انکار کر دیا، اِس پر اُس تاجر نے شیخ کے ساتھ اپنی بیٹی کا نکاح کرا دیا اور یہ پانچ سرخ ستون ان کی خدمت میں پیش کئے۔ مزید یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اُس تاجر نے اپنی بقیہ زندگی شیخ ہی کے ساتھ گزاری اور وفات بھی پنڈوہ ہی میں پائی۔ اس کی قبر روضہ شیخ علاء الحق کے جنوب میں واقع آستانہ کی قبرستان میں تاہنوز دیکھی جاسکتی ہے۔[1]

شیخ علاء الحق (قدس سرہ):

روضہ شیخ علاء الحق جواُن کے لڑکے کی تربت کے عین مشرق میں واقع ہے، کی چہار دیواری کے دروازے کے اوپر نصب کئے گئے کتبے کے مطابق شیخ علاء الحق پدر بزرگوار حضرت نور قطب العالم کا اصلی نام اغلب طور پر احمد تھا اور وہ عمر بن اسعد خالدی کے فرزند تھے۔ گویا اقرار دعوی کے طور پر یہ دونوں مشائخ عرب کے قبیلہ قریش سے تعلق رکھتے تھے اور اس طرح رسول (علیہ السلام) کے قرابت دار بھی ہوئے۔ شیخ علاء الحق کا اندرونِ ملک کی ایک بہت ہی دولت مند فیملی سے تعلق تھا اور وہ اخی سراج الدین عثمان، گور کے روحانی جانشیں بھی تھے۔[2] کہتے ہیں کہ جب شیخ اخی سراج کو

1۔ تاجر پیرزاد کی معلوم تاریخ (۱۶۱۲ء) کے مدنظر یہ داستاں فقط شیخ کی اولاد ہی میں سے کسی کی طرف منسوب کی جاسکتی ہے، شیخ کی طرف بالکل بھی نہیں، کیونکہ شیخ تو پیرزاد کے ذریعے ان ستونوں کو پیش کرنے سے دوسو سال قبل ہی وصال فرما چکے تھے۔ (ایچ، ای، اسٹیپلٹن)

2۔ بلوچ مین کا کہنا ہے کہ شیخ اخی سراج الدین نے بنگال میں ۷۵۸ھ مطابق ۱۳۵۷ء میں وفات پائی (جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ۱۸۷۳ء، ص: ۲۶۰) جبکہ منشی الٰہی بخش کے پیش کردہ مادۂ تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ نے ۷۴۳ھ مطابق ۱۳۴۲ء میں وفات پائی تھی۔ اس پیراگراف اور ملحقہ نوٹ کے اندر پیش کی گئی تواریخ میں موجود تضادات کو دیکھتے ہوئے اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ تواریخ کی مزید چھان بین کی جائے۔ (اسٹیپلٹن)

حضرت نظام الدین اولیاء سے خلافت حاصل ہوئی اور وہ بنگال کیلئے روانہ ہونے لگے تو انہوں نے کہا کہ وہاں تو ایک ذی علم اور ذی رتبہ شخص قیام پذیر ہیں، آخران کے ساتھ میرا نباہ کس طرح ہوگا؟ تو حضرت نظام الدین نے جواب دیا کہ فکرمت کیجئے، وہ آپ کے خادم بن جائیں گے۔ اور پھر ایسا ہی ہوا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ شیخ سراج الدین ملک بھر میں سفر کیا کرتے اور پکا ہوا کھانا ساتھ ہی لیکر چلتے سو شیخ کے خدام ایک گرم دیگچی شیخ علاء الحق کے سر پر رکھ دیا کرتے جس سے اُن کے سر کے سارے بال جل گئے تھے۔ شیخ علاء الحق اسی حال میں اپنے رشتہ داروں، جو بادشاہ کے وزراء تھے، کے گھروں کے سامنے سے گزرا کرتے۔ (تلخیص: خورشید جہاں نما، از منشی الٰہی بخش) یہ بھی کہتے ہیں کہ سکندر شاہ، جو ۱۳۵۸ء میں تخت نشیں ہوا تھا، نے شیخ علاء الحق کو سنارگاؤں بھیج دیا تھا مگر بعد میں جب اعظم شاہ نے بغاوت کی تو اس نے شیخ کو پنڈوہ واپسی کی اجازت دے دی۔ شیخ نے ۲۵/رجب ۷۸۶ھ مطابق ۱۳۸۴ء میں وفات پائی اور آپ کی وفات کا مادۂ تاریخ ''علاء الحق واصل شد'' ہے۔۔۔ کہا جاتا ہے کہ جب حضرت علاء الحق کی وفات ہوئی تو مخدوم جہانیاں جہاں گشت پنڈوہ میں پہنچے اور آپ کی نماز جنازہ پڑھائی۔[1]

روضہ شیخ علاء الحق کی چہار دیواری کے دروازے کے اوپر نصب کیا گیا کتبہ:

رَونشا نے اپنی کتاب 'گور' کے پلیٹ نمبر ۲۹/میں روضہ کی چہار دیواری کا جو فوٹو گراف پیش کیا ہے اُس میں دروازہ کے اوپر کوئی نصب شدہ کتبہ نظر نہیں آتا، تاہم ابھی چند سالوں پہلے جب مرمت کی گئی تو دروازہ کے اوپر عربی و فارسی میں مخلوط دو لائن والا ایک بہت ہی دلچسپ کتبہ نصب کیا گیا۔ اس کتبے کا ماضی میں کوئی ریکارڈ نظر نہیں آتا، اور جہاں تک موجودہ حالت میں کتبے کا پڑھا جانا ممکن تھا اُس کے مطابق کتبہ کچھ یوں ہے:

اللہ لا الہ الا ھو الحی القیوم لاتاخذہ سنة و لا نوم لہ مافی السموت ومافی الارض من ذا

1۔ بلوچ مین نے جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، سن اشاعت: ۱۸۷۳ء۔ ص:۱۶۲/میں بتایا ہے کہ شیخ علاء الحق کی وفات یکم رجب ۸۰۰ھ مطابق ۲۰/مارچ ۱۳۹۸ء میں واقع ہوئی، تاہم اگر شیخ علاء الحق اس وقت بالکل جوان تھے جب شیخ اخی سراج، ۱۳۲۵ء میں حضرت نظام الدین اولیا کی وفات کے بعد، بنگال آئے اور شیخ علاء الحق اُن کے ایک ادنی خادم بنے تو یقیناً شیخ کی پیدائش صدی کے اوائل ہی میں ہوگی۔ نتیجہ کے طور پر ۷۸۶ھ میں شیخ ضرور ایک عمر رسیدہ شخص ہوں گے۔ (اب سنئے) سفینۃ الاولیاء کے مطابق مخدوم جہانیاں بلفظ دیگر سید جلال الدین بخاری کی وفات تو ۷۸۵ھ ہی میں ہو چکی تھی، یعنی شیخ علاء الحق کی مجوزہ تاریخ وفات سے بھی پہلے۔ (ایچ، ای، اسٹیپلٹن)

الذی یشفع عندہ الا باذنہ یعلم مابین ایدیھم وماخلفھم ولا یحیطون بشئی من علمہ الا بماشاء وسع کرسیہ السموت والارض ولایؤدہ حفظھما وھو العلی العظیم ... یسبح الرعد بحمدہ والملئکۃ من خیفتہ... العافیۃ بالخیر باد۔

ایں در بنا کردہ بیاد دادگی حضرت شیخ الاسلام تاج الامۃ بدر الواصلین مقبول بارگاہ رب العلمین امیدوار حضرت صمد شیخ بابو محمد خالدی سلمہ اللہ تعالٰی فی الدارین مقام بندگی صالحین استانہ حضرت سلطان العارفین قطب الاقطاب قتیل محبۃ وھاب حضرت عالم مخدوم شیخ نور الحق والشرع والدین احمد عمر بن اسعد خالدی صاحب مقامی کہ افتاب و ماھتاب فلک بر سر شما باشد خدائے تعالٰی قائم دارد بتاریخ ثالث ماہ رجب رُجب قدرہ سنۃ ثمانین (۹) وتسع مأۃ۔

ترجمہ: اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ خود زندہ اور دوسروں کو قائم رکھنے والا ہے، اسے نہ اونگھ آتی ہے نہ نیند، اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اسی کا ہے۔ وہ کون ہے جو اس کے یہاں اس کے حکم کے بغیر سفارش کرے؟ وہ جانتا ہے جو کچھ ان کے آگے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے اور وہ اس کے علم میں سے اتنا ہی (حصہ) پاتے ہیں جتنا وہ چاہے، اس کی کرسی میں سمائے ہوئے ہیں آسمان اور زمین، اور ان کی حفاظت اس پر کچھ مشکل نہیں، اور وہی ہے بلند بڑائی والا۔ (سورہ البقرہ، پارہ:۳۔ آیۃ الکرسی)۔۔۔ گرج اسے سراہتی ہوئی اس کی پاکی بولتی ہے اور فرشتے اس کے ڈر سے۔ (سورہ الرعد، پارہ:۱۳، آیت:۱۳) خاتمہ خیر وخوبی کے ساتھ انجام پائے۔

ترجمہ فارسی پیراگراف: حضرت شیخ الاسلام، تاج الامۃ، بدرالواصلین (اور) مقبول بارگاہ رب العلمین کی یاد میں حضرت بے نیاز کی (رحمتوں) کے امیدوار شیخ بابو محمد خالدی سلمہ اللہ تعالیٰ فی الدارین نے صالحین کی جائے عقیدت (اور) حضرت سلطان العارفین، قطب الاقطاب، قتیل محبت وہاب، حضرت عالم، مخدوم شیخ نور الحق والشرع والدین احمد عمر ابن اسعد خالدی صاحب مقامی کے آستانہ (میں) اس دروازے کی تعمیر کرائی۔ جب تک آسمان کے چاند سورج آپ کے سر پر تاباں رہیں، اس وقت تک خدائے تعالیٰ اسے قائم رکھے۔ (یہ کام) ماہ رجب، اس کی قدر ومنزلت قائم رہے، کی تیسری تاریخ ۹۸۰ھ (مطابق ۱۵۷۲ء) میں مکمل ہوا۔

یہ کتبہ خصوصیت کے ساتھ بایں وجہ آ گہی طلب ہے کہ یہ بڑی مشکلوں سے حضرت نورقطب عالم کے والد کی طرف اشارہ کرتا ہے جس سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اس کتبے کے لکھے جانے تک ایک ''سالک'' کی حیثیت سے شیخ علاء الحق کی جو شہرت اور مقبولیت تھی وہ اب فراموش کر دی گئی ہے۔اس کتبے کا خاص مفاد البتہ اس میں ذکر کردہ نام ہیں، گمان غالب یہ ہے کہ بابومحمد دراصل ''بو یا محمد'' ہے جبکہ ان ناموں کا اصلی محور آخر میں موجود نام ''احمد عمر بن اسعد خالدی'' ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ مسجد قطب شاہی، جو آستانہ کے شمال میں بس تھوڑی ہی دوری پر واقع ہے، کے بانی نے اس کتبے کو اس کے موجودہ محل وقوع کے قرب وجوار ہی میں کہیں رکھا تھا۔۔۔منیجر کے تصرف میں موجود شجرۂ نسب کی طرف رجوع کرنے پر یہ باتیں ظاہر ہوتی ہیں (الف) شیخ ابدال، جو خود حضرت نورقطب العالم کے عظیم پوتے تھے، کے باعظمت پوتے کا نام محمد تھا اور اِنہی آخر الذکر موصوف کے ایک صاحبزادے تھے جنھیں لوگ بابو کے نام سے پکارتے تھے۔(ب) نورقطب العالم کا اصلی نام احمد تھا (ج) اور یہ کہ اُن کے والد شیخ علاء الحق کیلئے جب تک کوئی (عرفی) نام تجویز نہیں کیا گیا تھا، انہیں 'عمر اسعد لاہوری' کے نام سے پکارا جاتا تھا۔اس کتبے کی مرکزی اہمیت یہ ہے کہ یہ کتبہ خانوادے کے اس دعوی کو تقویت فراہم کرتا ہے کہ یہ لوگ حضرت خالد بن ولید کے نسب سے ہیں اور ساتھ ہی خانوادہ کے اُس فرد پر تازہ روشنی ڈالتا ہے جس نے مسجد قطب شاہی کی تعمیر کرائی۔[1]

1۔ابھی حال ہی میں (۱۹۳۰ء) اس کتبے سے آگاہی حاصل ہوئی اور اس کا مطالعہ کیا گیا، اس لئے (اس کتبے کے تئیں ابھی) اِس سے زیادہ کچھ کیا جانا ممکن نہیں ہے کہ مناسب جگہ پر اس کے ایک تذکار کو شامل کر دیا جائے۔رہی بات مسجد قطب شاہی کے تئیں کتبے کی، تو اِس حوالے سے موجودہ انکشافات کی روشنی میں ابھی مزید تحقیق وتفتیش کی ضرورت ہے۔(ایچ،ای،اسٹیپلٹن)

شجرۂ نسب خانوادۂ قطبیہ، پنڈوہ

(۱) مخدوم شیخ علاء الحق (تاریخ وفات اغلب طور پر: ۱۳۸۴ء)۔ ان کے ہاں چار بیٹے ہوئے: شیخ محمد اعلی، شیخ محمد اعظم، شیخ محمد قاضی اور شیخ احمد نور قطب العالم۔ (آخر الذکر نے ۱۴۱۵ء میں وفات پائی)

(۲) شیخ نور قطب العالم کے ہاں دو بیٹے ہوئے: شیخ افقہ یا رفعت الدین اور شیخ انور شہید۔ (آخر الذکر کی تاریخ شہادت: ۱۴۱۸ء ہے) شیخ انور کے بھی دو بیٹے ہوئے: شیخ اجمل اور شیخ اکمل۔

(۳) شیخ افقہ کے بیٹے تھے: شیخ زاہد۔ (جنہوں نے ۱۴۵۵ء میں وفات پائی)

(۴) شیخ زاہد کے ہاں دس بیٹے ہوئے: شیخ صوفی، شیخ پیر معلیٰ (ان جناب کے دو بیٹے ہوئے تھے مگر آخر کار ان کی نسل موقوف ہوگئی)، شیخ اشرف، شیخ درویش، شیخ قلندر، شیخ احمد، شیخ غوث (۱۴۹۳ء تک حیات تھے۔ مظفر شاہ کا کتبہ ملاحظہ فرمائیں)، شیخ قطب، شیخ اوتاد اور شیخ ابدال۔ (آخر الذکر جناب کے ہاں بھی ایک بیٹا ہوا تھا، نام تھا خلیل الرحمٰن، مگر بالآخر خانوادے کی اس نسل کا سلسلہ بھی منقطع ہوگیا)

(۵) شیخ اشرف کے ہاں چار بیٹے ہوئے: شیخ شریف، شیخ بہاء الدین، شیخ مشرف (عرف: شیخ راجہ یا رضا) اور شیخ کبیر۔

(۶) شیخ مشرف کے بیٹے تھے: شیخ احمد۔

(۷) شیخ احمد کے بیٹے تھے: شیخ محمود۔

(۸) شیخ محمود کے بیٹے تھے: شیخ نظام الدین۔

(۹) شیخ نظام الدین کے بیٹے تھے: شیخ شرف الدین۔ (۱۶۴۸ء میں حیات تھے۔۔۔سند)

(۱۰) شیخ شرف الدین کے بیٹے تھے: شیخ حمید الدین۔

(۱۱) شیخ حمید الدین کے بیٹے تھے: شیخ کبیر۔ (۱۶۴۸ء میں حیات تھے۔۔۔سند)

(۱۲) شیخ کبیر کے تین بیٹے ہوئے: شیخ نور الدین، شیخ درگاہی اور شیخ قطب الدین۔

(۱۳) شیخ قطب الدین کے بیٹے تھے: شیخ بدر الدین۔

(۱۴) شیخ بدر الدین کے ہاں ایک بیٹا ہوا: شیخ قمر الدین (شیخ قمر الدین کے دو بیٹے تھے: شیخ نجم الدین اور شیخ شمس الدین) اور ایک بیٹی ہوئی: بی بی ننھی زوجہ سید شاہ چاند ماہ ولی، اک لاکھی، بردوان۔

(۱۵) بی بی نھنھی زوجہ سید شاہ چاند ماہ ولی کے بیٹے تھے: سید شاہ غلام حسین، (۱۸۱۰ء سے قبل ہی وفات پا چکے تھے اوران کا نکاح بی بی سید النساء کے ساتھ ہوا تھا)

(۱۶) سید شاہ غلام حسین کے بیٹے تھے: سید شاہ غلام نجف، داخل کار۔

(۱۷) سید شاہ غلام نجف کے ہاں دو بیٹے ہوئے: شاہ فرمان علی (جن کا نکاح حبیب النساء، اک لاکھی، بردوان کے ساتھ عمل میں آیا تھا) اور شاہ فتح علی۔

(۱۸) شاہ فرمان علی کے ہاں ایک بیٹی ہوئیں: بی بی ساجد النساء زوجہ چودھری موحد الرحمٰن، رول، بانکورہ۔

(۱۹) بی بی ساجد النساء زوجہ چودھری موحد الرحمٰن کے بیٹے تھے: چودھری مجد الرحمٰن۔

(۲۰) چودھری مجد الرحمٰن کے ہاں ایک بیٹی ہوئیں: بی بی شمس النہار، زوجہ ڈاکٹر محمد صدیق، کلکتہ۔

(۲۱) بی بی شمس النہار زوجہ ڈاکٹر محمد صدیق کے ہاں چار بیٹے ہوئے: سید اصغر احمد (مرحوم، ۔۔ابھی تو سبھی مرحوم ہیں، یہ خان صاحب کے وقت کی بات ہے۔مترجم)، سید شمس الرحمٰن، ایک اور صاحبزادے (نام ندارد، مترجم) اور سید بدر الزماں۔[1]

1۔ شش ہزاری اسٹیٹ کے موجودہ منیجر کی طرف جب رجوع کیا گیا تو پتہ یہ چلا کہ خان صاحب کا پیش کیا گیا شجرۂ نسب پنڈوہ میں موجود نسب نامہ کی کاپی سے مجموعی طور پر کافی الگ ہے، خصوصیت کے ساتھ ۱۵۰۰ء کے مابعد والی پشتوں میں۔اس لئے یہاں پنڈوہ والا ورژن ہی چھاپ دیا گیا ہے، باوجود یکہ اِس شجرہ کی صحت وصداقت میں بھی کافی سنجیدہ شکوک موجود ہیں، اس لئے کہ اصل دستاویز کو کچھ وقت پہلے ایک فقیر نے مستعار لیا تھا اور پھر اس نے وہ دستاویز واپس ہی نہیں کی، چنانچہ یہ دستاویز صرف ایک 'نقش ثانی' ہے جو اس فقیر کے ایک ساتھی کے پاس سے حاصل کیا گیا ہے۔بہر کیف! چونکہ سید شاہ غلام حسین کا نام، شاہ محمد ولی (جو اس کے والد کے لقب کی ایک بگڑی ہوئی شکل نظر آتی ہے) کی جگہ مکرر آچکا تھا اس لئے مندرجہ ذیل حقائق اور تحقیقات کی روشنی میں آخری حصے کی تصحیح کردی گئی ہے۔

(الف) بوچانن ہیملٹن نے ۱۸۱۰ء میں اپنی کتاب 'پورنیہ' میں تحریر کیا ہے کہ یہ اسٹیٹ اُس وقت سید النساء نامی ایک خاتون (بیوہ غلام حسین) کے زیرانتظام تھی

(ب) ۱۸۲۹ء میں بورڈ آف ریونو کی گزارش پر اُس وقت کے دیناجپور کلکٹر مسٹر جے، ڈبلیو، ٹیج کے ذریعے کی گئی تفتیش کے خلاصہ میں اِس اسٹیٹ (خواہ یہ مددِ معاش کے طور پر رہی ہو یا بطور وقف) پر بات کرتے ہوئے یہ بیان کیا

شش ہزاری اسٹیٹ کی دستاویز:

ایک روایت ہے کہ سلطان حسین شاہ نے حضرت نور قطب العالم کی اولاد میں سے ایک شخص شرف الدین ابن نظام الدین کو وقف کی کفالت کیلئے ۴۷/لگان معاف گاؤں پیش کئے تھے۔[1] گزرتے وقت کے ساتھ یہ دستاویز بوسیدہ ہوگئیں تاہم زمانہ ماضی کے ایک نگراں کار شیخ کبیر نے شاہ شجاع کے سامنے یہ وثائق پیش کئے تھے۔شاہ شجاع نے ۲۵/شعبان حکومتِ شاہ جہاں کے ۲۲/رواں سال، مطابق ۱۰۵۸ھ (۱۶۴۸ء) میں شیخ کبیر کو ایک تازہ منظوری عطا کی، سواب دستاویز پر شاہ شجاع کی مہر لگی ہوئی ہے۔

احاطہ درگاہ کے اندر قابل ذکر مقامات:

احاطہ چھوٹی درگاہ کے اندر موجود مندرجہ ذیل مقامات انتہائی اہم اور قابل دید ہیں۔

الف: چلہ خانہ شیخ نور قطب العالم:

یہ چلہ خانہ شیخ کے مزار سے متصل جانب مغرب واقع ہے، اگرچہ عمارت پرانی ہے تاہم چھت اور برآمدہ بعد کے

گیا ہے کہ سید شاہ غلام نجف، جو اُس وقت سجادہ نشیں تھے، مرحوم سید شاہ غلام حسین اوران کی بیوہ بی بی سید النساء کے بیٹے تھے۔اگر ہم ایک نسل کیلئے تیس سال مقرر کریں اور ۱۶۴۸ء سند سے غلام غوث کی تاریخ معروف (۱۷۹۳ء) تک الٹی گنتی شروع کردیں اور پھر بی بی شمس النہار (جو تاہنوز ایک جوان خاتون ہیں) تک نیچے آجائیں تو نسلوں کی متوقع تعداد اور شجرۂ نسب میں پیش کئے گئے نمبر شمار کے درمیان کوئی تضاد باقی نہیں رہیگا۔اس لئے ممکنہ طور پر اِس شجرۂ نسب کو اس کی موجودہ شکل وصورت میں لگ بھگ درست گردانا جاسکتا ہے۔(ایچ،ای،اسٹیپلٹن)

1۔شجرۂ نسب میں (شیخ) علاء الحق اور شرف الدین کے درمیان ۸/نسلیں (تقریباً ۲۵۰/سال) نمایاں ہیں اس لئے یہ روایت صحیح نہیں ہوسکتی۔کیونکہ حسین شاہ تو ۱۵۰۰ء میں یا شیخ علاء الحق کے تین چار نسل بعد ہی مدار عروج پر پہنچ گیا تھا۔ ۱۸۴۱ء میں شش ہزاری اسٹیٹ کے لکھی راج (یعنی لگان معافی کی امتیازی خصوصیت) کی تصدیق کے ایک ''ریفرینس'' سے معاملے کی صحیح صورت حال کچھ اس طرح ظاہر ہوتی ہے کہ ۱۰۵۸ھ میں شاہ شجاع نے شرف الدین کے نام پر ایک سند منظور کی تھی اور شرف الدین کا پوتا کبیر اس وقت سجادہ نشیں تھا۔سرکار جس میں یہ اسٹیٹ واقع تھی، کا نام جنت آباد تھا۔موجودہ منیجر کا کہنا ہے کہ گرچہ یہ سند شرف الدین کے نام پر منظور کی گئی تھی تاہم اُس نے اُس سے پہلے ہی اسٹیٹ کا انتظام کبیر کے حوالے کردیا تھا۔(ایچ،ای،اسٹیپلٹن)

سالوں کی تعمیر نظر آتے ہیں۔ یہ عمارت اینٹوں سے بنی ہے جس کے ظاہری سطح پر پتھر چن دیئے گئے ہیں اور یہاں سائڈ میں سنگ تراشی کے بہترین نمونے بھی نظر آتے ہیں۔ جانب مشرق تین دروازے موجود ہیں جن میں سے ہر ایک کے اوپر ایک ایک کتبہ نصب کیا گیا ہے۔ جو کتبے دائیں اور بائیں بازوں میں نصب کئے گئے ہیں وہ زیادہ پڑھے جانے کے قابل نہیں ہیں تاہم رَونَشا کی 'گور' میں پیش کی گئی 'بازتخلیقات' میں اتنی باتیں امکانی طور پر دیکھی جاسکتی ہیں کہ سابق الذکر کتبے میں قلیل المدت سلطان، ناصرالدین ابوالمجاہد محمود شاہ دوئم (ربیع الثانی ۹۸۶ھ) کے وقت میں الوغ مجلس خان اعلی کے ذریعے ایک مسجد کی تعمیر کا ریکارڈ ہے اور ساتھ ہی یہ بھی نظر آتا ہے کہ ایک شخص الوغ طاہر خان نے اسے ایک یادگار مسجد کے طور پر قائم کیا ہے۔ درمیانی کتبہ البتہ واضح اور قابل مطالعہ ہے اور اس کتبے میں روضہ شیخ کے ''درونِ صوفی خانہ'' واقع ہونے کی بات کہنے سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ کو (رسول علیہ السلام کی طرح) ان کے اپنے ہی گھر میں دفنایا گیا تھا جو گھر اب ناپید ہو چکا ہے تاہم ۱۴۹۳ء میں از سر نو ایک عمارت قائم کردی گئی ہے۔

اس مقام پر یہ بات بھی ذکر کردینی چاہئے کہ مقامی لوگ مرکزی احاطہ بندی کے شمال مشرق میں واقع 'مہمان خانہ' کو 'صوفی خانہ' کے نام سے پکارتے ہیں۔ محمد غلام غوث، جن کا ذکر کتبے میں ہوا ہے، وہ حضرت نور قطب العالم کے باوقار پوتوں میں سے ایک تھے۔ کتبے کے الفاظ مندرجہ ذیل ہیں:

قال الله تعالیٰ ان اول بیت وضع للناس للذی ببکة مبٰرکا وھدی للعٰلمین فیه اٰ یات بینٰت مقام ابرٰھیم و من دخله کان اٰمنا ولله علی الناس حج البیت من استطاع الیه سبیلا ومن کفر فان الله غنی عن العٰلمین☆ بنیت فی البیت الصوفی الروضة لقطب الاقطاب قتیل محبة وھاب شیخ المشائخ حضرت شیخ نور الحق والشرع والدین سید قطب عالم قدس الله سرہ العزیز ونورالله قبرہ بنی ھذا البیت فی عھد السلطان العادل الباذل الفاضل غوث الاسلام والمسلمین شمس الدنیا والدین ابو النصر مظفر شاہ سلطان خلد الله ملکه وسلطنته واعلی امرہ وشانه بنی ھذاالبیت فی خلافة شیخ الاسلام والمسلمین شیخ المشائخ بن شیخ المشائخ شیخ محمد غوث سلمه الله تعالیٰ دائمًا مؤرخًا السابع والعشر من شھر رمضان المبارک فی سنة ثمان وتسعین وثمان مأة۔

ترجمہ: اللہ تعالی نے فرمایا: بیشک لوگوں کی عبادت کے واسطے جو سب سے پہلا گھر مقرر ہوا وہ ہے جو مکہ میں ہے، برکت والا اور سارے عالمین کے لئے رہنما☆ اس میں کھلی نشانیاں ہیں ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ، اور جو اس

میں آئے امان میں ہو، اور اللہ کیلئے لوگوں پر اس گھر کا حج کرنا ہے جو اس تک آنے کی استطاعت رکھے اور جو منکر ہو تو اللہ سارے جہاں سے بے پرواہ ہے ☆ قطب الاقطاب، کشتہ محبت وہاب، شیخ المشائخ، شیخ نور الحق والشرع والدین، عالی مقام حضرت قطب عالم قدس اللہ سرہ العزیز ونور اللہ قبرہ کا روضہ صوفی خانہ کے اندر بنایا گیا۔ انصاف ور، سخی اور علم وفضل والے بادشاہ، اسلام اور مسلمانوں کے حاجت روا، دین ودنیا کے آفتاب، ابوالنصر سلطان مظفر شاہ، اللہ اس کی مملکت وسلطنت کو سدا قائم رکھے اور اس کی قدر ومنزلت کو بلند فرمائے، کے عہد میں اس گھر کی تعمیر عمل میں آئی۔ شیخ الاسلام والمسلمین، شیخ المشائخ ابن شیخ المشائخ، شیخ محمد غوث، اللہ تعالی انہیں ہمیشہ سلامت رکھے، کے (زمانہ) خلافت میں ۱۷ر رمضان المبارک ۸۹۸ھ (مطابق ۲ر جولائی ۱۴۹۳ء) کو یہ گھر بنایا گیا۔

ب: باروچی خانے میں لگا کتبہ:

چلہ خانہ کے عین شمال میں شیخ کا باورچی خانہ واقع ہے جس کی گزرگاہ میں شمال کی طرف نکلنے والے دروازے کے اوپر ناصر الدین محمود شاہ اول، جس کے ذریعے الیاس شاہ کا گھرانہ دوبارہ ۱۴۴۲ء میں تخت بنگال پر رونق افروز ہوا تھا، کے وقت کا ایک بہت ہی خوبصورت کتبہ نصب کیا گیا ہے۔ اس کتبے میں لطیف خان نامی ایک شخص کے ذریعے ایک امام (ممکنہ طور پر حضرت نور قطب العالم کے پوتے شیخ زاہد کے بلا واسطہ جانشیں) کی تعمیر قبر کا ریکارڈ ہے اور اس پر ۲۸ر ذی الحجہ ۸۶۳ھ (مطابق ۲۶ر اکتوبر ۱۴۵۹ء) کی تاریخ درج ہے۔ کتبہ، جس کی ایک نقل پلیٹ نمبر ۵ر میں پیش کر دی گئی ہے، کچھ اس طور پر موجود ہے:

قال الله تعالٰی کل نفس ذائقة الموت وقال الله تعالی اذا جاء اجلهم لا یستأخرون ساعة ولا یستقدمون قال الله تعالی کل من علیها فان ویبقی وجه ربک ذو الجلال والاکرام وانتقل مخدومنا العلامة استاذ الائمة برهان الامة شمس الملة حجة الاسلام والمسلمین نافع الفقراء والمساکین مرشد الواصلین والمسترشدین من دار الفناء الی دار البقاء فی الثامن والعشرین من ذی الحجة فی یوم الاثنین وکان ذلک فی سنة ثلث و ستین وثمان مآة فی عهدسلطان السلاطین حامی بلاد اهل الاسلام والمسلمین ناصر الدنیا والدین ابو المظفر محمود شاه سلطان صانه الله بالامن والامان وبنی هذه الر وضة خان الاعظم لطیف خان سلمه الله من البلیات والآفات۔

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے ارشادفرمایا: ہرنفس کوموت کا مزہ چکھنا ہے☆اور(ایک دوسرے مقام پر) اللہ تعالی نے فرمایا: جب ان کا اجل آئے گا تو وہ نہ تو ایک لمحہ پیچھے ہٹیں گے اور نہ ہی ایک لمحہ آگے بڑھیں گے☆ اللہ تعالی نے (ایک اور مقام پر) فرمایا: زمین پر جتنے بھی ہیں سب فنا ہونے والے ہے، اور باقی رہنے والی ہے تمہارے رب کی ذات، عظمت اور بزرگی والا۔

ہمارے فاضل اجل مخدوم، اماموں کے استاذ، امت کی روشن دلیل، ملت کے آفتاب، اسلام اور مسلمانوں کی محکم سند، غربا ومساکین کے منفعت بخش، وصل آرزو سے شادکام ہونے والوں اور راہ ہدایت کی طلب رکھنے والوں کے مرشد ۲۸ر ذی الحجہ بروز سوموار ۸۶۳ھ کو۔۔۔ شاہوں کے شاہ، بلاد اہل اسلام کے نگہباں، ناصر الدنیا والدین ابوالمظفر سلطان محمود شاہ، اللہ اُسے سایہ امن وامان میں محفوظ رکھے، کے عہد میں۔۔۔ دار فنا سے دار بقا کی طرف کوچ کرگئے۔ اور اس روضے کو خان اعظم لطیف خان، اللہ اُسے آفات ومصائب سے محفوظ رکھے، نے تعمیر کرایا۔

ج: سجدہ گاہ:

باورچی خانے والی گزرگاہ کی محاذی دیوار سجدہ گاہ کے طور پر کام کرتی ہے جس کے سامنے چلہ خانہ کی زیارت کرنے والے لوگ نمازیں ادا کرسکتے ہیں اور اسی دیوار کے شرقی رخ پر ایک بڑا سا کندہ شدہ پتھر نصب کیا گیا ہے جس پر یہ عبارتیں درج ہیں:

قال النبی صلی الله علیه وسلم من بنی مسجدًا لله بنی الله له قصرا فی الجنة ☆ بنی هذا المسجد فی زمن السلطان العادل الباذل شمس الدنیا والدین ابو المظفر یوسف شاہ السلطان بن باربک شاہ السلطان بن محمود شاہ السلطان خلد الله ملکه و سلطانه مجلس المجالس مجلس اعلیٰ اعلی الله تعالیٰ شانه فی الدارین وکان ذالک فی التاریخ هجرة النبی صلی الله علیه وسلم فی یوم الجمعة عشرین شهر رجب رُجب قدره سنة اربع وثمانین وثمانمأة۔

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا: جس نے اللہ (کی رضا) کیلئے ایک مسجد بنائی، اللہ اس کے لئے جنت میں ایک محل بنائے گا۔ انصاف ور، فیاض اور صاحب علم وفضل بادشاہ، شمس الدنیاوالدین، ابوالمظفر سلطان یوسف شاہ ابن سلطان باربک شاہ ابن سلطان محمود شاہ اللہ اس کی مملکت اور قوت کو ہمیشہ قائم رکھے، کے زمانے میں عالی مقام مجلس، مجلس المجالس، اللہ تعالی دونوں جہاں میں اس کے وقار وتوقیر کو بلند فرمائے، نے ۲۰ر رجب، اس کی قدر ومنزلت قائم رہے، بروز جمعہ ۸۸۴ھ ہجرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں اس مسجد کی تعمیر کرائی۔

یہ بات تو بالکل عیاں ہے کہ یہ نفیس وعمدہ کتبہ دراصل کسی ایسی مسجد سے تعلق رکھتا ہے جو یوسف شاہ کے عہد حکومت میں ۸۸۴ھ مطابق ۱۴۷۹ء کو تعمیر کی گئی تھی، اور یہ کہ یہ کتبہ کسی اور جگہ سے یہاں آستانہ میں لایا گیا ہے۔ کتبے کی ایک نقل رَوَنشا کی ''گور'' کے پلیٹ نمبر ۴۷ر میں دیکھی جاسکتی ہے۔

د: مسجد قاضی نور:

یہ ایک اینٹوں سے بنی تین گنبدوں والی مسجد ہے جو روضہ مخدوم علاء الحق کے عین شمال میں واقع ہے، اِس کا طول و عرض ۵۸ر فٹ برابر ۲۴ر فٹ ہے اور دروازے کے اوپر کوئی کتبہ موجود نہیں ہے۔[1]

ر: میٹھا تالاب:

احاطہ آستانہ کے مشرقی جانب ایک تالاب ہے، کہتے ہیں کہ یہ مخدوم علاء الحق کے زمانے میں کھودا گیا تھا، یہاں کی گھاٹیں آس پڑوس کی تباہ شدہ عمارتوں سے لائے گئے پتھروں سے بنائی گئی ہیں، ابھی چند سالوں پہلے ادینہ مسجد کے منبر کا ایک پتھر تالاب کے شرقی گھاٹ میں دریافت ہوا تھا۔[2]

س: بہشت کا دروازہ:

روضہ حضرت نور قطب العالم کے جنوب مشرق میں واقع یہ ایک واحد گنبد والی چھوٹی سی عمارت ہے۔ کہتے ہیں کہ اس عمارت کے اندر حضرت نور قطب العالم کے پوتے شیخ زاہد کی پیدائش ہوئی تھی، بنابریں یہ عمارت مقدس ہوئی۔ زائرین اس امید کے ساتھ اِس کی زیارت کرتے ہیں کہ اُن کے گناہ اگلے جہاں میں معاف کردیئے جائیں گے۔ دروازہ کے اوپر خط پیچیدہ میں ایک کتبہ نصب کیا گیا ہے مگر ان میں صرف یا اللہ اور یا فتاح ہی پڑھے جانے کے قابل

1۔حال ہی میں (۱۹۳۰ء) شیخ کی زندہ اولادوں میں معمر ترین بی بی شمس النہار نے نئی طرز پر اس مسجد کی مرمت کرائی ہے۔(اسٹیپلٹن)

2۔کہتے ہیں کہ ایک بار ایک جوگی نے شیخ کی خدمت میں ایک سنگ زرکش (touch-stone) وہ سیاہ پتھر جس پر سونے چاندی کو گھس کر کھرا کھوٹا پرکھتے ہیں) پیش کیا جسے شیخ نے اٹھا کر اس تالاب میں پھینک دیا۔ اس کے بعد جب جوگی نے پتھر کو بازیافت کرنے کے لئے تالاب میں ڈبکی لگائی تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ تالاب کی تہہ میں لاتعداد سنگہائے زرکش موجود ہیں۔ بہرحال! بڑی مشکل سے اس نے اپنا پتھر تلاش کیا اور پھر ''رنگا ماٹیا'' کے نزدیک ایک جگہ فروکش ہوگیا۔ اسی لئے آج اس جگہ کو ''جوگیا آسن'' کہتے ہیں۔(ایچ، ای، اسٹیپلٹن)

ہیں، ویسے کہتے ہیں کہ اس پر اسم اعظم لکھا ہوا ہے۔ عام اعتقاد یہ ہے کہ آسیب زدہ لوگوں کو اس مقدس جگہ کے دروازہ کے نزدیک لانے پر اُن کا آسیب دور ہو جاتا ہے اور اِن دلچسپ رسوم جن کی انجام دہی پر بدروحیں دور ہو جاتی ہیں، کی شہادت کے طور پر زیر بحث جگہ کو گھیرے ہوئے توہم پرست لوگوں کا ایک جم غفیر دیکھا جا سکتا ہے۔

ص: کالا پتھر:

یہ یادگار روضہ مخدوم علاء الحق کے مشرق میں تھوڑے ہی فاصلے پر واقع ہے اور یہ عنایت اللہ نامی ایک بچے کی قبر ہے جو خراسان کے ایک ذی وقار اور ذی ثروت شخص سبزؔوار کا بیٹا تھا۔ قبر مرمرِ سیاہ سے بنی ہوئی ہے۔ یکم رمضان المبارک ۱۰۱۷ھ مطابق ۱۶۰۸ء میں بچے کو دفنایا گیا تھا، اور پتھر پر کتبہ کچھ اس طرح موجود ہے:

اللہ اکبر

لوح قبر طفل معصوم عنایت الله بن طاهر محمد بن عماد الدین حسین ابن سلطان علی سبزواری نور الله مرقده غرّة رمضان سنة ۱۰۱۷ هجری۔

ترجمہ: یہ تختی معصوم بچے عنایت اللہ کی قبر پر نصب کی گئی جو طاہر محمد ابن عماد الدین حسین ابن سلطان علی، سبزوار کا بیٹا ہے۔ اللہ اس بچے کی قبر کو منور فرمائے۔ یکم رمضان المبارک ۱۰۱۷ہجری (مطابق ۲۹ر نومبر ۱۶۰۸ء)۔

ط: مقبرہ شیر خان:

کالا پتھر کے نزدیک شیر خان ولد جوہر خان کی قبر ہے۔ بتاتے ہیں کہ وہ سبزوار کے امیر و شریف شخص کے ہاں ایک فوجی ملازم تھا۔

ع: مزارات شیخ افقہ و شیخ انور:

یہ لوگ علی الترتیب حضرت نور قطب العالم کے سب سے بڑے اور سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ شیخ افقہ، جنہیں منشی الٰہی بخش کی جانب سے پیش کئے گئے شجرۂ نسب میں رفعت الدین کے نام سے یاد کیا گیا ہے، اپنی کسر نفسی اور انکساری کی وجہ سے مشہور تھے اور ان کی قبر ان کے والد کے نزدیک ہی واقع ہے۔ شیخ انور کے بارے میں کہتے ہیں کہ انہیں راجہ کانس کے ہاتھوں سنارگاؤں میں شہادت ملی تھی۔ وہ اپنی سادگی و سخاوت کیلئے معروف تھے، وہ بھیڑیں پالا کرتے اور انہیں فقراء کیلئے ذبح کر دیا کرتے تھے، حالانکہ خود انہوں نے کبھی گوشت کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ ان دونوں برادران کے مزارات کے درمیان دو اور دیگر برادران کی بھی قبریں ہیں، یہ دونوں بھائی حضرت نور قطب العالم کے

انتہائی مخلص اور باوفا خدام تھے۔ایک کا نام معین الاسلام تھا اور دوسرے کا عین الاسلام۔خورشید جہاں نما (اسی کتاب سے خانوادۂ قطبیہ کے پیش کردہ اکثر حالات ماخوذ ہیں) کے مصنف منشی الٰہی بخش کا خیال ہے کہ ان (وفا کیش برادران) میں سے بڑے والے امکانی طور پر انہی بدرالاسلام کے والد معین الدین عباس ہیں جنہیں صاحب ریاض السلاطین کے مطابق راجہ کانس کی تعظیم سے انکار کرنے کے جرم میں ۱۴۱۵ء سے پہلے ہی راجہ کانس نے قتل کر دیا تھا۔

(۱) کتبہ سکندر شاہ۔ادینہ مسجد، پنڈوہ۔ ۷۷۰ھ۔ (۲) کتبہ ناصرالدین محمود شاہ اول، پنڈوہ۔ ۸۶۰ھ۔
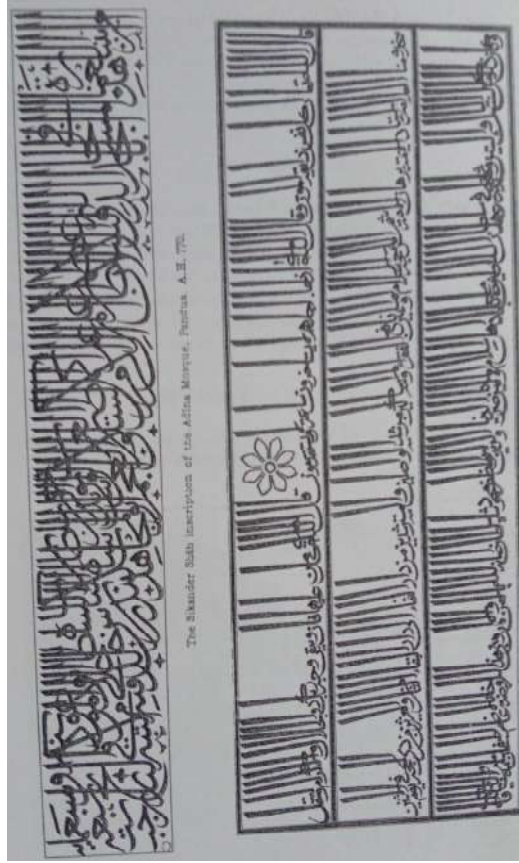
پلیٹ نمبر ۶

ف: مزار شیخ زاہد:

شیخ زاہد شیخ افقہ کے بیٹے اور حضرت نور قطب العالم کے پوتے تھے۔ان کا مزار ان کے والد ہی کے نزدیک سمتِ جنوب میں واقع ہے اور وہ پتھر جس پر وہ عبادت کرتے تھے، ان کی قبر کے عین مغرب میں موجود ہے۔ان کے دس بیٹے تھے۔ ۱۷ ربیع الاول ۸۶۰ہجری مطابق ۱۴۵۵عیسوی میں انہوں نے وفات پائی۔ان کی وفات کا مادۂ تاریخ ''حب دنیا چیزے نداشت'' ہے۔

ق: بی بی محل:

یہ حضرت نور قطب العالم کی حرم کا گھر تھا، یہ آستانہ کے شمال میں واقع تھا اور اب تو ٹوٹی پھوٹی عمارت کا ایک ڈھیر ہی ہے۔ محل وقوع پر پڑی ہوئی نقش ونگار والی اینٹوں کو دیکھ کر ایسا خیال کیا جاتا ہے کہ جلا کار اینٹوں کے ذریعے عمارت کی ظاہری سطح آراستہ کی گئی تھی۔ کہتے ہیں کہ گراؤنڈ فلور اینٹوں کے ان انباروں کے نیچے دبا ہوا ہے۔ سردل وغیرہ کے کچھ تراشیدہ پتھر تاہنوز اس جگہ موجود ہیں۔

ل: عظیم الجثہ پتھر:

ایک بھاری بھرکم سنگین بلاک، جو قطر میں ۶ رفٹ ۹ رانچ اور ۳ رفٹ ۹ رانچ موٹا ہے، بی بی محل کے جنوب میں پڑا ہوا ہے۔ اُسے دیکھ کر لگتا ہے کہ یہ کسی سنگین ستون کی چوٹی تھا اور اِس کی ایک تصویر رَونشا کی 'گور' (تصویر نمبر ا، پلیٹ نمبر ۳۰) میں دے دی گئی ہے۔ مقامی لوگ اسے حضرت نور قطب العالم کے نہانے کی نشست گاہ بتاتے ہیں۔ ۱۸۹۶ء عیسوی میں اسٹیٹ کے اُس وقت کے منیجر نے اس پتھر کو ہٹایا تھا اور مجوزہ خفیہ خزانے کی تلاش میں ایک گڑھا کھودا گیا تھا، وہ گڑھا اب تک رویت پذیر ہے اور گڑھے کے اندر کافی گہرائی تک اینٹوں کی تعمیر دیکھی جاسکتی ہے۔

م: مسافر خانہ اور دروازہ:

یہ عمارت درگاہ کی احاطہ بندی سے باہر شمال مشرقی گوشے میں واقع ہے۔ مسافر خانہ، جسے مقامی لوگ صوفی خانہ سے تعبیر کرتے ہیں، کا استعمال اِن دنوں ایک ڈاک گھر کے طور پر کیا جاتا ہے۔[1] دروازہ منقش ٹائیلوں سے تعمیر کیا گیا تھا جس کے نشانات دیواروں پر تاہنوز موجود ہیں تاہم عمارت اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں ہے اور چھت کو قدیم چوبی شہتیروں اور برگس سے ڈھک دیا گیا ہے۔ دروازے کی دہلیز ایک سیاہ سنگ مرمر ہے اور دروازہ منطقۃ البروج کی علامات پر مشتمل ہے۔ دروازہ کے ایک کواڑ پر کچھ نشانات موجود ہیں جن کے بننے کا سبب دَھکر پوش[2] یا خرقہ

1۔ خان صاحب کے زمانے یا شاید مابعد کے کچھ زمانوں تک بھی یہ جگہ ڈاک گھر کے طور استعمال کی جاتی رہی ہو لیکن آج یہاں کوئی ڈاک گھر نہیں ہے۔ (میزان)

2۔ اگر صحیح نام دَھکر پوش ہی ہے تو یہ (بزرگ) ممکنہ طور پر مخدوم غریب الحسین دھکر پوش ہیں جن کو رائے گنج، ضلع دیناجپور کے شمال مشرق میں ۶ رمیل کے فاصلے پر ایک مسجد کے اندر دفنایا گیا تھا۔ یہ تحریری آگاہی بوچانن ہیملٹن کی ہے۔ حوالہ: ہسٹوریکل ڈسکرپشن آف دیناجپور، ص: ۳۴۔ (ایچ، ای، اسٹیپلٹن)

پوش (وہ شخص جو بوسیدہ کپڑے کا کوئی ٹکڑا پہنتا ہو) نامی ایک فقیر کو بتایا جاتا ہے۔ آباء واجداد سے چلی آرہی روایت کے مطابق وہ فقیر بھوکا اور آبلہ پا دروازہ کے پاس آیا اور داخلہ سے روک دیئے جانے پر اپنے سر سے کواڑ پر زوردار ٹکر ماردی۔

بعدازاں جب وہ شائستہ لباس پہن کر آئے تو انہیں کھانے میں شریک ہونے کی اجازت دے دی گئی۔ کہتے ہیں کہ انتظامیہ کے رویے پر انہوں نے خود سے اس طرح بدلہ لیا کہ سامنے رکھا کھانا اپنے کپڑوں کو کھلانے لگے۔

﴿تصویر نمبر ۲۰﴾
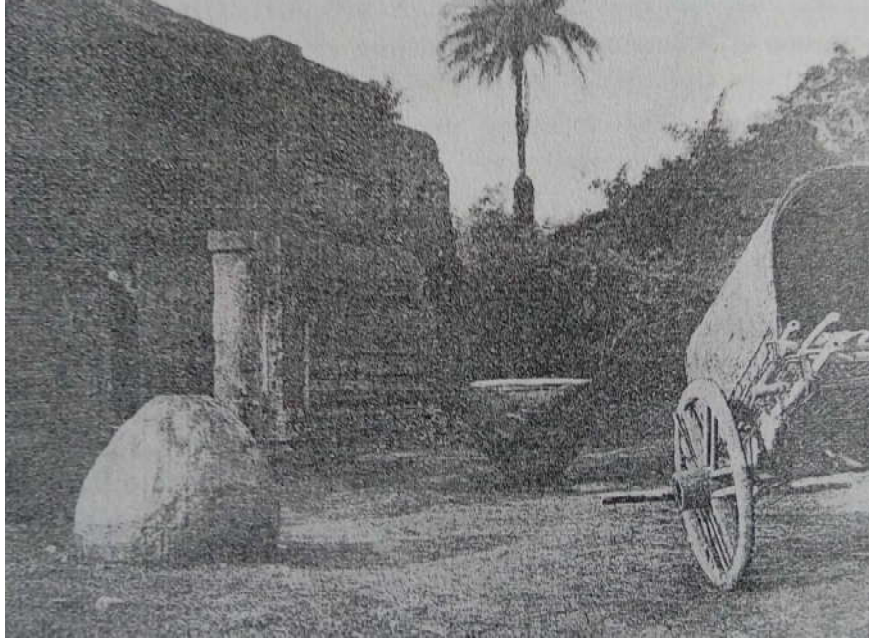
مسافر خانہ کے دروازہ کے سامنے رکھے ہوئے نواب میر قاسم خان کے برنجی نقارے

ن: برنجی نقارے:

پیتل کے دو بڑے نقارے مسافر خانہ کے دروازے کے پاس اب تک موجود ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان نقاروں کو نواب قاسم خان (نواب ناظم، بنگال)[1] نے پیش کیا تھا جس کا نام ایک نقارہ کے حاشیہ پر کندہ کیا ہوا ہے۔ روایت کے مطابق مہمانوں کو کھانے پر بلانے کے لئے ان نقاروں کا استعمال کیا جاتا تھا۔

1۔ وہ میر جعفر کا جانشیں تھا اور ۱۷۶۴ء میں بکسر کی جنگ میں اسے شکست ہوئی تھی۔

﴿یادگار نمبر۳﴾ **مسجد قطب شاہی**

(خانوادۂ قطبیہ کے ایک فرد نے ۹۹۰ھ مطابق ۱۵۸۲ء میں اس مسجد کی تعمیر کرائی)

مسجد قطب شاہی، آستانہ حضرت نور قطب العالم اور مقبرہ اک لاکھی کے درمیان وسط راہ پر واقع ہے۔ یہ اینٹوں اور پتھروں کی تعمیر ہے اور اس کے تین گنبد تھے۔ چھت گر چکی ہے تاہم دیواریں اور منبر سالم ہیں۔ اس کا طول وعرض ۸۲؍فٹ ۶؍انچ برابر ۳۷؍فٹ ۸؍انچ ہے۔ کتبے سے ظاہر ہوتا ہے کہ مخدوم شیخ ولد محمد الخالدی، جو حضرت نور قطب العالم کی اولاد میں تھے، نے ۹۹۰ھ مطابق ۱۵۸۲ء میں اس مسجد کی تعمیر کرائی اور حضرت نور قطب العالم کی علامتِ تعظیم کے طور پر اسے 'مسجد قطب شاہی' کا نام دیا گیا۔ مندرجہ ذیل دو لائن کتبہ تغرا حروف میں دروازے کے اوپر موجود ہے: **قال النبی صلی الله علیه وسلم من بنی مسجدا فی الدنیا بنی الله له سبعین قصرا فی الجنة بنی هذا المسجد الشیخ المعظم والمکرم مخدومنا شیخ بن محمد الخالدی صاحب مقام بمقام قطب الاقطاب راس الاصواب قطب عالم خادم نور مد الله ظله ومتع الله اثاره المسمی هذا المسجد قطب شاهی وتاریخ مخدوم عبید راجی۔**

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس نے دنیا میں ایک مسجد بنائی، اللہ جنت میں اس کے لئے ستر محل تعمیر فرمائے گا۔ قطب الاقطاب، پیشوائے اصواب (حضرت) قطب العالم کی فرودگاہ کے والی، معزز ومکرم شیخ، خادم نور، ہمارے مخدوم شیخ ابن محمد الخالدی، اللہ ان کے سایہ (عاطفت) کو دراز فرمائے اور ان کے گزشتہ اعمال کو نافع بنائے، نے اس مسجد کی تعمیر کرائی جو مسجد قطب شاہی کے نام سے موسوم ہے اور اس کا مادۂ تاریخ ''مخدوم عبید راجی'' [1] ہے۔ آخری جملہ کے عربی حروف کی عددی خصوصیات کا لحاظ کرتے ہوئے ۹۹۰ھ کی تاریخ برآمد ہوتی ہے۔ [2]

1۔ ''وہ ایسے فروتن خدمت گار مخدوم ہیں جو عفوِ مولیٰ کے امیدوار ہیں''۔۔۔ جیسا کہ ماقبل ہی میں یہ بات بتائی جا چکی ہے کہ یہ کتبہ اور اس کے علاوہ اِس مسجد سے متعلق دو اور کتبے مزید چھان بین کا تقاضا کرتے ہیں۔ (مخدوم) علاء الحق کے روضے کی چہار دیواری کے دروازے کے اوپر نصب کئے گئے کتبہ سے لگتا ہے کہ بانی کا اصل نام مخدوم شیخ بابو ولد محمد خالدی تھا۔ (ایچ، ای، اسٹیپلٹن)

2۔ مندرجہ بالا کتبے میں بانیٔ مسجد کا ذکر کرتے ہوئے ''**مخدومنا شیخ بن محمد الخالدی**'' کی عبارت درج کی گئی ہے اور اسی عبارت کی بنا پر خان صاحب مرحوم نے یہ نتیجہ برآمد کیا ہے کہ بانی کا نام مخدوم شیخ تھا۔ راقم سطور

یہاں منبر کے اوپر ایک دوسرا کتبہ بھی ہے جو کچھ اس طور پر واقع ہے:

بیں نیک ایں مرغ دائم بصحرا محتاج ۔۔۔۔۔۔۔۔ مگر ساز د بہ منقار نسیم دین منظوم

رسیدش از کرم چوں مستجابت ایں تاریخ ۔۔۔ بہ آمد مسجد بنیان خرج بر زیب از مخدوم

-: ۹۹۳ھ :-

مرقومہ بالا کتبہ کا معنی و مفہوم کم و بیش نا قابل فہم ہے اور یہ اشعار پتھر پر کندہ کی گئی تاریخ ۹۹۳ہجری سے مطابقت

کے ناقص فہم کے مطابق زیر نظر عبارت کی روشنی میں یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ''مخدومنا''، علی سبیل الاضافت مذکور ہے تو اگر لفظ مخدوم اصل اسم ہی کا ایک حصہ ہے تو اسے ایک ضمیر کی طرف اضافت کے ساتھ بیان کرنا کچھ ہضم نہیں ہوتا، کیونکہ عربی زبان و ادب میں اصل نام سے پہلے یا بعد میں القاب و خطابات کے ساتھ ضمائر کی اضافت کا چلن تو ہے لیکن فی نفسہ اصل نام کے ساتھ اس قسم کے اضافتی نظائر نظر نہیں آتے۔

اس خصوص میں دوسری بات یہ ہے کہ اضافت تخصیص و تعریف کا فائدہ دیتی ہے اور نام تو پہلے ہی سے معرف اور مخصص ہوتے ہیں تو پھر بھلا ناموں کے ساتھ اضافت کیوں لائی جائے؟ یہ تو تحصیل حاصل ہے جو یکسر باطل ہے۔ بنا بریں ہیچمدانؔ کے کوتاہ فہم کے مطابق کتبہ میں موجود لفظ مخدوم بہر صورت اصل نام کا حصہ نہیں ہے۔

ایک اہم نکتہ لفظ ''شیخ''، جو لفظ ''مخدوم'' کے بعد ہے، کے حوالے سے ہے۔ خان صاحب نے لفظ 'شیخ' کو اسم کے آخری جز کے طور پر پیش کیا ہے۔ یہ بات بھی محل نظر ہے۔ ظاہر ہے کہ مخدوم علاء الحق علیہ الرحمہ کے بعد اس خانوادے کے ہر فرد کے ساتھ تعظیماً لفظ شیخ کا الحاق ہوتا ہے، جیسا کہ شجرۂ نسب سے بھی ظاہر ہے تو پھر ایسی صورت میں خانوادہ کے کسی فرد کا نام ہی ''شیخ'' رکھ دیا جائے، وہ بھی جزو آخر کے طور پر، یہ بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔ اس خصوص میں دوسری بات یہ ہے کہ کتبے میں بانی کو جن القاب و خطابات کے ساتھ متعارف کرایا گیا ہے اس سے لگتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کی ایک ممتاز ترین شخصیت کے مالک تھے۔ ایسی صورت میں شجرۂ نسب میں تو ان کا نام ضرور نمایاں طور پر آنا چاہئے تھا لیکن حیرت ہے کہ یہاں ''مخدوم شیخ'' نام کا کوئی بھی شخص ہمیں نظر نہیں آتا۔ ان وجوہات کی بنا پر ہمارا خیال یہ ہے کہ لفظ 'شیخ' بھی اصل نام کا حصہ نہیں ہے بلکہ یہ ویسی ہی ترکیب ہے جیسے ''شیخ ابن العربی اور علامہ ابن الجوزی'' وغیرہ کی تراکیب ہیں۔۔ آخری بات کے طور پر، ہم اسٹیپلٹنؔ کی اس بات سے کلی طور پر اتفاق کرتے ہیں کہ ان کتبات کی مزید بلکہ از سر نو تحقیقات ہونی چاہئے۔ (میزان)

بھی نہیں رکھتے۔شاید آخری مصرع کی صحیح عبارت یوں ہوگی: بامید مسجد بنیان زیب ز مخدوم ‘ ’جو ۹۹۳ھ سے ہم آہنگ ہے۔دریں صورت مرقومہ بالا اشعار کا مطلب بایں طور بیان کیا جاسکتا ہے: اس پرندے کوغور سے دیکھو جوسدا صحرا میں رہنا پسند کرتا ہے (اور) نسیم سحر کی طرح اپنی چونچ سے سچے یقین کا گیت گاتا ہے۔یہ مادۂ تاریخ (اللہ کے) کرم سے منکشف اور مقبول ہوا۔مسجد کی بنیاد ۹۹۳ ہجری میں مخدوم کے ذریعے رکھی گئی۔

﴿تصویر نمبر ۲۱﴾ مسجد قطب شاہی یا سونا مسجد، پنڈوہ

اس مسجد سے متصل آنے جانے کا ایک دروازہ ہے مگر اب ’آمدورفت‘ زمانہ گزشتہ کی بات ہے، دروازے پر ایک کتبہ تو نصب کیا گیا تھا مگر اس کا پتہ نہیں لگایا جاسکا۔کتبے کا متن اور ترجمہ ہلکی سی تصحیح کے ساتھ ’’خورشید جہاں نما‘‘ پر چڑھائے گئے بیورتیج کے نوٹ سے یہاں نقل کیا جارہا ہے:

ھذا باب المسجد الذی بنی الفقیر الحقیر مخدوم شیخ بن محمد الخالدی مرید عالی مقام شمس سماء الشریعۃ قمر کان الحقیقۃ ھادئی راہ ارادت مخدوم المعظم مخدوم قطب عالم تلالی اللہ بمضجعہ . تاریخہ تم باب مسجد . سنۃ ۹۹۳ھ۔

ترجمہ: آسمان شریعت کے آفتاب، سرچشمہ حقیقت کے ماہتاب، ہادئ راہ ارادت، عالی مقام، مخدوم المعظم، مخدوم قطب عالم، اللہ ان کی خواب گاہ کو منور فرمائے، کے مرید فقیر حقیر مخدوم شیخ ولد محمد الخالدی نے اس مسجد کے دروازے کی

تعمیر کرائی۔ مسجد کا یہ دروازہ ۹۹۳ ہجری (مطابق ۱۵۸۵ عیسوی) میں مکمل ہوا۔

﴿تصویر نمبر ۲۲﴾ خطبہ گاہ مسجد قطب شاہی، پنڈوہ
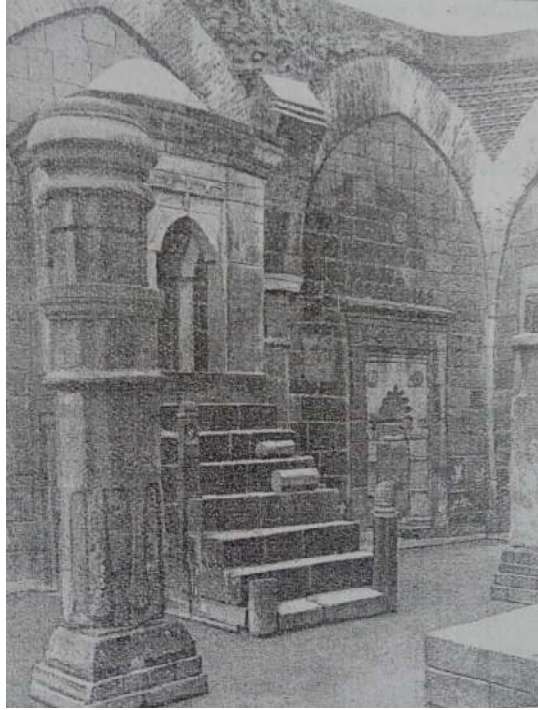
بعض اوقات اس مسجد کو "سونا مسجد" کے نام سے بھی پکارتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دیواروں کے اوپری حصوں اور میناروں کے آرائشی سرپیچوں پر کی گئی ملمع سازی کی وجہ سے یہ نام "سونا" وجود میں آیا۔

عمارت کے تئیں تعمیراتی یادداشتیں:

(۱) دریچوں میں جالی دار کام: مسجد کی مختصر دیواروں میں سے ہر ایک میں دو دو دریچے ہیں جو ہواداری کیلئے سنگین جالی دار ورک پر مشتمل ہے جیسا کہ گور کی متعدد مساجد میں دیکھا جا سکتا ہے۔

(۲) اگر چہ یہ مسجد دوسرے مقامات سے اکٹھے کئے گئے مواد مسالوں کی مدد سے بنائی گئی ہے تاہم اس کی تعمیر بہت عمدہ ہے اور دیواروں کے بالائی حصے پر کسی کوٹھی کے طرز کی نقل کرتے ہوئے نقاشی کی گئی ہے۔

(۳) نیم کروی گنبد ان نوکدار محرابوں پر ٹھہرے ہوئے تھے جو ستونوں پر تعمیر کی گئی تھیں۔ جب چھت کے دباؤ کی وجہ سے ستون نیچے آنے لگے تو محرابوں میں دراڑیں پڑ گئیں اور پھر شکستہ محرابوں کا زوردار جھٹکا گنبدوں کے انہدام کا سبب بن گیا۔

(۴) وسط مسجد میں قائم کئے گئے سارے ستون بے سلیقہ تھے اور جب چھت گر گئی تو یہ تمام ستون بھی زمین بوس ہو گئے۔اب یہ ستون نئی بنیادوں پر قائم کر دیئے گئے ہیں اور فرش بالکل کھلا مسطح بن گیا ہے۔

(۵) منبر کے سامنے موجود چبوترہ اس مسجد کی ایک انوکھی خصوصیت ہے۔ یہ چبوترہ کسی فقیر کی قبر معلوم ہوتا ہے جسے فقدان مرمت کی وجہ سے مسجد کے منہدم ہو جانے کے بعد مسجد کے اندر دفنایا گیا تھا۔

﴿یادگار نمبر۴﴾ اِک لاکھی مقبرہ

(اغلب طور پر تاریخ تعمیر: ۱۴۱۲ء۔۔۔ ۱۴۱۵ء)

ایک نہایت مرتفع اور شاندار واحد گنبد کے ساتھ اینٹوں سے بنی یہ ایک عمارت ہے جو''مسجد قطب شاہی'' کے شمال مشرق میں تھوڑی ہی دوری پر واقع ہے۔ اِس کا طول وعرض ۷۸رفٹ ۶رانچ برابر ۷۴رفٹ ۶رانچ ہے، جبکہ گنبد کا اَندرونی قطر ۴۸رفٹ ۶رانچ ہے۔ دروازے کی درز ۶رفٹ ساڑھے ۷رانچ برابر ۱۳رفٹ ۶رانچ ہے اور دیواریں ۱۳رفٹ موٹی ہیں۔ اِس عمارت کا نام (اِک لاکھی) اِس روایت کی بنا پر وضع ہوا ہے کہ اِس کی تعمیر میں ایک لاکھ روپے کا خرچہ آیا تھا۔ اگر چہ تعمیری مواد بنیادی طور پر اینٹیں ہی ہیں تاہم یہ خطے کی خوبصورت ترین عمارت ہے۔ بیرونی دیواریں منقش ٹائیلوں سے آراستہ کی گئی ہیں۔گنبد کی چھت خوش اسلوبی کے ساتھ پلستر کی گئی ہے اور پھر زیبائشی ورک کی مدد سے ڈھانپ دی گئی ہے۔عمارت کا اندرونی حصہ ہشت پہلو ہے اور ہر ایک سائڈ پر بنے محض چار چھوٹے چھوٹے دروازوں ہی کے ذریعے اندر آتی روشنی سے روشن ہوتا ہے۔ داخلی دروازہ کے اوپر ایک چوکھٹ ہے جس پر ایک ہندو مورتی تراشی گئی ہے اور (اس کے علاوہ) دروازے کے چہار طرف کچھ ایسے پتھر بھی نصب کئے گئے ہیں جن پر انسانی چہرے مہرے کی تصویریں ڈھونڈی جا سکتی ہیں، بنا بریں ایسا لگتا ہے کہ اصلی سنگ تراشی ضرور ہندو بنیاد سے تعلق رکھتی ہے۔ اندر تین قبریں ہیں۔صاحب ریاض السلاطین کے مطابق ان میں سے ایک قبر جلال الدین ولد راجہ کانس کی اور دوسری دو اس کی بیوی اور بیٹے کی ہیں۔خورشید جہاں نما کے مصنف منشی الٰہی بخش کا گمان غالب یہ ہے کہ مغربی قبر جو سب سے زیادہ اونچی ہے وہ سلطان جلال الدین کی ہے، وہ قبر جو جانب مشرق ہے وہ اس کے بیٹے سلطان احمد شاہ کی ہے اور جو قبر وسط میں ہے وہ اس کی بیوی کی ہے۔

جلال الدین اور احمد شاہ کی قبروں کے سرہانے دو سنگین ستون موجود ہیں۔ وہ پتھر جو آخر الذکر کے سرہانے ہے وہ قبر کی سطح سے تھوڑا سا مرتفع ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ قبر ایک شہید سے تعلق رکھتی ہے اور جو سنگین کھمبا جلال الدین کی قبر کے سرہانے ہے وہ قبر ہی کے ساتھ مساوی سطح پر واقع ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے ایک طبعی موت ملی تھی۔

﴿تصویر نمبر۲۳﴾ اِک لاکھی مقبرہ، پنڈوہ
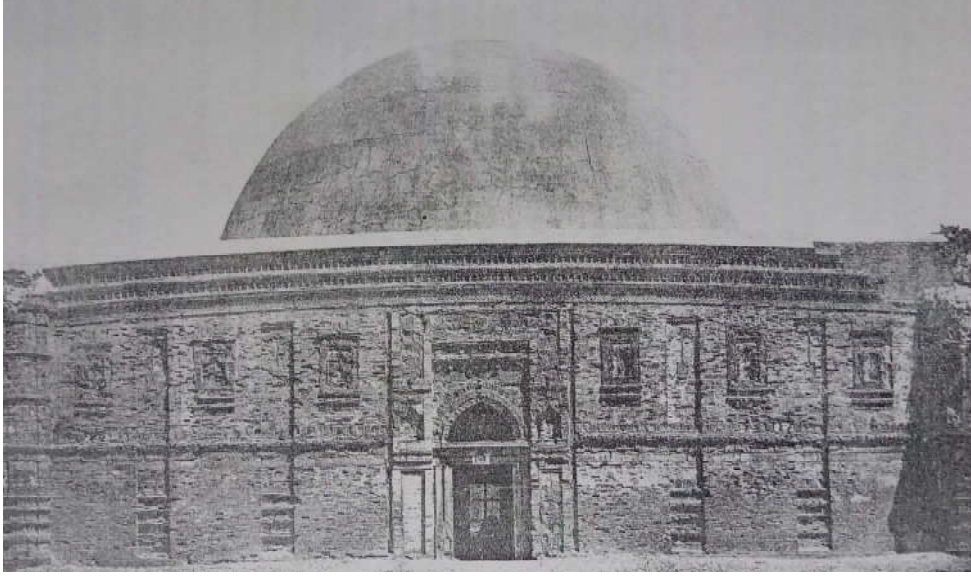
عمارت کی طرزِ تعمیر اسلامی ہند کے مروجہ انداز کی ہے اور زمانہ تقریباً جلال الدین ہی کے حکومت کا معلوم ہوتا ہے، ممکنہ طور پر یہ عمارت اس کے باپ راجہ کانس نے تعمیر کرائی تھی۔ جیسا کہ ماقبل میں بھی بتایا جا چکا ہے کہ یہ عمارت گور میں قدم رسول عمارت کے نزدیک واقع مشہور ''چیکا مسجد'' کے ساتھ بڑی حد تک میل کھاتی ہے۔

عمارت کے تئیں تعمیراتی یادداشتیں:

الف: کوٹھریاں: عمارت کے اندر دیواروں میں چار کوٹھریاں موجود ہیں، یہ کوٹھریاں قرآن کی تلاوت کرنے والوں کے قیام کی نیت سے بنائی گئی تھیں، یہاں علی العموم قرآن مجید کے ہر ایک ختم پر مرحومین کے حق میں رحمت خداوندی کی دعائیں مانگی جاتی تھیں، ایسا مانا جاتا ہے کہ اس قسم کی تلاوت کے لئے حفاظ کو ریاست کی جانب سے معاوضہ دیا جاتا تھا۔

ب: داخلی دروازے کی انوکھی تعمیر: جانبِ مشرق واقع مرکزی یا عوامی دروازے کی چوکھٹ اُس اصلی کمرے کی طرف بتدریج ڈھلان دار بنائی گئی ہے جہاں شاہی قبریں موجود ہیں، یہ کچھ اس طرح کی تعمیر ہے جو کمرے کے اندر داخل ہونے والے کسی بھی شخص کو قدرتی طور پر اس بات پہ مجبور کر دیتی ہے کہ وہ شاہی قبروں کی طرف بطور تعظیم اپنا سر جھکائے۔ ایسا ممکن ہے کہ راجہ کانس نے شیخ بدرالاسلام ولد شیخ معین الدین عباس کو غرق آب کر کے مارنے سے پہلے اسی کمرے کے اندر بلایا تھا، کانس کا مقصد یہ تھا کہ شیخ جب کمرے کے اندر داخل ہوں تو وہ انہیں اپنی طرف سر کو خم

کرنے پر مجبور کر دیں مگر شیخ جب داخل ہوئے تو انہوں نے اولاً اپنے پیر کو جھٹکے کے ساتھ آگے بڑھایا اور اس طرح اُس راجہ کو عزت دینے سے وہ باز رہے جسے وہ کافر خیال کرتے تھے۔[1]

ج: دریچوں کے فریم میں موجود دراڑیں: دیگر دروازوں اور دریچوں کی سنگین چوکھٹوں اور سر دلوں میں دراڑیں موجود ہیں جو غالباً اس ارادے سے بنائے گئے تھے کہ ان دَرزوں کو سنگین سلاخوں کی مدد سے بند کیا جائے۔ اِس وقت ان دریچوں میں تار کی جالیاں مہیا کی گئی ہیں اور مرکزی دروازہ بھی اسی مواد کے ساتھ بند کر دیا گیا ہے، داخلی دروازے کے پاس سنگین پرزوں کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ عمارت کیلئے اولین طور پر ایک چوبی دروازہ مہیا کیا گیا تھا۔

د: مناروں کے آرائشی سر پیچ: عمارت کے چاروں گوشوں میں موجود منارے اپنے آرائشی سر پیچوں کو کھو چکے ہیں، نتیجے کے طور پر اب کسی قدیم ڈرائنگ یا فوٹو گراف کے فقدان کی وجہ سے ان مناروں کو دوبارہ اپنی اصلی شکل وصورت میں بحال نہیں کیا جا سکتا۔

ر: آرائشی لکیر: جیسا کہ تصویر نمبر ۲۳ر میں آپ دیکھ سکتے ہیں کہ اس عمارت کی دیواروں کے بالائی حصے میں ایک آرائشی لکیر گولائی میں موجود ہے تا کہ اس سے کسی کوٹھی کا رسمی نقشہ کھینچا جا سکے۔

س: اینٹوں سے بنی عمارت میں تراشیدہ آرائش وزیبائش: کنگنی کے نیچے نہایت عمدگی کے ساتھ آراستہ خشت کاری کی دو وسیع بینڈ موجود ہیں۔ تزئین کاری کی ڈیزائن متعدد الانواع ہے اور کوئی بھی نوع بار بار دہرائی نہیں گئی ہے۔

﴿یادگار نمبر ۵﴾ ادینہ مسجد

یہ مشہور مسجد ۷۶۶ھ اور ۷۷۶ھ ہجری (۱۳۶۴ء۔۱۳۷۴ء) کے درمیان سکندر شاہ کے ذریعے تعمیر کی گئی تھی۔ اگر چہ اس کے بعض حصے اس وقت تباہ ہو چکے ہیں باوجود اِس کے، یہ اُس زمانے کی مسلم طرزِ تعمیر کا ایک شاندار نمونہ ہے۔ یہ چہار پہلو عمارت محراب دار ڈیوڑھیوں پر مشتمل ہے جو اِسی وضع کے ایک مرکزی صحن کو محیط ہے۔ عمارت شمال سے جنوب تک ۵۰۰ر ساڑھے ۷ر فٹ اور مشرق سے مغرب تک ۲۰۰ر ساڑھے ۸۵ر فٹ وسیع ہے۔ جانبِ مشرق،

1۔ یہاں پر اِک لاکھی عمارت کے ساتھ راجہ کانس کے مجوزہ تعلق کو بیان کرتے ہوئے حوالے کے طور پر یہ بات بھی شامل کی جا سکتی ہے کہ جب راجہ نے غیاث الدین کے آخری قلیل الحیات جانشیں کی وفات کے بعد بنگال کے تخت پر قبضہ حاصل کر لیا تو اُس نے توہین اسلام کے ارادے سے ملحقہ ادینہ مسجد کو اپنی کچہری کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ (ایچ ،ای ،اسٹیپلٹن)

جہاں سے ایک چھوٹے دروازے کے ذریعے اندر داخل ہو سکتے ہیں، محراب دار ڈیوڑھیاں ۳۸ رفٹ چوڑی ہیں اور

ادینہ جامع مسجد، حضرت پنڈوہ
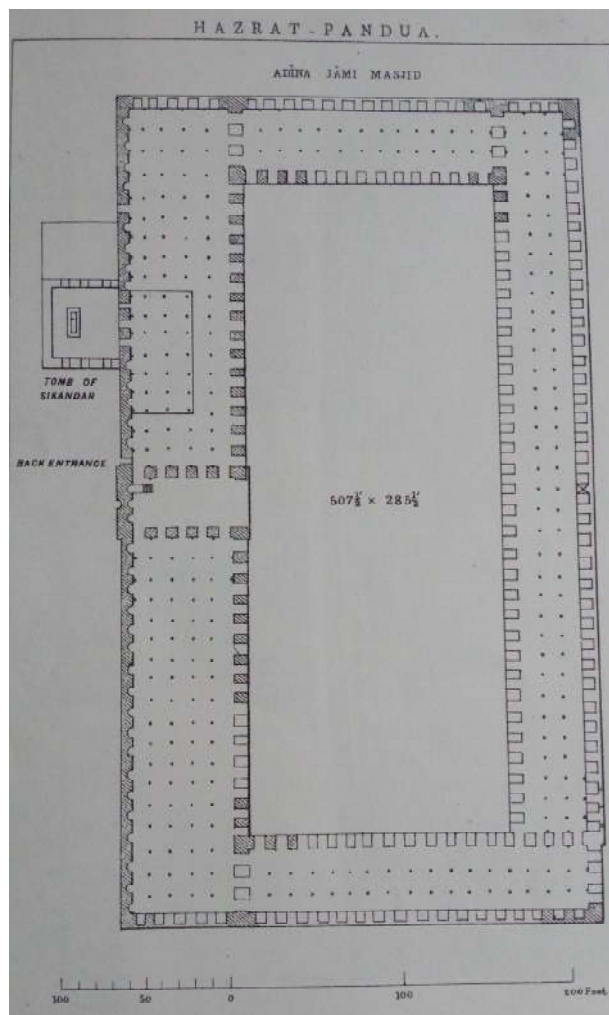
پلیٹ نمبر ۷

ساتھ ہی تین بغلی راستے ہیں۔کل وسعت کو آڑی ترچھی خشتی دیواروں اور سنگین ستونوں کی مدد سے ۱۰۸ رذیلی چو گوشوں میں تقسیم کیا گیا ہے جن میں ہر ایک کبھی ایک چھوٹے گنبد کے ذریعے ڈھکا ہوا تھا۔شمالی اور جنوبی اطراف بھی اسی طریقے پر تعمیر کئے گئے ہیں تاہم، اختصار کی وجہ سے، ان میں سے ہر ایک سائڈ میں علی الترتیب ۳۹ راور ۵۱ رگنبد تھے البتہ محراب دار ڈیوڑھیوں کا مغربی سلسلہ ۶۴ رفٹ چوڑا ہونے کی وجہ سے اس سمت میں تین کی بجائے پانچ بغلی راہیں تھیں مگر چونکہ اِس سمت کا مرکزی حصہ نافِ مسجد (Nave) کے تصرف میں ہے اس لئے اِس سمت میں بھی گنبدوں کی تعداد اتنی ہی تھی جتنی کہ محرابی راہداری کے مشرقی سلسلے میں تھی، یعنی کہ ۱۰۸۔۔۔۔تو گویا اس طرح پوری

راہداریوں اور ڈیوڑھیوں کو ڈھانپے رکھنے والے گنبدوں کی کل تعداد ۳۰۶ رتھی ۔۔۔ان تمام راہداریوں کی اونچائی کشادہ زیبائشی کارنس سمیت تقریباً ۲۰ رفٹ تھی اور یہ راہ داریاں اندر مستطیل اور مربع چہار دیواری کے ساتھ پھیلی ہوئی تھیں۔[1]

شمالی، مشرقی اور جنوبی سمتوں میں باہر کی طرف بہت سارے چھوٹے چھوٹے دریچے ہیں جو دیواروں میں آراستہ منقش تارسوں کی مدد سے انتہائی عمدہ طریقے پر مزین کئے گئے ہیں۔مغربی دیوار میں چار چھوٹے دروازوں اور وسطی ہال میں بہت اونچائی پر واقع ایک دریچہ کے علاوہ اور کوئی درز یا راستہ نہیں ہے تاہم اندر قبلہ کی طرف مروجہ طاقیں موجود ہیں۔ان طاقوں میں سے بہت سی طاقیں صیقل اور انتہائی عمدہ طریقے پر منقش کی گئی ہیں۔مغربی راہداری کے جنوبی بازو میں جہاں عام لوگ نماز ادا کرتے تھے، یہ طاقیں محرابدار راہداری کو تشکیل دینے والے گنبدوں کی ۱۸ر قطاروں کے ساتھ پے در پے مربوط ہیں۔اسی راہداری کا شمالی بازو صرف اس وجہ سے کچھ مختلف ہے کہ یہ وسطی ہال سے متصل ایک ایسی شہ نشیں پر مشتمل ہے جسے ''بادشاہ کا تخت'' کہتے ہیں، اور جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔یہ بادشاہ کا تخت لگ بھگ ۸رفٹ بلند موٹے ستونوں پر قائم ہے، ملحقہ دیوار میں ۳رمحرابیں اور ۲ر دروازے موجود ہیں جنہیں دقت نظر کے ساتھ قرآنی آیتوں سے آراستہ کیا گیا ہے۔یہ دروازے اسی سطح پر موجود ایک ایسے کمرے تک رہنمائی کرتے ہیں جسے ''بالا خانہ سکندر شاہ'' کے نام سے پکارتے ہیں۔یہ بالا خانہ یا چوبارہ ۴۲رفٹ وسیع ہے اور عہد ماضی میں یہ بالا خانہ نو گنبدوں کے ذریعے ڈھکا ہوا تھا۔جانبِ مغرب کا بیرونی حصہ اگرچہ بالا خانہ سکندر شاہ کی پروجیکشن کے ذریعے بے قاعدہ طور پر پیش کیا گیا ہے تاہم یہی اگلا رخ عمارت کا محفوظ ترین حصہ اور اعلی طریقے پر مزین ہے۔ مغربی دیوار ۱۱رفٹ کی اونچائی تک پتھروں سے بنائی گئی ہے تاہم اس کے اوپر اینٹوں کی تعمیر ہے جسے چھوٹے چھوٹے سیکشن میں تقسیم کیا گیا ہے اور انتہائی جانفشانی کے ساتھ کاٹ کاٹ کر نقش ونگار بنائے گئے ہیں۔پتھروں سے تعمیر شدہ اس سائڈ کے دروازے عمارت کے ایسے حصے ہیں جنہیں سب سے زیادہ نفیس ذوق کے ساتھ مکمل کیا گیا ہے۔

تعمیر مسجد کے تئیں تشریحات:

(ا) سکندر شاہ چونکہ اپنی حکومت کے ابتدائی ایام میں سلہٹ کے ہندوؤں کے خلاف برسرپیکار تھا اور چونکہ ادینہ مسجد

1۔یہ محراب دار راہدایاں تقریباً ساری کی ساری ہی گر چکی ہیں اور اور آج کی تاریخ میں محض دوہری قطار کی بنیادیں اور اندرونی دیواروں کے حصے باقی رہ گئے ہیں۔

کے اندر بہت سارے ایسے پتھر پائے گئے ہیں جولازمی طور پر ہندومندروں کے تھے،اس لئے یہ بات بہت ممکن ہے

﴿تصویر نمبر ۲۴﴾ ادینہ مسجد، پنڈوہ کے وسطی حصے کا ایک عام منظر

کہ سکندر شاہ ایک متصلب مسلمان تھا اور یہ کہ وہ اپنی رعایا کو قبول اسلام کی ترغیب دیا کرتا تھا۔ اگر ایسا ہے تو یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ اس نے اتنی بڑی اور عظیم الشان مسجد کیوں بنوائی ؟ ظاہر ہے کہ وہ اس لئے، تاکہ تمام ساکنان پنڈوہ نماز جمعہ کیلئے ایک جگہ جمع ہو سکیں تاہم بطور خاص عمارت کی ڈیزائن کچھ زیادہ اچھی نہیں ہے۔ مثال کے طور پر اس بات کو یقینی بنانے کے لئے بہت کم توجہ دی گئی ہے کہ اندر بقدر احتیاج باہر سے روشنی آسکے، چنانچہ ''بادشاہ کا تخت''، روز روشن میں بھی تاریک نظر آتا ہے۔

(۲) جانبِ مغرب بالا خانہ سکندر شاہ والی عمارت کا باہر کی طرف نکلا ہوا حصہ ایک بعد میں آنے والا خیال تھا جسے اغلب طور پر سکندر شاہ نے شاہی خاندان کے افراد کے لئے بعد میں بنوایا تھا تاکہ وہ وہاں اوقات نماز سے پہلے بیٹھ کر آرام کر سکیں، اس بالا خانے کی جنوبی اور غربی دیواروں میں دریچے ہوا کرتے تھے جو سنگین جالی دار کاموں سے بھرے ہوئے تھے۔

(۳) بظاہر تو یہی نظر آرہا ہے کہ تخت پر چڑھنے کا اندر سے کوئی راستہ نہیں تھا بلکہ بالا خانہ سکندر شاہ سے گزر کر تخت کی مغربی دیوار میں بنے دو چھوٹے دروازوں ہی کے ذریعے تخت پر چڑھا جا سکتا تھا۔

(۴) اولین طور پر سیاہ سنگ مرمر کے خوبصورت تختوں کے ذریعے 'بادشاہ کا تخت' کی فرش بندی کی گئی تھی مگر اب

تقریباً وہ سارے اسباب ہی غائب ہیں اوران کی جگہ ایک چوبی پلیٹ فارم نے لے لی ہے۔ پنڈوہ میں حضرت شاہ جلال کے آستانہ کے اندر چلہ خانہ کے کارنس اور داخلی دروازے میں کئی ساری سنگین سلیں دیکھی جاسکتی ہیں، گمان غالب یہ ہے کہ یہ تمام سلیں ''بادشاہ کا تخت'' ہی سے لائی گئی تھیں۔ تخت کے تین اطراف جنگلے بنائے گئے تھے مگر اب ان کا کوئی نام ونشان ہی موجودنہیں ہے۔ کہتے ہیں کہ وہ جنگلے حقیقت میں ایک بدھسٹ دیر سے تعلق رکھتے تھے۔

(۵) مسجد کی مغربی دیوار پر ریت اور مٹی کے گارے کی مدد سے کیا گیا زیبائشی خشتی کام موجود ہے جسے بھرپور انداز میں ہندسی نقاشی کے ذریعے آراستہ کیا گیا ہے اور جس سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ چودہویں صدی عیسوی میں بھی بنگال میں کس قدر ترقی یافتہ آرٹ موجود تھا۔ وہ نظائر جو تخت کے مغرب میں موجود ہیں وہ تو بالکل لاجواب ہیں ،تاہم نا تمام کام کی علامتیں یہاں وہاں دیکھی جاسکتی ہیں، اِس کی وجہ یہ ہے کہ یہ عمارت کبھی بھی جملہ طریقے سے مکمل ہی نہیں کی جاسکی۔

(۶) تین اطراف میں واقع مسجد کے دریچے اب گور کی مسطح اینٹوں سے بند کردیئے گئے ہیں، ویسے بہتر تو یہ ہوتا کہ محل وقوع ہی پر پڑے ہوئے مواد مسالوں کے ذریعے سنگین جالی دار کاموں کی مدد سے انہیں از سرِنو تعمیر کردیا جاتا۔

(۷) راہداری وغیرہ کی کھلی ہوئی دیواروں کو بارش سے محفوظ رکھنے کیلئے ان کی چوٹیوں پر سیمنٹ کی جو تہ چڑھائی گئی ہے وہ کچھ زیادہ خوشگوارنہیں ہے، اگر مزید زرنقد دستیاب ہوتا تو ایک قدم آگے بڑھکر خشت کاری اور گچ کے ذریعے خمیدہ جوڑوں کے ساتھ ان دیواروں کی چوٹیوں کو دوبارہ تعمیر کردیا جاتا۔ دیواریں جواب گر چکی ہیں وہ بھی قدیم اینٹوں کو سیمنٹ کے ساتھ جوڑ کر از سرِنو تعمیر کی جاسکتی تھی۔

(۸) مسجد کے چاروں گوشوں میں کہارے والے ستون (fluted pillar) عمودی دائرہ نما لکیریں جو کسی ستون پر بنائی جاتی ہیں) ہوا کرتے تھے۔ غربی رخ پر موجود دوستونوں کے باقی ماندہ آثار سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ عمارت کی تعمیر کے وقت کس قدر عمدہ کاریگری اور صناعی موجود تھی۔

(۹) محرابوں اور گنبدوں کو سہارا دینے کیلئے قائم کئے گئے سنگین ستونوں کی تعمیر نہایت درجہ خوبصورت ہے۔ یہ ستون اپنی اساس میں مربع، وسطی حصے میں ہلکے نوکیلے پن کے ساتھ کروی اور چوٹی میں ترچھی شکل کے بنائے گئے ہیں۔

(۱۰) موجودہ چھت کے اوپر شکستہ دیوار کا ایک حصہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ چھت کے گنبدوں کو ایک منڈیر سے چھپادیا گیا تھا۔

(۱۱) **مسجد کے اندر موجود ایک قبر:** اگرچہ مسجد کے اندر کسی کو دفنانا بہت ہی قابل اعتراض بات ہے تاہم مقامی لوگ

بتاتے ہیں کہ جب مسجد جنگل سے بھری ہوئی تھی اُن دنوں یہاں ایک فقیر رہا کرتے تھے۔ جب ان کی وفات ہوئی تو ان کے ارادت مندوں نے وسطی ہال کے نزدیک مغربی راہداری میں انہیں دفنا دیا۔۔۔آب نکاسی کا ایک سوراخ مشرقی دیوار میں ایک بڑے سردھڑ والے مگر مچھ کے ذریعے بنایا گیا ہے جس کا منہ بارش کے پانی کو کمپاؤنڈ سے باہر پھینکنے کا کام کرتا ہے۔

(۱۲) وسطی ہال کی مغربی دیوار میں دو بہت بڑے کنول کے پھول نقش کئے گئے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ یہاں خوبصورتی کے لئے جمائے گئے ہیں۔ تخت کے نیچے اور بالا خانہ سکندر شاہ کی مغربی دیوار میں اور بھی بہت سارے تراشیدہ کنول کے پھول موجود ہیں۔ یہ تمام سامان اوران کے علاوہ مرکزی ہال کی مغربی دیوار کے بہت اوپر موجود ''لنگم'' ممکنہ طور پر کسی ہندومندر (کے تعمیراتی اسباب) سے لائے گئے ہیں۔

ادینہ مسجد میں کسی داخلی دروازے کی عدم موجودگی پر جنرل کیوننگھم کی تبصرہ نگاری:

''اس عظیم مسجد کی سب سے بڑی قابل ذکر خصوصیت یہ ہے کہ اس میں داخل ہونے کیلئے کوئی صدر دروازہ نہیں ہے۔ عقبی دیوار میں دو چھوٹے چھوٹے دروازے تو ہیں مگر یہ دونوں صرف بادشاہ اور علماء کی سہولت کیلئے بغلی یا شخصی قسم کے دروازے ہیں۔ جانب مشرق کے وسط میں ایک چھوٹا سا دروازہ ہے جو بلا شبہ عوامی استعمال ہی کے لئے ہے مگر یہ دیواروں کے اندر سے ایک ایسا سادہ دروازہ یا گزرگاہ ہے جس کی کسی منصوبہ بند خاکہ یا نمایاں حصار کے ذریعے نشاندہی بھی نہیں کی گئی ہے۔ میرا ایسا ماننا ہے کہ حقیقی عوامی دروازہ محراب دار راہداری کے جنوب مشرقی گوشے میں رہا ہوگا جہاں جنوبی راہداری کے مشرقی سرے پر تین محرابی راہیں کھلی چھوڑ دی گئی ہیں تاکہ لوگ بیک وقت جنوبی اور مشرقی راہداریوں میں باہر سے داخل ہوسکیں۔ چونکہ یہ انتظام عمارت کی خوش اندامی کو قطعی طور پر متأثر کررہا ہے اس لئے گمانِ غالب یہ ہے کہ جب جانب مشرق کے وسط میں بنا چھوٹا سا دروازہ بالکل ناکافی معلوم ہوا تب ہی اس طرح کا کوئی بندوبست کیا گیا''۔ (رپورٹ، ص:۹۱)

عظیم الشان وسطی ہال:

وسیع وعریض وسطی کمرہ جو نافِ مسجد کو تشکیل دیتا ہے، ۶۴ رفٹ لمبا اور ۳۳ رفٹ چوڑا ہے۔ اس کے ہر ایک جانب ۵ رمحرابی دروازے ہیں۔ چھت ایک لمبی محراب یعنی کمرے کی پوری چوڑائی پر پھیلے ہوئے اہم ترین محاذی محراب کا ایک سادہ تسلسل تھی۔ محرابی چھت کی دونوں لائنیں عقبی دیوار کے بالائی حصے کے مقابل میں مبہم طور پر نشان زد کی گئی

تھیں ۔ یہ پتہ نہیں چلتا کہ آیا ٹاپ میں اس عالیشان محراب کے محاذی دروازے کی تختہ بندی کی گئی تھی یا پھر پوری (چھت) ہی محرابی دَرز کے اوپر ایک دیوار کے ذریعے محفوظ کردی گئی تھی، تاہم اتنی بات تو تقریباً طے ہے کہ مشرق کی طرف واقع دروازہ کو کنگرہ دار منڈیر کی ایک اونچی ٹوپی پہنائی گئی تھی ۔ چھت کی اونچائی تقریباً ۶۰ رفٹ تھی ۔

مغربی دیوار پر موجود قبلہ:

مرکزی ہال کی عقبی دیوار کے وسط میں رسمی قبلہ یا محراب اوراس کے شمالی پہلو پر ایک منبر موجود ہے ۔ پوری عقبی دیوار بہت ہی اعلی طرز پر مزین کی گئی ہے تاہم یہ تزئین کاری اور نقش ونگار ہلکے وکم گہرے ہیں اور ہندوانہ عمودی کواڑوں کی گہری تراش کے برخلاف ایک انوکھا اور نرالا انداز پیش کرتے ہیں؛ مذکورہ ہندوانہ عمودی کواڑیں، خوشنما خط

﴿تصویر نمبر ۲۵﴾ ادینہ مسجد کا قبلہ
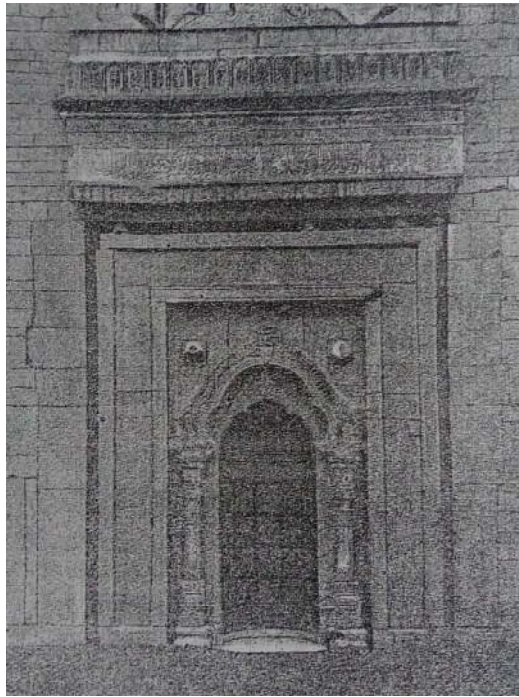
پیچیدہ اور کوفِک میں لکھی گئی قرآنی آیتوں کے محض دو ہی لائن نیچے ایک علیحدہ لائن میں افقی طور پر جمائی گئی ہیں ۔

اس دیوار پر موجود کتبوں کی عبارتیں اوران کے ترجمے نیچے پیش کئے جارہے ہیں: دیوار کی کافی اونچائی پر (کوفک کیر کٹر میں) یہ کتبہ موجود ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم ۔لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ ۔ قال اللہ تعالیٰ یاٰیھا الذین اٰمنوا ارکعوا واسجدوا واعبدوا ۔ ۔ ۔ ۔ قال اللہ تعالیٰ انما یعمر مسٰجد اللہ من اٰمن با للہ والیوم الاٰخر واقام الصلوٰۃ و اٰتی الزکوٰۃ ولم یخش الا اللہ فعسٰی اولٰئک ان یکونوا من المھتدین ☆ اجعلتم سقایۃ الحآج وعمارۃ المسجد الحرام کمن اٰمن با للہ و الیوم الاٰخر وجٰھد فی سبیل اللہ لایستؤن عند اللہ واللہ لایھدی القوم الظّٰلمین۔

ترجمہ: اللہ کے نام سے شروع جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ۔اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، محمد اللہ کے رسول ہیں (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)۔اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اے ایمان والو! رکوع اور سجدہ کرواوراپنے رب کی عبادت کرو۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وہی لوگ اللہ کی مسجدیں آباد کرتے ہیں جو اللہ اور روز جزاء پر ایمان لاتے اور نماز قائم کرتے ہیں، اور زکوۃ دیتے ہیں، اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے ،تو عن قریب یہ لوگ ہدایت والوں میں سے ہوں گے☆ تو کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانا اور مسجد حرام کو آباد کرنا اس کے برابر ٹھہرالیا جو اللہ اور قیامت پر ایمان لایا اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا، اور اللہ ظالموں کو راستہ نہیں دکھاتا۔

منبر:

قبلہ کے دائیں بازو پر منبر موجود ہے جہاں سے امام لوگوں کے سامنے خطبہ دیا کرتے تھے۔ یہ منبر سنگ موسی کی تعمیر ہے جسے بڑی محنت اور نزاکت کے ساتھ تراشیدہ نقش ونگار کے ذریعے سجایا گیا ہے اور منبر پر چڑھنے کا راستہ سنگ موسی ہی کی مدد سے تیار کی گئی سیڑھیاں ہیں۔ سیڑھیوں کے نیچے ایک چھوٹا سا چوگوشہ حجرہ ہے جسے انتہائی نفاست کے ساتھ تراشیدہ نقش ونگار کے ذریعے آراستہ کیا گیا ہے۔ دیگر آرائش وزیبائش کے درمیان منبر میں ایک دائرہ نما معلق فانوس یا بخوردان بھی ہے۔منبر کی دوسیڑھیاں اور جنگلے ندارد ہیں اور بالائی حجرے کی چھت کا ایک بڑا حصہ ضائع ہو چکا ہے۔ اگر ناموجود سیڑھیوں اور جنگلے کو کسی طرح بحال کیا جاسکتا تو یہ ایک بہتر اقدام ہوتا۔ جہاں تک چھت کا سوال ہے تو امکانی طور پر مسجد قطب شاہی کے منبر کی طرح یہاں کی چھت بھی ایک چھوٹے سے گنبد کے ساتھ مزین کی گئی تھی۔ مصر کی متعدد مساجد کے منبر بھی اسی طرح کے چھوٹے گنبدوں کی مدد سے سجائے گئے ہیں۔

سیڑھیوں کے شکستہ حصے میں ایک شیر کا سر دیکھا جاسکتا ہے جس کے بارے میں قیاس یہ ہے کہ وہ کسی ہندو راجہ کے سنگھاسن کا ایک حصہ تھا۔ علاوہ ازیں، دروازوں کی چوکھٹوں اور پوری مسجد کی محرابوں میں اور بھی دیگر ہندوانہ صورتیں

شکستہ حالت میں موجود ہیں۔

﴿تصویر نمبر۲۶﴾ منبر ادینہ مسجد
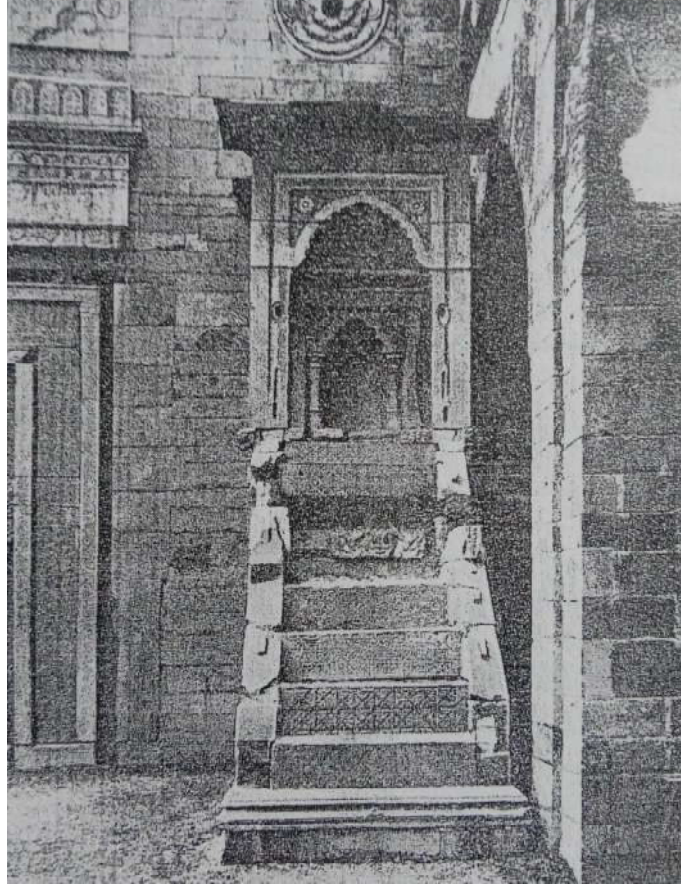
بادشاہ کا تخت:

یہ بالائی روم جو مرکزی ہال کے جانب شمال سیدھے خط میں واقع ہے، عبادت کے وقت بادشاہ اور اس کے خاندان کو علیحدہ سکونت مہیا کرنے کی غرض سے بنایا گیا تھا۔ یہ بادشاہ کا تخت تین بغلی راہوں کے مابین جتنی جگہ میں پانچ حصوں (bay) پر مشتمل ہے اور ۱۵ ر گنبدوں سے ڈھکا ہوا ہے۔ تخت کے سنگین فلور کے گراں بار وزن کو اٹھائے رکھنے کیلئے مروجہ عمودی دائرہ نما لکیروں والے (fluted) سنگین ستونوں کی جگہ بھاری بھرکم ہشت پہلو سنگین کھمبوں کا استعمال کیا گیا تھا، اور پھر ان گراں بار کھمبوں کے اوپر وہ فلوٹڈ ستون نصب کئے گئے تھے جو گنبدوں کو اٹھائے رکھنے والی محرابوں کو تھامے رکھتے ہیں۔

اس وقت محض شمال اور جنوب ہی میں عمارت کے چند ایسے حصے رہ گئے ہیں جہاں کی چھت تاہنوز قائم ہے۔ گنبدیں اپنے تحفظ و بقا کے لئے اغلب طور پر زیریں منزل کے ان گراں بار ستونوں کے رہین منت ہیں جو اپنے اوپر قائم شدہ محرابوں کو غیر معمولی استواری و پائیداری فراہم کرتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ لٹیروں اور غارتگروں کو اس ارادے سے بھی باز رکھتے ہیں کہ وہ ان اشیاء کو یہاں سے اٹھا لے جائیں۔ دس فٹ طویل سنگین ستونوں کو محرابی راہداریوں کے بیچ سے اٹھا لے جانا کوئی مشکل کام نہ تھا اور اسی بات کا نتیجہ ہے کہ آج ان میں سے اکثر کے نشانات بھی مٹ چکے ہیں۔ تخت کی مغربی دیوار میں تین محرابیں ہیں جو دلکش زیبائشی تغرا کتبات اور پوری سطح پر نادر نقش و نگار سے محصور ہیں۔ بالا خانہ سکندر شاہ کے دروازہ کے اوپر خط پیچیدہ میں ایک کتبہ ہے جو کلمہ شہادت پر مشتمل ہے۔

''بادشاہ کا تخت'' کی مغربی دیوار کے کتبے کی عبارت اور ترجمہ مندرجہ ذیل ہیں۔ اس کتبے کا ابتدائی حصہ آیۃ الکرسی سے انتخاب کیا گیا ہے اور چونکہ روضہ مخدوم علاء الحق کی چہار دیواری کے دروازے کے اوپر اس کتبے کی یہ چند ابتدائی سطریں آ چکی ہیں اس لئے انہیں دوبارہ یہاں پر نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بقیہ حصہ بھی قرآن ہی سے منتخب ہے اور وہ اس طرح ہے:

ان اللہ و ملٰئکته یصلون علی النبی یآیھاالذین اٰمنوا صلوا علیه وسلموا تسلیما۔

ترجمہ: بیشک اللہ اور اس کے فرشتے درود بھیجتے ہیں اس غیب بتانے والے (نبی) پر، اے ایمان والو! تم ان پر خوب درود وسلام بھیجو۔

لقد صدق اللہ رسوله الرء یا بالحق لتدخلن المسجد الحرام ان شآء اللہ اٰمنین محلقین رء وسکم ومقصرین لاتخافون فعلم ما لم تعلموا فجعل من دون ذٰلک فتحا قریبا ☆ ھو الذی ارسل رسوله بالھدٰی ودین الحق لیظھره علی الدین کله وکفی باللہ شھیدا ☆ محمد رسول اللہ والذین معه اشدآء علی الکفار رحمآء بینھم ترٰھم رکعا سجدا یبتغون فضلا من اللہ ورضوانا۔

ترجمہ: بیشک اللہ نے اپنے رسول کا خواب سچ کر دکھایا، کہ اگر اللہ چاہے تو تم ضرور مسجد حرام میں امن وامان کے ساتھ داخل ہوگے، اپنے سروں کے بال منڈاتے یا ترشواتے بے خوف وخطر، تو جو تمہیں نہیں معلوم تھا وہ اس نے جانا، پھر اس سے پہلے ایک نزدیک آنے والی فتح رکھی ☆ وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا کہ اسے سب دینوں پر غالب کرے اور بطور گواہ اللہ ہی کافی ہے ☆ محمد اللہ کے رسول ہیں، اور ان کے ساتھ والے

کافروں پر سخت ہیں اور آپس میں نرم دل، تو تم انہیں رکوع کرتے، سجدے میں گرتے (اور) اللہ کا فضل و رضا چاہتے ہوئے دیکھو گے۔

﴿تصویر نمبر ۲۷﴾ ''بادشاہ کا تخت''، ادینہ مسجد کا ایک عام منظر
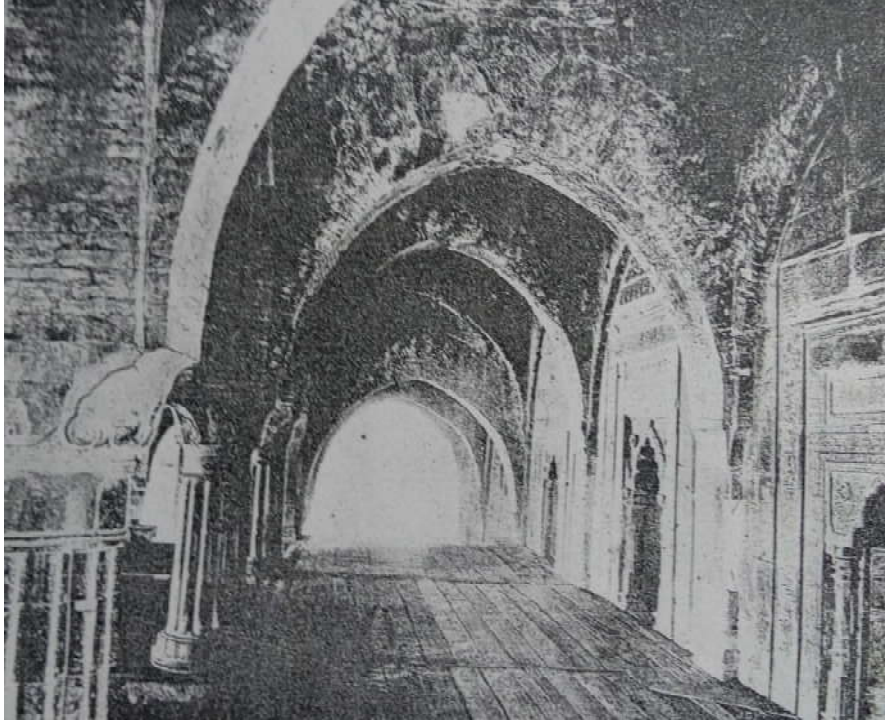
قال اللہ تعالٰی عز من قائل و جل من متکلم : اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم . ان اللہ ھو السمیع العلیم . بسم اللہ الرحمن الرحیم : الذین اٰمنوا و ھاجروا و جٰھدوا فی سبیل اللہ باموالھم و انفسھم اعظم درجۃ عند اللہ و اولٰئک ھم الفآئزون☆ یبشرھم ربھم برحمۃ منہ ورضوان و جنٰت لھم فیھا نعیم مقیم☆ خٰلدین فیھآ ابدا ان اللہ عندہ اجر عظیم۔

ترجمہ: اللہ تعالیٰ جو کسی بھی قائل سے اعلیٰ اور کسی بھی متکلم سے افضل ہے، نے ارشاد فرمایا۔۔اللہ کی پناہ مانگتا ہوں شیطان رجیم سے۔ بے شک اللہ، وہ سننے والا جاننے والا ہے۔ اللہ کے نام سے شروع جو بڑا مہربان نہایت رحم والا: وہ جو ایمان لائے اور ہجرت کی اور اپنے مال و جان سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا، اللہ کے یہاں ان کے لئے بڑا درجہ ہے اور وہی لوگ ہیں جو کامیاب ہیں☆ ان کا رب انہیں اپنی رحمت اور اپنی رضا کی خوشی سناتا ہے اور ان باغات کی جن میں انہیں دائمی نعمت ہے☆ وہ ہمیشہ ہمیشہ ان میں رہیں گے، بیشک اللہ کے پاس بڑا اجر ہے۔

''بادشاہ کاتخت'' کے وجود پر اعتراض:

یہ بات ناقابل انکار ہے کہ ''بادشاہ کا تخت'' صرف بادشاہ اوراس کے مصاحبین ہی کے استعمال کیلئے مہیا کیا گیا تھا۔اس سلسلے میں تخت کا عینِ نام ہی معاملے کی حقیقت کوواضح کر دیتا ہے تاہم کسی مسجد میں نمازوں کی ادائیگی کیلئے اس

﴿تصویرنمبر۲۸﴾ بادشاہ کاتخت،ادینہ مسجد کے محراب کی تفصیلات
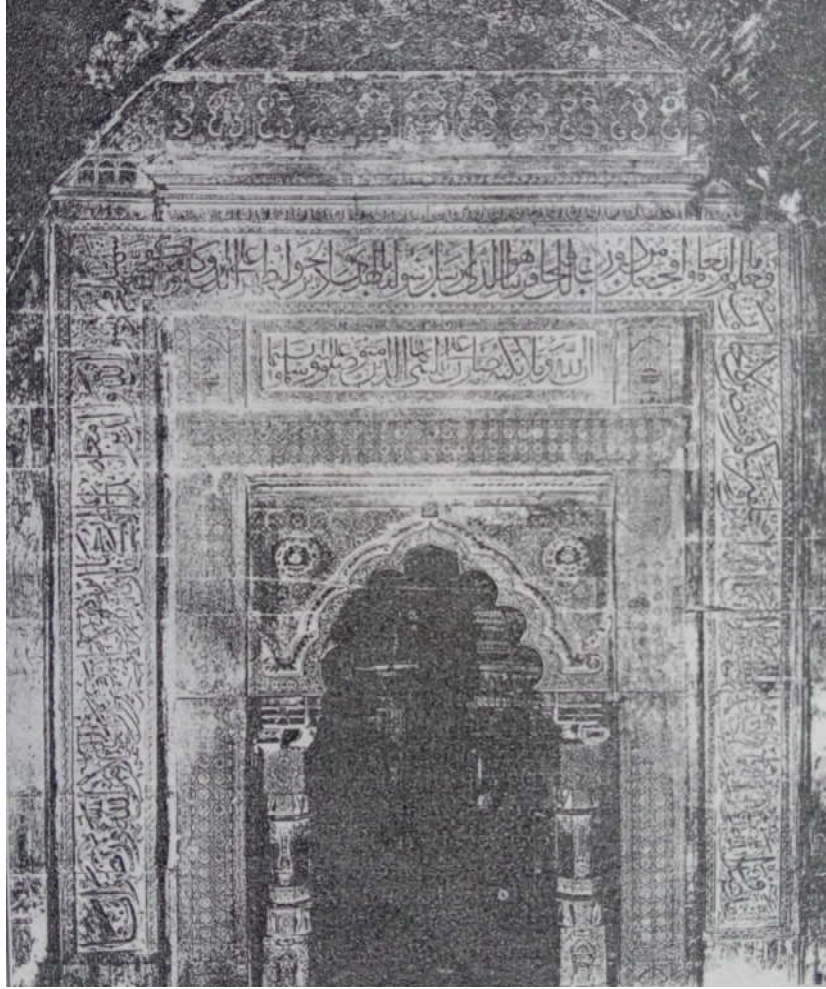
طرح کے کسی اسٹرکچر کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔ چونکہ اسلام مذاہب عالم کے درمیان ایک نہایت درجہ جمہوریت پسند (مبنی برمساوات) مذہب ہے اس لئے عبادت کے کسی مقام پراس طرح کا کوئی غیر منصفانہ اورتکلیف دہ امتیاز ناقابل فہم ہے۔ یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ بیرون بنگال ہندوستان کی کسی بھی مسجد میں بادشاہ کاتخت جیسی کوئی چیز دیکھنے کونہیں ملتی۔اس طرح کے ایک غیر طبعی اورناروا اقدام کی توضیح کچھ اس طریقے پر کی جاسکتی ہے کہ ازحد عیش وآرام

اور خوش حالی و بہرہ مندی میں زندگی گزارنے کی وجہ سے بنگال کے مسلم سلاطین نے اپنے آباء واجداد کی سادہ روش کو فراموش کر دیا تھا اور وہ انتہاء درجے کے مغرور و متکبر بن بیٹھے تھے۔ وہ اپنی رعایا کو حقارت کی نظر سے دیکھتے۔ خدائے بزرگ و برتر کی نظر میں تو سب برابر تھے مگر ان حکمراں بندوں کی نظروں میں (ان کی رعایا) ادنی واحقر تھی۔ سو یہ وہی سلاطین ہیں جنہوں نے مجلسی رسومات اور شاہی تقریبات میں اپنی بالانشینی کے عمل کے ساتھ کسی قدر مطابقت پیدا کرتے ہوئے مساجد کے اندر بھی اس ناروا اور مکروہ امتیاز کو متعارف کرایا۔۔۔ البتہ ایک دوسرے نقطہ نظر سے جو شاید زیادہ معقول ہے، اس پورے معاملے کی تشریح یوں بھی کی جاسکتی ہے کہ: چونکہ پردہ نشیں خواتین کیلئے پردہ نشینی اور گوشہ گیری کا انتظام ضروری تھا اس لئے یہ جگہ شاہی خاندان کی ان خواتین کے استعمال کے لئے محفوظ تھی جو مسجد میں اپنی نمازیں ادا کرتی تھیں۔ خواتین کے استعمال کے لئے بنائی گئی اس طرح کی گیلریاں آپ کو بارہ دواری مسجد، تانتی پارہ مسجد اور چھوٹی سونا مسجد، گور میں بھی نظر آجائیں گی جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بنگال کے مسلم سلاطین اپنے خاندان کی عورتوں کے تئیں کافی غیور اور فکرمند واقع ہوئے تھے۔

متوفی ڈاکٹر ٹی، بلوچ نے زیر بحث موضوع پر کچھ اس طرح کے خیالات کا اظہار کیا ہے: لگے ہاتھوں مجھے اس بات کا ذکر کر دینا چاہئے کہ اسلامیان بنگال کے درمیان اپنی بیویوں اور بیٹیوں کو عبادت کیلئے مساجد میں جانے کی اجازت دینے کا انوکھا رواج جاذب نظر بھی ہے اور ساتھ ہی ہمارے سامنے صنف نازک کے تئیں ان کے غیر معمولی احترام کی ایک تصویر بھی پیش کرتا ہے۔ میں بہت مشکل سے اس بات کا تصور کر سکتا ہوں کہ (یہ لوگ) بارہویں صدی عیسوی کے اواخر میں بختیار خلجی کے ماتحت پورے بنگال کو زیر بار کرنے والے تند مزاج وحشی سپاہیوں ہی کی نسل سے ہیں۔

یہ بات تو مسلم الثبوت ہے کہ اس جرنیل نے صرف جنت البلاد بنگال (اُن دنوں ہندوستان میں بنگال کو جنت البلاد کہا جاتا تھا) کو فتح کرنے کا ارادہ نہیں کیا تھا بلکہ اس کے اصلی مقاصد وعزائم تو اس سے بہت زیادہ تھے۔ چین کی ناکام مہم، جس کا بیڑا اس نے لکھنوتی کو فتح کرنے کے فوری بعد ہی اٹھایا تھا اور جس کا قابل رحم خستہ حال نتیجہ ہمالیہ کے زیریں سلسلے میں درپیش ہوا، بہت ہی صاف طریقے پر بختیار خلجی کے اصل عزائم پر روشنی ڈالتی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ بختیار خلجی کی نظر میں بنگال تو چین کے راستے کا صرف ایک پائیدان تھا مگر اس کے منصوبے بری طرح ناکام ہوئے اور اسی کی طرح اس کے کچھ جانشینوں کے بنائے ہوئے منصوبے بھی ناکام ہوگئے۔ اب اِس تند مزاج خانہ بدوش گروہ یا لشکر کو چونکہ بنگال کے تصرف ہی پر قانع ہونا تھا اس لئے میرا خیال ہے کہ ہم اس

بات پر ششدر نہیں ہوسکتے کہ ان کی وحشی عادتیں بنگال میں کچھ حد تک مہذب ہوگئیں''۔[1]

بالاخانہ سکندرشاہ:

جیسا کہ ماقبل میں بتایا جاچکا ہے کہ 'بادشاہ کا تخت' کے مغرب میں ۴۲/مربع فٹ وسیع ایک بے چھت کا کمرہ ہے جو ''بالاخانہ سکندرشاہ'' کے نام سے معروف ہے۔ مقامی لوگوں کے درمیان ایک روایت یہ ہے کہ سکندر کو اس کی شکست اور موت کے بعد اسی بالاخانہ کے اندر دفنایا گیا تھا مگر بدقسمتی سے ۱۰/گنبدوں والی چھت گر گئی اور بہت زیادہ ملبہ قبر کے اوپر جمع ہوگیا، جب بعد میں اس ملبے کو ہٹایا جانے لگا تو مزدوروں نے ملبے کے ساتھ ساتھ بادشاہ کی قبر کو بھی پوری طرح مٹا دیا اور ملحقہ تالاب میں پھینک دیا۔

الٰہی بخش نے قبر کی مساحت ۹/کیوبٹ لمبی اور ساڑھے ۷/کیوبٹ چوڑی (یعنی ساڑھے ۱۳/فٹ لمبی، ساڑھے ۱۱/فٹ چوڑی) بتائی ہے۔ کیوننگھم نے بھی ۱۸۸۰ء میں نوٹ کیا ہے کہ گنبدی چھت جس کے نیچے جسد کو سپرد خاک کیا گیا تھا، کے نیچے شکستہ عمارت میں تابوتی قبر موجود تھی اور اس وقت ظاہر ہوگئی تھی۔ 'بادشاہ کا تخت' کی طرف جانے والے دروازے کے اوپر ہندوانہ دیوتاؤں کی تصاویر ہیں اور ساتھ ہی ''ناگ دیوا'' نامی ایک سانپ کی عمدہ تراشیدہ شبیہ ہے جو دروازہ کے فریم پر چاروں طرف کنڈلی بنائے بیٹھا ہے۔

عمارت کے عقب پر موجود کتبہ سکندرشاہ:

مسجد کی مغربی دیوار میں باہر کی طرف اور عقبی دروازہ کے بالکل نزدیک ایک کتبہ موجود ہے جس سے عمارت کی تاریخ تعمیر اور بانی کے نام کا پتہ چلتا ہے۔ مندرجہ ذیل تحریر کتبے کا متن ہے جس کی ایک نقل پلیٹ نمبر ۶/میں دیکھی جا

1۔ عصبیت بری بلا ہے، جب اس کی پٹی آنکھوں پہ پڑ جاتی ہے تو مقابل بندے کی خوبیاں بھی خامیاں نظر آنے لگتی ہیں۔ یہی حال ڈاکٹر ٹی بلوچ کا بھی ہے۔ بختیار اور اس کے ہم مذہب لوگوں سے ڈاکٹر بلوچ کے تعصب کا یہ عالم ہے کہ اسلامیان بنگال کی پاکیزہ تہذیب، بلند رتبہ طرزِ معاشرت، شائستہ اقدار، عمدہ اخلاق، ان کی اچھائی، ان کا کمال، ان کی بھلائی، ان کا جوہر، ان کی زیبائی، ان کا وصف، ان کی قابلیت اور ان کا ہنر سب کچھ ڈاکٹر بلوچ کو ایک ڈھونگ اور ناکام حالات کے جبری تقاضے کا ایک نتیجہ محسوس ہوا۔ علاوہ ازیں انہوں نے جن نوکیلے الفاظ کا استعمال کیا ہے وہ بھی ان کے عصبیت زدہ ذہن کا پتہ دیتا ہے۔ ویسے تو زباں بھی ہے منہ میں ہمارے اور تاب سخن بھی ہے مگر چونکہ وقت اور مقام اجازت نہیں دیتے اس لئے محض اشارے ہی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ (میزان)

سکتی ہے: امر ببناء عمارة هذا المسجد الجامع فی ایام دولة السلطان الاعظم الاعلم الاعدل الاکرم اکمل السلاطین فی العرب والعجم الواثق بتائید الرحمن ابو المجاهد السلطان سکندر

ادینہ مسجد کے جانب مغرب میں واقع بالا خانہ سکندر شاہ ﴿تصویر نمبر ۲۹﴾
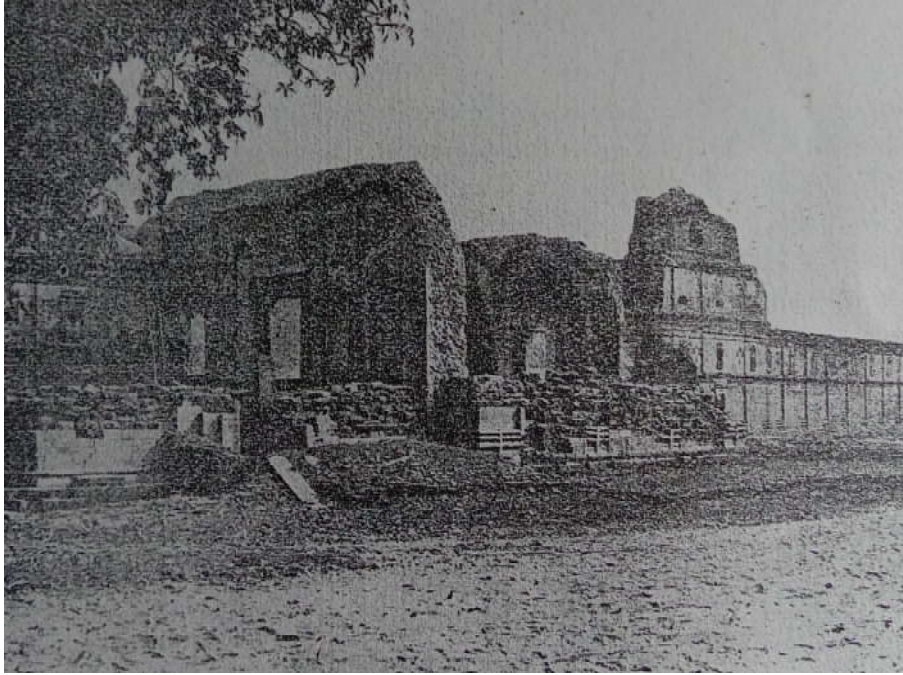
شاہ بن الیاس شاہ السلطان خلد خلافته الی الیوم الموعود کتبه فی التاریخ ست رجب سنة ست وسبعین وسبع مأة۔

ترجمہ: نہایت بڑے، نہایت علم والے، نہایت انصاف ور (اور) نہایت مہربان بادشاہ، شاہان عرب وعجم کے درمیان اکملیت رکھنے والے، تائید الٰہی سے محکم، ابوالمجاہد سلطان سکندر شاہ ابن سلطان الیاس شاہ، روز موعود تک اس کی سلطنت قائم رہے، کے ایام حکومت میں اس جامع مسجد کی تعمیر کا حکم دیا گیا۔ ۶/رجب ۷۷۰ھ (مطابق ۱۴/ فروری ۱۳۶۹ء) میں یہ لکھا گیا۔۔۔۔ کہتے ہیں کہ اس کتبے کو سکندر شاہ نے خود لکھا تھا۔

ادینہ مسجد کی سرگزشت اور وفات سکندر شاہ۔ از: صاحب ریاض السلاطین:

''سکندر نے ۷۶۶ھ میں ادینہ مسجد کی تعمیر کا آغاز کیا مگر اِس سے پہلے کہ وہ اِسے مکمل کر پاتا، موت نے اُسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ایک خوبصورت مسجد ہے اور اس کی تعمیر میں ضرور ایک بھاری رقم کا

صرفہ آیا ہے۔ خدا کرے کہ سکندر کی کاوشیں احسان مندی کے ساتھ یاد رکھی جائیں''۔ انہی مصنّف کے مطابق سکندر شاہ نے نو سال اور کچھ مہینے حکومت کرنے کے بعد اُن زخموں کی وجہ سے وفات پائی [1] جو اُسے گوال پارہ کی رزمگاہ

1۔ سکندر نے نو سال نہیں بلکہ اس سے کافی زیادہ لمبی مدت تک حکومت کی ہے، کیونکہ اس کی جانب سے ڈھالے گئے سکوں پر ۷۵۸ھ اور ۷۹۲ھ (مطابق ۱۳۵۹ء تا ۱۳۸۹ء) کے درمیان کی تواریخ درج ہیں۔ یہ سکے نہایت ہی خوبصورت طریقے پر ڈھالے گئے ہیں جو بنگال میں ٹکسالی فنی ہنرمندی کی سمت الراس کا پتہ دیتے ہیں۔ ڈاکٹر وائز (جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ص: ۸۵۔ تاریخ اشاعت: ۱۸۷۴ء) کے مطابق گوال پارہ، موجودہ ضلع ڈھاکہ (مقابل: گوالُنڈو) کی مغربی سرحد پر جعفر گنج کے نزدیک واقع تھا مگر اس حقیقت کے مدنظر کہ سکندر شاہ کو پنڈوہ میں دفنایا گیا تھا، غالب گمان یہ ہے کہ جنگ دارالحکومت کے قرب و جوار ہی میں کہیں لڑی گئی تھی۔ پنڈوہ کے قدیم جنوبی دروازے کے شمال میں ایک میل اور ادینہ مسجد کے جنوب مغربی گوشے میں تقریباً تین میل کے فاصلے پر بھی گوال پارہ نامی ایک گاؤں موجود ہے مگر جس گوال پارہ میں جنگ ہوئی تھی وہ راجح طور پر وہی جگہ ہے جس کی نشاندہی بوچانن ہیملٹن نے اپنی تصنیف 'دیناجپور' کے صفحہ نمبر ۲۳ر میں کی ہے۔ بوچانن کے مطابق یہ جگہ گوال پارہ (بولتا نام: پھول ڈانگی، رانی گنج یا رانی گڑھ) بامن گولہ کے جنوب مغربی گوشہ میں ۸ر میل کے فاصلے پر تنگن ندی (Tangan River) کے کنارے واقع ہے۔ ایک قدیم شاہی سڑک (جس کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ ناٹور سے رواں ہو کر مشرق میں گور اور مغرب میں راج محل تک جاتی ہے اور جو ساتھ ہی تنگن کے مشرق میں حبی پور اور بامن گولہ تھانوں کے درمیان ایک حدود اربعہ قائم کرتی ہے) اس ندی کو رانی گڑھ میں پل پار نظر آنے والے ایک حصار بند دفاعی مورچہ کے نزدیک کراس کرتی ہے۔ قرب و جوار میں چھتّیرا (Chattera) نامی کوئی ندی نہیں ہے بلکہ یہ نام چھتّیرا یاسَترا، جسے بوچانن ہیملٹن نے جنگ کے محل وقوع کی حیثیت سے متعارف کرایا ہے، مذکورہ دفاعی مورچہ کے جانب شمال چھترا بل (جہاں تک مجھے پتہ ہے، ''بل'' یہاں کی مقامی اصطلاح میں زراعت کی نشیبی اراضی کو کہتے ہیں۔ از: مترجم) میں اب تک موجود ہے۔ مولوی نجم الحسین (جن کا میں اس اطلاع کی فراہمی کیلئے منت کش ہوں) نے مجھ تک یہ اطلاع بھی بہم پہنچائی کہ بادشاہی روڈ پر واقع رانی گڑھ کے مشرق میں تین میل کے فاصلے پر اور شرقی و غربی سمتوں میں بہنے والے ایک بڑے تالاب کے سمت مخالف میں گوال پارہ یا گوار پارہ نامی ایک تیسرا گاؤں بھی ہے جبکہ اس گاؤں کے جنوب میں چار میل کے فاصلے پر ایک اور گاؤں ہے جس کا نام چَھترا ہے۔ (اسٹیپلٹن)

میں اپنے چہیتے اور سب سے چھوٹے بیٹے غیاث الدین کے خلاف جنگ لڑتے ہوئے نصیب ہوئے تھے۔غیاث الدین کو ایک حاسد اور بدگمان سوتیلی ماں کی ریشہ دوانیوں نے بغاوت پر آمادہ کیا تھا چنانچہ غیاث الدین نے سنار گاؤں سے ایک بھاری فوج کو لے کر کوچ کیا جبکہ اس کے باپ نے اس سے بھی زیادہ بڑی فوج کے ساتھ پنڈوہ سے پیش قدمی کی۔دونوں فوجیں گوال پارہ کے میدان میں روبرو ہوئیں جہاں دونوں گروہوں کے درمیان ایک انتہائی خونریز جنگ میں سکندر کو قتل کر دیا گیا۔

﴿یادگار نمبر ۶﴾ محل کا علاقہ

ادینہ مسجد کے جنوب مشرق میں تھوڑی ہی دوری پر ایک حصار بند علاقہ دریافت کیا گیا ہے جس کے بارے میں مقامی لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ سکندر شاہ کے محل کی جگہ تھی۔جیسا کہ بعد میں یہ امر واضح کیا جائے گا کہ یہ حصار بندی مسلم دور حکومت یا کم از کم شمس الدین الیاس شاہ کے زمانہ حکومت (۱۳۳۹ء۔تا۔۱۳۵۸ء) سے پہلے کی ہے،مزید برآں یہاں ایسے واضح نشانات بھی ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ علاقہ (علاوہ ازیں اور آگے شمال اور شمال مشرق کا علاقہ) ہندو فرماں روائی۔۔ممکنہ طور پر قدیم ترین ہندوانہ اقتدار۔۔کا ہیڈ کوارٹر تھا۔[1] اس جگہ کا حال سب سے ڈاکٹر بوچانن ہیملٹن نے بیان کیا۔سو اب قدیم شہر پنڈوہ کے سب سے اہم ترین علاقے کا تاریخی تعارف پیش کرنے کیلئے اُنہی کی کاوش ''ڈسکرپشن آف دیناجپور'' سے ایک اقتباس نقل کیا جائے گا۔

ڈاکٹر بوچانن ہیملٹن کی تصریحات:

ادینہ سے لگ بھگ ایک میل مشرق میں ''ستسگڑھ یا ساٹھ مینار'' نام کا ایک کھنڈر ہے جس کے بارے میں لوگ کہتے ہیں کہ وہ بادشاہ کا محل تھا،تاہم جنگلات کو قطع کرنے اور محل میں پہنچنے کے بعد مجھے بڑی مایوسی ہوئی،کیونکہ سوائے بلند و بالا نام کے مجھے وہاں ایسا کچھ بھی نہ مل سکا جسے شاہی رہائش گاہ کا سزاوار قرار دیا جا سکے۔باقی ماندہ آثار میں ایک

1۔وسیع پیمانے پر فضائی عکسی تصاویر،جو شہر پنڈوہ کے از حد توسیع والے زمانے کی تمام تفصیلات کو نمودار کر دیتی ہیں،کی تفتیش میں مجھے مسٹر کے،این،دکشت،نائب سربراہ محکمہ آثار قدیمہ کی جانب سے خوش اخلاقی کیساتھ تمام سہولیات مہیا کئے جانے کے نتیجے میں ۱۹۳۰ عیسوی میں پہلی بار یہ ممکن تھا کہ شہر کے شمال مشرقی حصے کا ایک مکمل سروے کیا جائے۔اس طرح سے محل وقوع اور اصلی مقام میں اُس وقت کئے گئے مشاہدات کی متعلقہ سرگزشت تقریباً تمام تر جدید ہے۔ (ایچ،ای،اسٹیپلٹن)

تالاب ہے جوتقریباً ۱۲۰رگز لمبا اور ۸۰رگز چوڑا ہے۔ ایک جگہ ایک ۱۶رفٹ اونچی خشتی دیوار میں خارج شدہ مٹیاں محصور ہوکر ٹیلہ بن گئی ہیں۔ لگتا ہے کہ یہ دیواران بہت سی عمارتوں کو شامل تھی جو کھنڈرات کی ڈیل ڈول کے پیش نظر دو کناروں پر قابل غور نظر آتی ہیں۔ شمال مغربی گوشے میں ایک چھوٹی سی عمارت ہے جو وسط میں ایک محرابدار حجرہ پر مشتمل ہے اور یہ وسطی حجرہ دیگر متعدد چھوٹے چھوٹے حجروں کے ساتھ مربوط ہے جن سے یہ عمارت گھری ہوئی ہے۔ یہ تمام حجرے مزکری روم کے ساتھ صرف اُسی جگہ پر رابطہ پیدا کرتے ہیں جہاں سے ایک راستہ سامنے سمتِ مخالف کی طرف نکلتا ہے۔ دیواروں میں نلکیوں کی موجودگی اور عمارت کی عمومی بناوٹ مقامی باشندوں کے اس خیال کی تصدیق کرتی ہے کہ یہ ایک غسل خانہ تھا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تالاب کے شرقی کنارے پر پوری لمبائی میں محرابوں کے سہارے ایک تنگ گیلری موجود تھی جہاں سے سیڑھیاں نیچے پانی تک جاتی تھیں اور گیلری کے اندر چھوٹے چھوٹے حجروں کی ایک قطار بنائی گئی تھی مگر اب یہ سب مکمل طور پر ملبہ کا حصہ بن چکا ہے۔ تالاب کے جنوب مشرقی کنارے سے تھوڑی ہی دوری پر غسل خانہ ہی کی طرح دِکھنے والی بغیر چھت کی ایک ٹوٹی پھوٹی عمارت ہے جو امکانی طور پر نہانے دھونے ہی کے لئے استعمال کی جاتی تھی۔ اینٹوں سے حد بندی کی گئی ایک استوانی غار جو عمارت کے ٹاپ سے نیچے کی طرف قابل لحاظ گہرائی تک جاتی ہے اور جو تقریباً دس فٹ چوڑی ہے، شاید آب رسانی کا کام کرتی تھی۔ ان عمارتوں میں پتھروں کا استعمال بہت کم ہوا ہے اور جو تھوڑا بہت ہوا بھی ہے وہ بالکل مسطح ہیں۔ خاکستری رنگ کے ناتراشیدہ گرینائٹ (خارا) کی دو بڑی بڑی سلیں کھنڈرات کی سطح پر پڑی ہوئی ہیں۔ کچھ اینٹوں پر سبز قلعی کے ساتھ استرکاری بھی کی گئی ہے۔

ادینہ اور سَتسگَرھ کے درمیان تقریباً نصف راہ پر ایک ارضی فصیل ہے جس کے غربی سائڈ پر ایک نالہ ہے۔ امکانی طور پر یہ فصیل محل کی مورچہ بندی کا ایک حصہ تھی۔

سَتسگَرھ میں واقع تالاب کی وسیع ترین طوالت شمال سے جنوب کی طرف پھیلی ہوئی ہے اور اسی لئے بغیر کسی شک وشبہ کے یہ کسی ہندو شخص کا کارنامہ ہے۔ دراصل ہندو اور مسلمان دونوں ہی طبقے اس کی تعمیر کو ’’پانڈو راجہ‘‘ سے منسوب کرنے پر متفق ہیں جو مدتوں پہلے یہاں رہتا تھا اور اس جگہ کا نام اپنے نام پر وضع کیا تھا۔ وہ ’یودِھسِتھر‘ کے باپ ہونے کی وجہ سے کافی مشہور ومعروف ہے۔ روایتی داستانوں کے مطابق ’’یودِھسِتھر‘‘ لگ بھگ پانچ ہزار سال پہلے آغازِ زمانہ میں ہندوستان کا فرماں روا تھا۔ اُس وقت یہ ریاست پانڈو خاندان کے ایک بہی خواہ اور دوست ’’وِراٹ‘‘

سے تعلق رکھتی تھی اور روایت کے مطابق یہ حصہ راست طور پر 'کیچوک' نامی ایک شخص کے زیرانتظام تھا جس کی بہن سے وراٹ نے شادی کی تھی۔ یہ ممکن ہے کہ کسی بغاوت یا متنازع جانشینی کے دوران پانڈو'' ہستیناپور'' سے دست بردار ہونے پر مجبور ہو گیا ہو اور پھر ایک دوستانہ اور مہربان ریاست میں پناہ گزیں ہو گیا ہو۔ اس بات پر ضرور غور کرنا چاہئے کہ ''پَروا'' ناخواندہ لوگوں کی زبان میں اصل نام کی ایک بگڑی ہوئی شکل ہے اور شہر کا صحیح نام ''پنڈیا (پنڈوہ)۔۔۔یا ۔۔۔پنڈویا''(Panduya or Pandovia) ہے۔

الف: دَھنُش دیگھی اور مینار:

اب محل کے علاقے میں پائے جانے والے کھنڈرات اور تالابوں کے موجودہ احوال کی طرف رخ کرتے ہیں۔ فضائی تصاویر کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ محل کا رقبہ مشرق سے مغرب تک تقریباً ۴۳۰,۱ر گز اور شمال سے جنوب تک ۲۱۰,۱ر گز تھا۔ جنوب مشرقی گوشے میں ناصر شاہ دیگھی کی پشتہ بندی کے ذریعے خاص چوگوشہ قلعہ بندی (۶۰۰ ر گز برابر ۶۰۰ گز) کی تشکیل عمل میں آئی ہے۔ ادینہ مسجد سے جنوب مشرق کی طرف آگے بڑھتے ہوئے سب سے پہلی دلچسپ چیز جو نظر میں آتی ہے وہ دَھنُش دیگھی ہے۔ شمال جنوب سمتوں میں بہنے والا یہ وسیع ترین تالاب لگ بھگ ۴۶۵ر گز لمبا اور ۱۰۵ر گز چوڑا ہے جو محل کی چہار دیواری کے شمال مغربی حصے کا تعین کرتا ہے۔ یہ تالاب تو اب تقریباً تسریب ہی کے عمل سے گزر رہا ہے تاہم اس تالاب کے جنوب مشرقی گوشے کے نزدیک ایک مینار ہے جو غالباً مغربی دروازہ کے دو میناروں میں سے ایک ہے۔ مینار سے متصل جگہوں کی بلند سطح کو دیکھ کر لگتا ہے کہ یہاں کبھی نہ کبھی اس بات کا پتہ لگانے کیلئے کھدائی گئی ہے کہ آیا اصل میں یہاں کوئی دروازہ تھا یا پھر کوئی مسجد تھی جس کے مینار سے موذن اذان پکارا کرتے تھے۔

ب: ستائیس گھرا دیگھی اور سکندر شاہ کے ایوان شاہی کا محل وقوع:

دھنش دیگھی کی جنوبی چھور کے مشرق میں ایک چوتھائی میل کے فاصلے پر اور مرکزی احاطہ بندی کے تقریباً وسط میں ستائیس گھرا دیگھی موجود ہے جو شمال سے جنوب تک لگ بھگ ۲۰۰ر گز لمبا اور مشرق سے مغرب تک تقریبا ۱۰۰ر گز چوڑا ہے۔ اس تالاب کو ایک کافی اونچی زمین والے ایریا سے گھیر دیا گیا ہے جس کی پیمائش شمال سے جنوب تک تقریباً ۵۵۰ر گز اور مشرق سے مغرب تک ۱۶۵ر گز ہے اور یہی اونچی زمین والا ایریا سلطان سکندر شاہ کے ایوان شاہی کا معروف محل وقوع ہے۔ ہیملٹن نے تالاب کے شمال مغربی حصے پر جن تعمیرات کی موجودگی کا ذکر کیا ہے، ۱۸۸۰ء میں

کیونگھم نے ان عمارتوں کا دوبارہ معائنہ کیا تھا اور وہ اس بات سے اتفاق کرتا ہے کہ یہ تعمیرات ایوان کے اندرتر کی غسل خانوں کی موجودگی کا پتہ دیتی ہیں۔۲۴رفٹ قطر والا آٹھ پہلو کمرہ اور اس کے ہر ہشت طرف موجود چھوٹے چھوٹے کمرے، علاوہ ازیں تالاب کے معروضی کنارے پر نہانے دھونے کیلئے بنائے گئے کچھ ملحقہ کیبن تاہنوز دیکھے جاسکتے ہیں لیکن اگران آثار کے تحفظ کا کوئی فوری انتظام نہیں کیا گیا تو بہت جلد یہ آثار ناپید ہوجائیں گے۔

ممکنہ طور پر ان غسل خانوں کو شمس الدین الیاس شاہ نے دہلی کے 'حوض شمسی' کی تقلید میں تعمیر کرایا تھا اور بادشاہِ بنگال کی جانب سے اِن غسل خانوں کی تعمیر بھی اُن وجوہات میں سے ایک تھی جن کی بنا پر دہلی کے فیروز شاہ نے ۱۳۵۴ عیسوی میں بنگال پر حملہ کیا تھا۔ مقامی لوگوں کے مطابق عمارت کا صحیح نام 'ستائیس گھرا' ہے اور بوچانن ہیملٹن نے جو ''دستسگرھ'' بتایا ہے وہ غلط ہے مگر اس 'گھرا' کا ٹھیک ٹھیک مطلب کیا ہے؟ یہ کوئی نہیں بتا سکتا۔ تاہم ممکنہ طور پر اس سے اِس بات کی جانب اشارہ ہے کہ یہاں ستائیس غسل خانے ہوا کرتے تھے یا پھر یہ کہ ایوان شاہی ستائیس متفرق کمروں پر مشتمل تھا۔ آثاریاتی سروے کی جانب سے کی جانی والی کھدائی کے لئے تالاب کے چاروں طرف اونچی زمین والے رقبے، خصوصیت کے ساتھ شمالی اور جنوبی حصے موزوں ترین ثابت ہوں گے۔

ج: پانڈپ راجہ دالان:

جنوب مشرقی گوشہ، ستائیس گھرا تالاب کے جنوب مشرق میں تھوڑی ہی دوری پر ایک اور محفوظ ترین تر کی حمام ہے جو ایک چھوٹے مگر گہرے گول تالاب کے مغرب میں واقع ہے۔ آخرالذکر تالاب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کے وسط میں ایک چھوٹی سی عمارت ہے جو سوکھے کے موسم میں نظر آتی ہے۔ مقامی لوگ اِس عمارت کو 'پانڈپ راجہ دالان' کہتے ہیں جو خصوصی طور پر اُس مقامی کہانی کی تصدیق کے حوالے سے کافی دلچسپ ہے جو ایک سوبیس سال پہلے بوچانن ہیملٹن کو سنائی گئی تھی کہ پنڈوہ اپنے نام اور اپنے قیام کیلئے قدیم دہلی کی پانڈوا فیملی سے تعلق رکھنے والے اُس راجہ کا رہین منت ہے جو بنگال میں ایک نئے شہر کی تلاش میں آیا تھا اور یہاں ایک مدت تک سکونت اختیار کی تھی۔ گزشتہ صدی کی ساٹھ کی دہائی میں رَونشا نے بھی اس بات کا ذکر کیا ہے کہ حالیہ مقامی روایت کے مطابق ستائیس گھرا تالاب پانڈونسل کے اَرجُن کا کارنامہ تھا۔ تاہم ایسا لگتا ہے کہ اصلی عمارت نفسِ ''ستائیس گھرا'' سے کافی بعد کی تخلیق ہے مگر چونکہ یہ عمارت بھی خودرو پیڑ پودوں کی وجہ سے تباہی و مسماری کے اُسی عمل سے گزر رہا ہے جس نے آخرالذکر عمارت کے ایک خاطر خواہ حصے کو زمین بوس کر دیا ہے اس لئے اِس کی مرمت و اصلاح کیلئے، خصوصًا دو یا تین محفوظ کمروں میں محرابوں کے اوپر موجود پچی کاری کو قائم رکھنے کیلئے محکمہ آثار قدیمہ کی جانب سے فوری طور پر اقدامات کئے

جانے کی سخت ضرورت ہے۔اگر یہ کام (بحسن وخوبی) مکمل ہوگیا تو بعید نہیں کہ یہ عمارت زائرین کے لئے ادینہ مسجد سے بھی زیادہ پرکشش بن جائے۔

عمارت کے جنوب مشرقی حصے میں واقع چکردار کمرہ یا کنواں اب پتھروں اور دیگر ٹوٹے پھوٹے اسباب کے ذریعے زمینی سطح تک بھر چکا ہے۔مقامی افراد(جن کے یہاں یہ چکردار گہری جگہ ''جیون کُنڈ''یعنی''چشمہ حیات'' کے نام سے معروف ہے کیونکہ مشہور یہ ہے کہ اس کا پانی مردہ جسم کو جان بخش دیتا تھا) کا کہنا ہے کہ ایک شدید زلزلہ کے وقت۔۔۔غالباً ١٨٩٧ء کے زلزلہ میں۔۔۔اس کا پانی اوپر بہ گیا تھا۔اگر یہ جگہ صاف کردی گئی تو ممکن ہے کہ یہاں سے آثاریاتی دلچسپی کے کچھ اسباب برآمد ہوجائیں اور مرمت واصلاح کے وقت ملحقہ تالاب کے وسط میں مبینہ طور پر موجود عمارت کے تئیں تحقیقات بھی کی جاسکیں گی۔

د: آٹ باگھ دیگھی یا راحت بینک دیگھی:

ناہموار زمینوں پر چلتے ہوئے جانب مشرق تھوڑی ہی دوری پر'زائر'شمال جنوب سمتوں میں بہنے والے ایک طویل اور عمیق ترین تالاب (جواب تیزی کے ساتھ روبہ تسریب ہے) کے پاس پہنچ جائے گا جس کی آبی سطح کی پیمائش ۵۰۰/ گز برابر ۱۷۵گز ہے۔ویسے معروف نام تو آٹ باگھ دیگھی یا''آٹھ شیر تالاب'' ہے مگر ممکنہ طور پر دوسرا نام''راحت بینک دیگھی'' بھی ہے،تاہم علاقہ کے'معمر ترین باشندہ' کا کہنا ہے کہ یہ دوسرا نام دراصل پانڈپ راجہ دالان کے نزدیک واقع ایک چھوٹے سے تالاب کا ہے۔بہرصورت!یہ نام''راحت بینک دیگھی'' ایک ایسے (ندی وغیرہ کے) موڑ پر منطبق ہوتا ہے جو کسی جزیرہ یا کسی چھوٹی سی خوشنما عمارت کو گھیرا ہوا ہو۔کہتے ہیں کہ تالاب کے پانی میں ہر دو سرے پر ایک ایک ٹاور ہوا کرتا تھا اور شمالی ٹاور (جواب ایک جزیرہ نما خشتی کھنڈر ہے) تو تاہنوز مغربی کنارے کے ساتھ ایک سفالی گھاٹ، جہاں تک آمدروفت کیلئے سائڈ سے خشتی سیڑھیاں بنادی گئی تھیں، کے ذریعے مربوط ہے۔ اس گھاٹ کے عین سمتِ مخالف مغرب میں شمال جنوب سمتوں میں بہنے والا ایک چھوٹا سا تالاب ہے جس کے جنوبی کنارے پر ایک سنگین گھاٹ پائی جاتی ہے اور بڑا ہی عجیب وغریب نام''کوئی بوتکی پوکور''اسی تالاب کا ہے۔آٹ باگھ دیگھی کے ٹاوروں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ دونوں ٹاور تالاب کے اندر سے بنائے گئے ایک زمین دوز راستے کے ذریعے باہم دیگر مربوط تھے اور مبینہ طور پر انہدام سے پہلے جنوبی ٹاور سے کچھ ہتھیار بھی برآمد کئے گئے تھے۔شمالی حصہ،آٹ باگھ دیگھی کے مشرق میں تھوڑی ہی دوری پر''پُران (قدیم) دیگھی'' نامی ایک چھوٹا سا گول تالاب موجود ہے۔کہتے ہیں کہ ایک مقامی شخص نے آٹ باگھ دیگھی کا نام'پُر ان دیگھی' (حوض حیات) رکھ دیا تھا جس کی وجہ سے

کافی کنفیوژن پیدا ہوئی، یہاں تک کہ علاقہ کے معمر ترین شخص نے طرزِ ادا کی تصحیح کی اور تالاب کی مقام بندی میں درآئی خطا کی طرف اشارہ کیا۔

ر: ناصر شاہ دیگھی:

حالیہ دنوں آدیواسیوں نے ایوان شاہی کی حد بندی میں خودرو جنگل کی صفائی کا کام شروع کیا ہے تاہم ممکنہ طور پر اِس سے قبل محل کا پورا علاقہ گھنے جنگلات سے ڈھکے ہونے کی وجہ سے نہ تو بوچانن ہیملٹن نے اِس گراں قدر تالاب کا دورہ کیا، نہ رَونشانے اور نہ ہی کیوننگھم نے، اور منشی الٰہی بخش نے تو اِسے ستائیس گھرا دیگھی کے ساتھ گڈمڈ کر دیا۔ کوئی شک نہیں کہ اپنے دورِ عروج کے وقت ۲۵/مربع میل حصار بند خطہ پر مشتمل پنڈوہ میں موجود رہے تمام تالابوں کے درمیان یہ تالاب اب سب سے اچھی اور محفوظ حالت میں ہے مگر یہ تالاب قرب وجوار میں موجود اُس زمانے کے بقیہ تالابوں کی بنسبت کافی بعد کا معلوم ہو رہا ہے، کیونکہ یہ تالاب اِس علاقہ میں پشتہ بندا ریا کے جنوب مشرقی گوشے سے ایک قسم کی قلعہ بندی کی طرح پروجیکٹ کرتا ہے۔ شمال جنوب سمتوں میں بہنے والا یہ ایک کافی گہرا تالاب ہے جس کا پانی بالکل شفاف ہے اور صرف آبی سطح کی پیمائش تقریباً ۳۶۰/گز برابر ۲۵۰/گز ہے۔ اس تالاب کا جنوب مشرقی کنارا ادینہ مسجد سے لگ بھگ سوا میل کے فاصلے پر ہے۔

تالاب کا نام اور اس کی محفوظ حالت دونوں اس بات پر غماز ہیں کہ اسے ناصر الدین نصرت شاہ ولد حسین شاہ (۱۵۱۹ء۔۱۵۳۲ء) نے کھدوایا تھا، مگر دوسری طرف ریاضؔ میں اِس بادشاہ کے تئیں کوئی بھی ایسا حوالہ نہیں ملتا کہ اِس نے کبھی پنڈوہ میں قیام بھی کیا تھا اس لئے ممکنہ طور پر اِس تالاب کا تعلق مزید زمانہ رفتہ میں ناصر الدین محمود شاہ (۱۴۴۲ء۔۱۴۵۹ء) کے ساتھ قائم ہوتا ہے جو الیاس شاہ کی نسل کا ایک فرد تھا اور جس کے دورِ حکومت میں (غالبًا دورِ حکومت کے آخر سال) لطیف خان نے آستانہ حضرت نور قطب العالم کے مطبخ میں ایک کتبہ نصب کیا تھا۔ گرچہ اس بات کی تفہیم مشکل ہے کہ آخر یہ تالاب ۴۷۰/سال تک کیونکر اتنی اچھی اور محفوظ حالت میں باقی رہ گیا؟ تاہم اگر فی الواقع اس جگہ پر، جیسا کہ کہا جاتا ہے، محمود شاہ کے مورث اعلیٰ الیاس شاہ کا 'محل' موجود تھا اور وہ راجہ کانس کے گھرانے کی دست درازی کے دوران کھنڈرات میں تبدیل ہو گیا تو اب یہ بات صرف ناصر الدین محمود شاہ ہی کے حق میں فطری اور طبعی ہو سکتی ہے کہ اس نے ''ستائیس گھرا'' کے آس پڑوس ہی میں قیام کی خواہش کی ہو۔ علاوہ ازیں، چونکہ 'ناصر شاہ دیگھی' کے جنوب مشرقی حصے میں کوئی احاطہ بندی موجود نہیں ہے اس لئے اِس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تالاب کسی ایسے

بادشاہ کے عہد میں کھودا گیا ہے جسے کسی حریف کا تھوڑا بہت خوف تھا اور یہ نقطہ نظر نصرت شاہ سے زیادہ محمود شاہ کی تاریخ حیات کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔

س:سُکان دِیگھی (خشک تالاب)،موضع برج پور اور دَمدَمہ (قلعہ):

مسلم بادشاہوں کے 'پلیس ایریا' کو محیط احاطہ بندی کے جانبِ شمال تاہنوز اونچی زمینوں کی ایک کشادہ پٹی ہے جو اپنے جنوبی کنارے کو شمال جنوب سمتوں میں بہنے والے 'سُکان دِیگھی' نامی ایک بہت بڑے خشک تالاب کی ساخت مہیا کرتی ہے۔ یہ تالاب تقریباً ۶۲۵ رگز لمبا اور ۲۷۵ رگز چوڑا ہے جو ناصر شاہ دِیگھی سے تقریباً دگنا بڑا ہے۔ یہ سکان دِیگھی ،موضع بُرج پور(ریوینیو سروے نمبر:۱۰۶) جو دور شمال تک پھیلا ہوا ہے اور پنڈوہ کے شمالی دروازہ (ہیملٹن کے گڑھ دوار) کو بھی شامل ہے، کے شمالی حصے میں واقع ہے۔موضع کا نام برج ۔۔مطلب قلعہ ۔۔شاید قلعہ بند اور مستحکم دروازہ ہی کی طرف منسوب ہے۔تاہم شمال مغربی حصے میں وِنو دپور نامی ایک دوسرا موضع (نمبر:۱۰۵) بھی ہے جو ''دَمدَمہ'' کا ایک متبادل نام ہے۔آس پڑوس میں اب تو قلعہ کا کوئی نام ونشان ہی نہیں ہے مگر قلعے کی جائے وقوع کا اِس وسیع تر تالاب [1] کے ساتھ ربط وتعلق اِس خیال کو پیدا کرتا ہے کہ دَمدَمہ دراصل ہندو بادشاہوں کے قلعے کی جائے وقوع کا خاکہ کش ہے۔اس قلعے کے تمام نشانات کا غائب ہوجانا بھی کوئی حیرت کی بات نہیں کیونکہ اس قلعہ کے تمام تعمیراتی اسباب یقینی طور پر الیاس شاہ کے ایوان شاہی کی تعمیر کیلئے یہاں سے منتقل کر لئے گئے ہوں گے۔

مذکورہ بالا تازہ انکشافات کی روشنی میں یہ بات کافی خواہش انگیز معلوم ہوتی ہے کہ محکمہ آثار قدیمہ کو چاہئے کہ وہ فضائی عکسی تصاویر کے ذریعے واضح شدہ پنڈوہ کی پوری جائے سکونت ،خصوصًا پلیس ایریا اور اس کے آس پڑوس کا ایک محتاط سروے کرائے اور اس کے علاوہ منتخب مقامات مثلاً ستائیس گھرا دِیگھی کے چاروں طرف اور ناصر شاہ دِیگھی وغیرہ میں تحقیقاتی کھدائی کو بروئے کار لائے۔اس طرح کے اقدامات نہ صرف مسلم دورِ حکومت بلکہ قدیم ہندوانہ عہد جس کے بارے میں اب بہت کم معلومات دستیاب ہیں، کے حوالے سے بھی تاریخ بنگال کی اسٹڈی کو یقینی طور پر گراں قدر معنویت عطا کریں گے۔

1۔قدیم پنڈوہ کے قرب وجوار میں وسیع ترین تالاب اب شمال جنوب سمتوں میں بہنے والا روبہ تسریب ''پال کھان یا رائے کھان دِیگھی'' ہے جو اِک لاکھی ریلوے اسٹیشن کے نزدیک سکان دِیگھی کے مشرق میں ۴رمیل کے فاصلے پر واقع ہے اور جس کا طول وعرض تقریباً ۱,۳۲۰رگز برابر ۵۲۵رگز ہے۔(ایچ ،ای ،اسٹیپلٹن)

باب چہارم

گور اور پنڈوہ کے قرب وجوار میں موجود دیگر دلچسپ مقامات

﴿یادگار نمبرا۔۔۔اولڈ مالدہ﴾

شہر اولڈ مالدہ، مہانندا۔کالندری سنگم کے سمت مخالف مہانندا ندی کے شرقی کنارے پر، حصارِ گور کے شمال میں تقریباً ۱۳ رمیل اور سول اسٹیشن، انگلش بازار سے چار میل کے فاصلے پر واقع ہے۔گردونواح میں پائے جانے والے کھنڈرات سے قدیم شہر، جس نے ممکنہ طور پر مسلم دارالحکومت پنڈوہ کی ایک بندرگاہ کے طور پر ترقی وطالع مندی کا پہلا زینہ طے کیا تھا، کی حدود ووسعتیں بخوبی عیاں ہوجاتی ہیں۔[1] کالندری ندی چونکہ زمانہ ماضی میں گنگا ہی کی ایک اہم ترین شاخ تھی اس لئے اولڈ مالدہ کی صورت حال کافی اچھی تھی۔ یہاں پر قیمتی اسباب کے بہتر تحفظ کے لئے ایک بلند احاطہ شدہ کٹرہ یا حصار بند کارواں سرائے تھا، اور بلاشبہ حسینی بادشاہوں کی حکومت کے دوران یہ جگہ کافی زیادہ اہمیت کی حامل تھی۔قدیم شہر کی حدود اربعہ کے اندر پائے گئے مؤرخہ ۸۹۹ھ ہجری تا ۹۳۸ھ ہجری (۱۴۹۳ء۔۔۱۵۳۱ء) والے کم ازکم ۹ رکتبات میں اِس شاہی سلسلے کے سلاطین کے نام درج ہیں، تاہم اگر وہ کتبہ جواب کٹرہ کے نزدیک آستانہ شاہ گدا کی چہار دیواری کے دروازہ کے اوپر نصب ہے، اصلی طور پر اِسی جگہ سے تعلق رکھتا ہے تو یہ بات طے ہے کہ یہ شہر کافی پہلے ہی سے پھلنا پھولنا شروع ہوگیا تھا، کیونکہ اِس کتبے میں ناصرالدین محمود شاہ اول کے عہد حکومت میں ہلال نامی ایک شخص کے ذریعے ایک مسجد کی تعمیر کا ریکارڈ ہے اور ۱۹ رشعبان ۸۵۹ھ (مطابق ۴ راگست ۱۴۵۵ء) کی تاریخ درج ہے۔اکبرنامہ میں مالدہ کے ذکر سے معلوم ہوتا ہے کہ دور اکبری میں مالدہ ایک اہم ترین مرکزی خطہ بنتا جارہا تھا جبکہ آئین میں سرکار جنت آباد میں شامل ۶۶ رمحلوں میں سے ۱۱ رمحلے مالدہ کے گردوپیش میں واقع ہوئے ہیں۔

صنعت وحرفت:

اولڈ مالدہ میں صرف ایک خردہ فروشی ہی کی وسیع تجارت نہ تھی بلکہ زمانہ قدیم ہی سے یہ شہر ریشم اور سوت صنعتوں کا

1۔۱۸۸۸ء میں اولڈ مالدہ سے راجہ کُشان واسودیوا (تقریباً ۲۰۰ء) کے ایک طلائی سکہ، جواب میرے صندوقچہ میں ہے، کی دریافت اس نقطہ نظر کو جنم دیتی ہے کہ یہ جگہ بہر حال قدیم ترین ہندوانہ دورِ حکومت کا بھی معاشی مرکز رہی ہے۔بتاتے چلیں کہ وِنسینٹ اسمتھ نے اپنی ''انڈین میوزیم کٹیلاگ'' کی پلیٹ نمبر ۱۳ رمیں جس قسم کی عکوس پیش کی ہیں، یہ طلائی سکہ اسی کی ہم شکل ہے۔(ایچ،ای،اسٹیپلٹن)

ایک وسیع ترین مرکز رہا۔ چنانچہ ۹۸۷ھ مطابق ۱۵۷۹ء کے فوری مابعد ہی لکھی گئی ایک کتاب میں کہا گیا ہے کہ: شیر خان نے شیخ خلیل کو پیسے، خوبصورت و بیش قیمت کپڑے اور بھاری مقدار میں مالدہ، بنگال کے کارخانوں میں تیار کردہ چیزیں دیں'' (ملاحظہ فرمائیں: تاریخ شیر شاہی، از: عباس خان شیروانی)۔ ۱۶۲۰ء اور ۱۶۲۱ء میں پٹنہ میں مقیم برطانوی ایجنٹوں کے خطوط میں: مالدہ کے دوپٹوں اور ایران میں بھیجے جانے والے مالدہ کے تجارتی مال واسباب کا ذکر ملتا ہے۔ اولڈ مالدہ میں وسیع پیمانے پر گددار سوزنیاں بنائی جاتی تھیں جن پر فنکارانہ سوزن کاری کی مدد سے نقش و نگار کیئے جاتے تھے اور ان منقش سوزنیوں کو اکثر عورتیں ہی بناتی تھیں مگر فقدان تعاون کی وجہ سے یہ تجارت اب دم توڑ رہی ہے۔ تاہم ۱۷۷۰ء تک اولڈ مالدہ کے جنوب میں ۵ر میل کی دوری پر واقع شاہ پور نامی گاؤں میں وسیع پیمانے پر ریشمی کپڑے (کتان، سراجا، بلبل چشم وغیرہ) بنائے اور خلیج فارس میں بھیجے جاتے تھے۔ جب کارخانہ کو انگلش بازار منتقل کردیا گیا تو اولڈ مالدہ ریشم اور سوت کے حوالے سے ایسٹ انڈیا کمپنی کا مقامی تجارتی مرکز بن گیا۔ علاوہ ازیں، اولڈ مالدہ میں فرانسیسی اور نیدرلینڈی تاجروں نے بھی فیکٹریاں لگائی تھیں۔

شہر کے قدیم ڈویژنوں کے نام:

اولڈ مالدہ کے قدیم ڈویژنوں کے نام، شمال سے جنوب تک اُن کے وقوع کی ترتیب کے لحاظ سے پیش کئے جارہے ہیں: کھِدر پور☆، پوراٹولی ☆، دھوباپارہ، موکاٹی پور، شیخ پارہ☆، بانس ہاٹا ☆، پھولباڑی، پٹنی ٹولہ، شوری پارہ، ساک موہن، فیروز پور، گابینی دارٹولہ، گوال ٹولی، تاراپور، اُپرسروری، کھودسروری، سروری، گھوڑا اہارا☆، کائٹ پارہ☆، کہارٹولہ، توت باڑی، کتّی ٹولہ، تیل مُنڈائی، رُکان پور☆، کٹرہ، مغل ٹولی ☆، بیروج پارہ (بیروزگار ٹولہ☆)، ہاتھی شالا ☆، چالیس پارہ، قاضی دارا۔ جن ڈویژنوں کے ساتھ ستاروں کے نشانات لگے ہیں، وہ اب آباد نہیں ہیں۔ مزید برآں! باچاماری، مولناٹولی اور شاہ مُنڈائی موجودہ میونسپل باؤنڈری، اولڈ مالدہ کے جنوب میں واقع ہیں۔

اولڈ مالدہ کی یادگاریں:

اب شہر کی اہم یادگاریں، شمال سے جنوب تک ان کے وقوع کی ترتیب کے لحاظ سے، سلسلہ وار پیش کی جائیں گی:

الف: ساک موہن مسجد:

شمال کی طرف جانے والی ایک ضمنی سڑک کے بائیں بازو پر محلّہ ساک موہن میں واقع یہ ایک چھوٹی سی مسجد ہے اور بیانات کے مطابق شیخ فقیر محمد برادر شیخ بھیکہ نامی ایک شخص نے اِس کی تعمیر کرائی تھی۔ غالبًا اِسی وجہ سے مقامی لوگوں

کا خیال ہے کہ محلے کا اصل نام ''شیخ محل'' ہونا چاہئے۔ چہار دیواری کے دروازے کے اوپر دولائن والا ایک کتبہ تو ہے مگر اُس کی خواندگی اب بلوچ مین کے وقت سے بھی زیادہ مشکل ہوگئی ہے، تاہم عینِ مسجد کے دروازہ کے اوپر بھی ایک کتبہ ہے جس پر زمانہ یوسف شاہ کی تاریخ درج ہے۔ وہ کتبہ کچھ اس طرح ہے:

قال النبی صلی الله علیه وسلم من بنی مسجدا لله بنی الله له تعالی قصرا فی الجنة مثله ☆ بنی بامر السلطان شمس الدنیا والدین ابو المظفر یوسف شاه بن باربک شاه بن محمود شاه السلطان خلد الله ملکه وسلطنته هذا المسجد فی التاریخ غرة جمادی الاول سنة سبعین وثمانمأة۔

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس نے اللہ کے لئے ایک مسجد بنائی، اللہ اُس کے لئے اُسی کی طرح جنت میں ایک محل بنائے گا۔ شمس الدنیا والدین، ابوالمظفر سلطان یوسف شاہ ابن باربک شاہ ابن محمود شاہ، اللہ اس کی مملکت اور سلطنت کو ہمیشہ قائم رکھے، کے حکم سے یکم جمادی الاول ۸۷۰ھ (مطابق ۱۴۶۵ء) میں اِس مسجد کی تعمیر عمل میں آئی۔

مذکورہ تاریخ بہرحال محل نظر ہے، کیونکہ روایات کے مطابق تو ۸۷۹ہجری تک یوسف شاہ تختِ شاہی پر متمکن ہی نہیں ہوا تھا۔

ب: کٹرہ یا کارواں سرائے:

ریاض کے مطابق ۴-۱۳۵۳عیسوی کے موسم سرما میں جب بادشاہِ بنگال شمس الدین الیاس کے خلاف محاذ آرائی کیلئے دہلی کا ایک تغلق بادشاہ فیروز شاہ سوم یہاں آیا تھا تو اُس نے اِسی جگہ پر اپنا پڑاو ڈالا تھا، مگر کٹرہ محلّہ فیروز پور کے دائرے میں نہیں آتا جو شہر کے شمال میں نصف میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ کٹرہ یا کارواں سرائے عہد ماضی میں اُن تاجروں کے اجناس تجارت کی حفاظت کے لئے استعمال کیا جاتا تھا جو یہاں ٹھہرتے اور پنڈوہ کے دربار میں رسائی کا ارادہ رکھتے تھے۔ کٹرہ کا دروازہ بہت ہی مستحکم طریقے پر تعمیر کیا گیا تھا اور محرابیں تو اب تک قائم ہیں، تاہم کمروں کی حالت کافی خستہ ہے۔ چونکہ یہ جگہ تاریخی اعتبار سے کافی اہم ہے اور دروازے وملحقہ کمروں کی بناوٹ بالکل انوکھی ہے اس لئے اگر کم از کم شمالی اور جنوبی دروازے ہی حکومتی اخراجات پر بحال کردیئے جاتے تو یہ ایک بہتر اقدام ہوتا۔

اگر ر َونشا کی پیش کردہ یہ حکایت (گور، ص:۴۴) قابل اعتبار ہے کہ کٹرہ کی تعمیر اُسی شخص کے بھائی نے کرائی تھی جس نے ملحقہ جامع مسجد کی تعمیر یا مرمت کا کام کرایا تھا تو موجودہ عمارت (یقیناً) اکبر کے زمانے کی ہے۔

﴿تصویر نمبر ۳۰﴾ کٹرہ یا حصار بند کارواں سرائے، اولڈ مالدہ
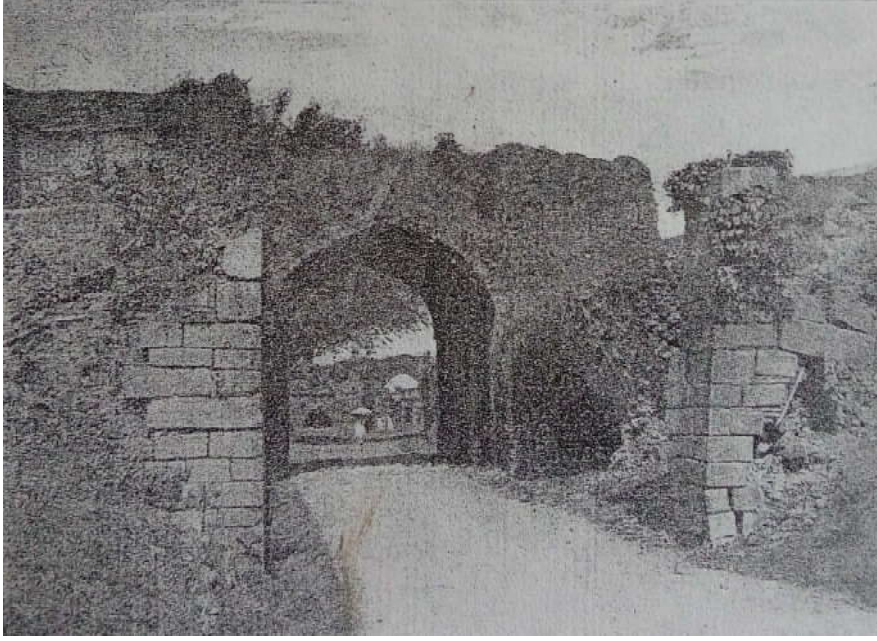
ج: آستانہ شاہ گدا:

یہ چھوٹی سی عمارت کٹرہ اور جامع مسجد کے درمیان مغل ٹولی میں واقع ہے اور اِس کے اندر حضرت شاہ گدا کی قبر موجود ہے۔ سامنے کے صحن میں اور بھی دیگر چار قبریں موجود ہیں جن میں سے جانبِ مشرق واقع قبر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ شیخ کے طوطے کی ہے جس نے قرآن کے کچھ حصے حفظ کر لئے تھے۔ اُس سے اگلی قبر ایک فقیر کی ہے جنہیں مستان میاں لنگوٹ بند[1] کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ تیسری قبر ایک عورت درویشی بی بی (شاید شاہ گدا کی اہلیہ) کی ہے اور چوتھی قبر شاہ گدا کی دائی کی ہے۔ آستانہ کے جانبِ جنوب احاطہ ہی کے اندر پانچ قبریں اور ہیں جو اغلب طور پر آستانہ شاہ گدا کے خداموں کی ہیں۔ اِس عمارت کے جانبِ مخالف سڑک کی دوسری طرف ''دودھ پیر'' کی قبر موجود ہے۔ ضعیف الاعتقاد اور توہم پرست مسلمان قبر کے سرہانے پر بنی ایک کھوکھلی جگہ میں نذر کے طور پر دودھ

1۔ کہتے ہیں کہ ''مستان'' کا معنی ہوتا ہے ''شیفتہ محبت الٰہی''۔۔۔ جبکہ 'لنگوٹ بند' فقراء کی ایک ایسی جماعت کو کہتے ہیں جو تجرد کی علامت کے طور پر مضبوطی کے ساتھ دھوتی باندھتی ہے۔ موجودہ وقت میں بھی چیت پور، کلکتہ میں ''مستان شاہ'' نامی ایک پیر رہتے ہیں۔۔ ''شاہ گدا'' کا مطلب ہوتا ہے: منگتا بزرگ۔ (ایچ، ای، اسٹیپلٹن)

بہاتے ہیں۔[1]

دو کتبے آستانہ شاہ گدا سے منسلک ہیں، ایک نفس عمارت اور دوسرا چہار دیواری کے دروازے کے اوپر۔ جو کتبہ نفس عمارت کے دروازہ کے اوپر ہے اُسے غالبًا حسین شاہ کے دورِ حکومت میں مقامی جامع مسجد میں اُس کی تعمیر یا مرمت کے وقت نصب کیا گیا تھا اور دوسرے کتبے میں ہلال نامی ایک شخص کے ذریعے ایک مسجد کی تعمیر کا ریکارڈ ہے ۔علاوہ ازیں، یہ کتبہ (اگر کتبہ اپنی اصلی جگہ پر ہے تو) شاہ گدا کے دورِ عروج کی کچھ جھلکیاں پیش کرتا ہے:

کتبہ نمبر۱:

قال النبی صلی اللہ علیه وسلم من بنی مسجدا للہ بنی اللہ له بیتا مثله فی الجنة ☆بنی هذا المسجد الجامع السلطان المعظم المکرم علاء الدنیا والدین ابو المظفر حسین شاہ السلطان بن سید اشرف الحسینی خلداللہ ملکه وسلطانه فی سنة احدی عشر وتسعمأة۔

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس نے اللہ (کی رضا) کے لئے ایک مسجد بنائی، اللہ اس کے لئے اسی کی طرح جنت میں ایک گھر بنائے گا ☆عظمت واحترام والے بادشاہ، علاء الدنیا والدین، ابوالمظفر سلطان حسین شاہ ابن سید اشرف الحسینی، اللہ اس کی مملکت اور قوت کو سدا قائم رکھے، نے ۹۱۱ھ (مطابق ۱۵۰۵ء) میں اِس جامع مسجد کی تعمیر کرائی۔

کتبہ نمبر۲:

قال علیه السلام من بنی مسجدا بنی اللہ له قصرا فی الجنة فی عهد السلطان الاعظم المعظم ناصرالدنیا والدین ابو المظفر محمود شاہ السلطان بنی هذا المسجد بنده درگاہ

1۔اللہ اکبر! رہبر کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم تو یہ ہے کہ اگر روٹی کا کوئی ٹکرا زمین پر پڑا ملے تو اُسے صاف کر کے کھالو، کیونکہ وہ اللہ کی نعمت ہے اور نعمت الٰہی کی یوں توہین نہیں کرتے۔ خود آپ نے اپنی حیات ظاہری میں اِن سنہری تعلیمات پر عمل کر کے بھی دکھایا تا کہ امت سختی کے ساتھ ان باتوں پر عمل پیرا ہو جائے۔لیکن ہائے رے بدنصیبی! آج اسی نبی کا کلمہ پڑھنے والے کچھ لوگ ''کفار کی تقلید میں'' ایک کھوکھلی جگہ پر دودھ جیسی نعمت کو ضائع کر رہے ہیں۔ خدارا! آنکھیں کھولئے، ہوش میں آیئے، رنگِ اغیار کو چھوڑیئے اور نبی ﷺ کی سنتیں اپنایئے۔ بالیقیں! دین و دنیا کی سرمدی نعمتیں تعلیمات نبوی علیہ التحیۃ والثناہی کے اندر مضمر ہیں۔(میزان)

هلال ☆ تحريرا فى التاسع عشر من ماه شعبان عمت ميامنه سنة تسع و خمسين وثمانمأة۔

ترجمہ: انہوں نے، ان پر رحمت نازل ہو، ارشاد فرمایا: جس نے ایک مسجد بنائی، اللہ اس کے لئے جنت میں ایک محل بنائے گا۔ سر بلند اور سرفراز بادشاہ، ناصر الدنیا والدین ابوالمظفر سلطان محمود شاہ کے عہد میں نیازمندِ درگاہ، ہلال نے اِس مسجد کی تعمیر کرائی ☆ یہ کتبہ ۱۹/ویں ماہ شعبان، اس مہینے کا فیضان عام ہو جائے، ۸۵۹ھ (مطابق ۴/اگست ۱۴۵۵) میں تحریر کیا گیا۔

د: چھوٹی مسجد:

کٹرہ کے مشرق میں ایک مسجد ہے جسے 'چھوٹی مسجد' کہتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب ایک زلزلہ کی زد میں آ کر یہ مسجد ٹوٹ پھوٹ گئی تو مقامی لوگوں نے اُس کے لئے یہ نام وضع کر لیا۔ کتبہ، جواب غائب ہے، سے ظاہر ہوتا ہے کہ خان معظم اُلوغ شیر خان نامی ایک شخص نے ۲۰/شوال ۹۰۰ھ (مطابق ۱۴/جولائی ۱۴۹۵ء) میں اِس مسجد کی تعمیر کرائی تھی۔ مسجد کے جنوب مشرق میں ایک قبر ہے جو شاید بانی مسجد کی ہے۔ اور ہاں! یہ مسجد تیزی کے ساتھ کھنڈر میں بدلتی جا رہی ہے، کیونکہ مرکزی گنبد اور اس کے علاوہ برآمدے کے تینوں گنبد بھی منہدم ہو چکے ہیں۔ کتبہ مندرجہ ذیل ہے:

قال النبى صلى الله عليه وسلم من بنى مسجدا لله بنى الله له قصرا فى الجنة مثله ☆ فى عهد السلطان المؤيد بتائيد الديان المجاهد فى سبيل الرحمن خليفة الله بالحجة والبرهان علاء الدنيا والدين ابو المظفر حسين شاه السلطان خلد الله ملكه وسلطانه بنى هذا المسجد خان معظم الغ شير خان فى العشرين من شوال سنة تسعمأة.

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس نے اللہ کیلئے ایک مسجد بنائی، اللہ اس کیلئے اسی کی طرح جنت میں ایک محل بنائے گا۔ حساب لینے اور بدلہ دینے والے خدائے برتر کی اعانت پانے والے بادشاہ، راہ مولی کے مجاہد، روشن دلیل اور قطعی ثبوت کے ذریعے نائب خدا، علاء الدنیا والدین، ابوالمظفر سلطان حسین شاہ، اللہ اس کی مملکت اور سلطنت کو سدا قائم رکھے، کے عہد میں خان معظم الغ شیر خان نے ۲۰/شوال ۹۰۰ھ میں اس مسجد کی تعمیر کرائی۔

ر: جامع مسجد:

بعض حد تک نقشیں اینٹوں اور بعض حد تک پتھروں سے بنی یہ مسجد نسبتاً جدید طرز کی ہے تاہم اگر یہ وہی جامع مسجد

ہے جس کا حوالہ اِس وقت آستانہ شاہ گدا کے اوپر موجود کتبے میں دیا گیا ہے تو پھر یہ مسجد کم از کم حسینی بادشاہوں کے دور

﴿تصویر نمبر ۳۱﴾ جامع مسجد، اولڈ مالدہ
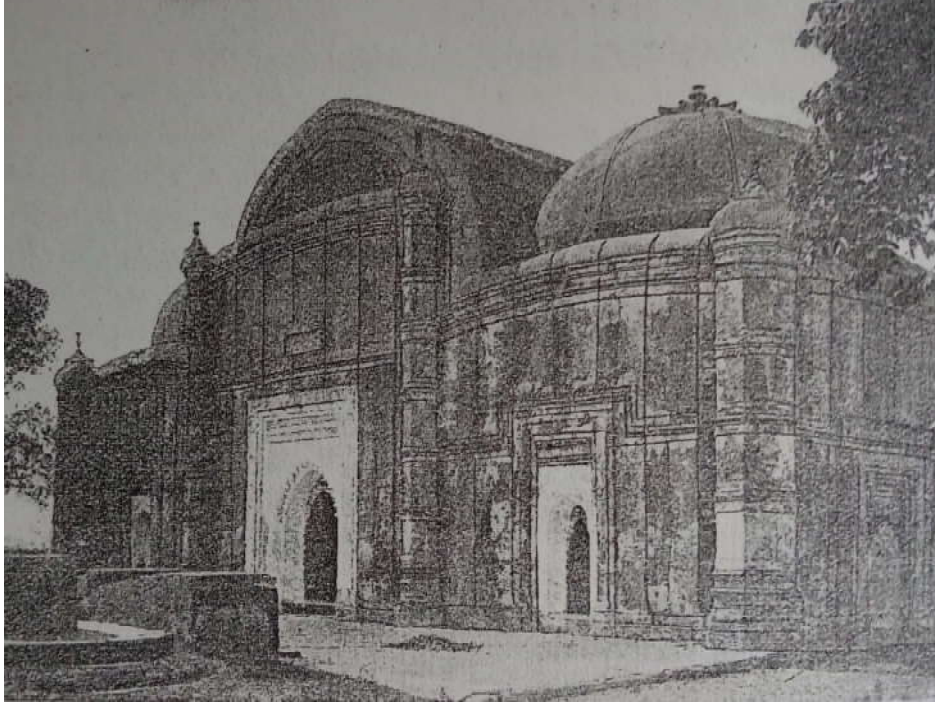
سے ضرور تعلق رکھتی ہے۔ مسجد ۲۷ رفٹ لمبی اور ۲۷ رفٹ چوڑی ہے، دو گنبد ہیں اور ایک بڑی سی محراب دار چھت ہے، دونوں بغلی ہم کمرے ۱۶ رمربع فٹ اور مرکزی ہال ۲۲ رفٹ برابر ۱۸ رفٹ وسیع ہے۔ گوشوں میں ۸ رمنارے ہیں اور سامنے ایک دروازہ ہے۔ دروازے کے اوپر نصب شدہ کتبے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مسجد دور اکبری میں ۱۰۰۴ھ (مطابق ۱۵۹۶ء) میں تعمیر یا مرمت کی گئی تھی۔ کتبے کا متن اور ترجمہ مندرجہ ذیل ہے:

ایں قبلہ کہ در عالم معلوم آمد۔۔۔در ہند بنام کعبہ موسوم آمد

چوں ثانی کعبہ بود تاریخ ز غیب۔۔۔بیت اللہ الحرام معصوم آمد

ترجمہ: یہ قبلہ جو جہاں بھر میں معروف ہے، ہند میں ''کعبہ'' کے نام سے پکارا جاتا ہے، گویا کہ یہ ثانی کعبہ ہے۔ (اور تعمیر کی) تاریخ جہان غیب (سے آنے والے جملے) سے ''بیت اللہ المعصوم'' [1] منکشف ہوئی۔ ''بیت اللہ المعصوم''

1۔ رَونَشا کا بیان ہے کہ بانی کا نام معصوم تھا۔ اگر ایسا ہے تو، یہاں مادہ تاریخ میں بالواسطہ یہی مذکور ہے۔ اسٹیپلٹن

کے انفرادی حروف کا عددی وصف مجموعی طور پر ۱۰۰۴ (ایک ہزار چار) برآمد ہوتا ہے جو بعینہٖ تعمیر مسجد کی ہجری تاریخ (مطابق ۱۵۹۶ء) ہے۔

اس مسجد کے داخلی دروازے میں سنگین سردل ہیں جو بلاشبہ پنڈوہ یا گور کی کسی ہندوانہ عمارت سے لائے گئے ہیں ۔ بہت ہی عمدگی کے ساتھ تراشے گئے یہ سردل وضع اور بناوٹ کے اعتبار سے بڑی حد تک کلکتہ میوزیم کے ایک سنگین سردل سے مشابہت رکھتے ہیں۔

وہ انتظامات جو عہد ماضی میں آب وضو کی ترسیل کیلئے کئے گئے تھے، وہ بھی قابل ذکر ہیں۔ احاطہ ہی میں موجود کنویں سے بالٹیوں کے ذریعے پانی کو نکالنے کے بعد اُسے کنواں کے عین شمال میں بنائے گئے ایک حوض کے اندر ڈال دیا جاتا، اِس حوض یا آبی مخزن کے شمالی حصے میں پیتل کی پانچ ٹونٹیاں لگی تھیں جن کے ذریعے نماز سے پہلے وضو کرنے والے لوگوں تک پانی کو پہنچایا جاتا تھا۔

صحن مسجد کے جنوب مغربی گوشے میں ایک محصور جگہ کے اندر (بیرونی جانب سے اوپر تک جانے والی ایک باقی ماندہ سنگین سیڑھی کے ساتھ) ایک عمارت ہے جس کے بارے میں کہتے ہیں کہ عہد ماضی میں وہاں ایک مدرسہ تھا، اور اِس کے علاوہ ممکنہ طور پر شمال مغربی گوشے میں ایک مماثل کمرہ بھی تھا۔ اِس عمارت کے پیچھے، مسجد کے مغرب میں اور بھی دیگر دو احاطے ہیں جو قبرستان کے طور پر استعمال کئے جاتے تھے۔ یہاں بحیثیت مجموعی تقریباً پچاس قبریں ہیں۔ کہتے ہیں کہ خانوادۂ بانی مسجد کے مذکر افراد کی قبریں شمال مغربی حصے میں موجود ہیں جبکہ خواتین کی قبریں جنوب مغربی حصے میں بنائی گئی ہیں۔

س: چالیسا پارہ میں پائے جانے والے کتبے: [1]

اولڈ مالدہ کے اِس حصے سے جو کٹرہ کے جنوب میں ایک میل سے بھی کم فاصلے پر واقع ہے، دو کتبے ریکارڈ کئے گئے ہیں۔ پہلا کتبہ روڈ کے جانبِ مغرب ماضی قریب میں ''رالی برادرس'' کے ''جیوٹ گڈاوَن'' میں شامل ایک چھوٹے سے احاطے کے شمالی حصے پر پڑا ہوا ملا تھا۔ رَونشا کے مطابق، اس مقبرہ کو 'درگاہ اولا دسلطان ابراہیم بلخی' کے نام

1۔ اولڈ مالدہ کا ایک دورہ کرنے کے بعد یہ اور اگلے سیکشن کا اضافہ کیا گیا ہے۔ کیونکہ ظاہری طور پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے اِس بات کی جانچ پڑتال نہیں کی تھی کہ کیا یہ کتبے تاہنوز وہاں موجود بھی ہیں یا نہیں؟ اصل میں دیکھا جائے تو اِس فصل کا اکثر حصہ دوبارہ تحریر کئے جانے کا بھی متقاضی تھا۔ (ایچ، ای، اسٹیپلٹن)

سے پکارتے ہیں اور اِس درگاہ میں گھڑسواروں کی خاکی مورتیاں نذر کی جاتی ہیں۔[1] اِس جگہ سے روڈ ہی کے ساتھ تھوڑا آگے بڑھتے ہوئے روڈ کے جانب مغرب ''درگاہ سید شاہ'' نامی ایک جگہ ہے جہاں پر موجود پانچ قبروں میں سے ایک قبر کے اوپر دوسرا کتبہ نصب کیا ہوا ہے۔

پہلا کتبہ ایک ایسی مسجد کی تاریخی روداد پیش کرتا ہے جس کی تعمیر مجلس راحت نامی ایک شخص نے اُسی سال کرائی تھی جس سال حسین شاہ نے مظفر شاہ کو قتل کرنے کے بعد بنگال کے تخت پر قبضہ جمایا تھا جبکہ دوسرے کتبے میں اس بات کا ریکارڈ ہے کہ ''بوامالتی'' نام کی ایک خاتون نے پینے کے پانی کا ایک سائبان تعمیر کرایا تھا۔امکانی طور پر یہ وہی خاتون ہیں جنھوں نے آستانہ حضرت اخی سراج الدین، گور کے نزدیک جہانیاں مسجد کی تعمیر کرائی تھی۔کتبے اور ان کے تراجم مندرجہ ذیل ہیں:

کتبہ نمبر۱:

قال النبی صلی الله علیه وسلم من بنی مسجدا لله بنی الله له قصرا مثله فی الجنة ☆ بنی فی عهد السلطان علاء الدنیا والدین ابوالمظفر حسین شاه السلطان خلد الله ملکه وسلطانه ☆ بنی هذا المسجد مجلس راحت فی العشر ذی القعدة من سنة تسع وتسعین و ثمانمأة۔

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس نے اللہ کیلئے ایک مسجد بنائی، اللہ اس کے لئے اسی کی طرح جنت میں ایک محل بنائے گا۔سلطان، علاء الدنیا والدین، ابوالمظفر سلطان حسین شاہ، اللہ اس کی مملکت اور قوت کو ہمیشہ قائم رکھے، کے عہد میں (اس کی تعمیر عمل میں آئی)۔مجلس راحت نے ۱۰رذی قعدہ ۸۹۹ھ (مطابق ۱۳راگست ۱۴۹۴ء) میں اس مسجد کی تعمیر کرائی۔

کتبہ نمبر۲:

قال الله تعالی من جآء بالحسنة فله عشر امثالها☆بنیت هذه السقایة فی عهد السلطان

1۔یہ بتانے کی شاید چنداں حاجت نہیں کہ یہ تو ہم پرست اور جاہل لوگوں کا طریقہ کار ہے، ورنہ مٹی سے بنائی گئی گھڑسوار مورتیوں کا بھلا کیا کام؟ اور پھر کسی بزرگ کی قبر پر ان کو پیش کرنے کا کیا مطلب؟ جب بلاضرورت عکس بندی ہی غیر مشروع ہے تو پھر کسی متبرک مقام پر نہ صرف عکس بندی بلکہ اہل ہنود کی طرح باقاعدہ مجسموں کا اہتمام کس طرح جواز کے زمرے میں آسکتا ہے؟ اللہ کریم یہ اور ان جیسی دیگر درآئی واہیات سے امت کو بچائے۔آمین (میزان)

سلطان بن السلطان ناصر الدنیا والدین ابو المظفر نصرتشاہ السلطان بن حسین شاہ السلطان خلد اللہ ملکہ وسلطانہ وبانیھا بوا مالتی فی سنۃ ثمان وثلثین وتسعمأۃ۔

ترجمہ: اللہ تعالی نے فرمایا: جوایک نیکی کرے تواس کیلیئے اس جیسی دس نیکیاں ہیں۔سلطان، سلطان ابن سلطان، ناصرالدنیاوالدین، ابوالمظفر سلطان نصرت شاہ ابن سلطان حسین شاہ، اللہ اس کی مملکت اورقوت کو ہمیشہ قائم رکھے، کے عہد میں ۹۳۸ھ (مطابق ۳۲-۱۵۳۱ء) میں اِس سقایہ کی تعمیر عمل میں آئی۔اوراس کو بنانے والی بوامالتی ہیں۔

ص: مزارشاہ لنکاپتی، پارہ شاہ مُنڈائی:

کٹرہ سے جنوب مغرب کی طرف آگے بڑھتے ہوئے نصف میل کی دوری پرسڑک کے جنوبی جانب ایک چھوٹے سے گاؤں بوچاماری کے دوسری طرف زائرکوایک ایسا بلند چبوترہ نظرآئے گا جہاں پرتین قبریں موجود ہیں۔مقامی لوگ یہ تونہیں بتاسکتے کہ جنوب اورمغرب میں بنی قبروں کے اندرکون مدفون ہیں؟ تاہم شمال مشرق میں واقع بڑی سی قبرشاہ ابراہیم شاہ چیتن لنکاپتی کامدفن ہے۔کوئی بھی شخص ایسانظرنہیں آتا جو اِس بزرگ کے بارے میں کچھ بتاسکے۔ویسے نام ''چیتن۔۔مطلب۔۔حق آگاہ'' ممکنہ طور پراس بات پرغماز ہے کہ یہ بزرگ پہلے ہندو تھے اورلنکا (سیلون) سے اِن کاکوئی نہ کوئی تعلق ضرورتھا۔

کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ باباجرآر درگاہ شریف، ضلع گونڈہ، متحدہ صوبہ کے مریدشاہ عبدالعزیز کے قبضے میں ان کے بارے میں ایک تاریخ محفوظ تھی۔مزارشاہ ابراہیم کے شمالی کنارے پرایک تختی کندہ شدہ ہے جس میں مخلوط شاخوں کے ساتھ شجرہ حیات نظرآتا ہے جبکہ دوسرے کنارے پرمندرجہ ذیل کتبہ موجود ہے۔حالانکہ شاہ ابراہیم کے ساتھ اِس کتبے کاکوئی واضح تعلق سمجھ میں نہیں آتا کیونکہ اِس کتبے میں کسی مسجد کے ایک دروازہ کی تعمیر کاحوالہ پیش کیا گیا ہے:

بنی ھذا الباب للمسجد الجامع فی عھد الملک العادل سلطان بن السلطان ناصر الدنیا والدین ابو المظفر نصرتشاہ السلطان بن حسین شاہ السلطان خلد اللہ ملکہ وسلطانہ وبانیہ خان معظم خلفخان بن مجلس قرا فی سنۃ خمس و ثلثین و تسعمأۃ۔

ترجمہ: انصاف ور بادشاہ، شاہ ابن شاہ، ناصرالدنیاوالدین، ابوالمظفر سلطان نصرت شاہ ابن سلطان حسین شاہ، اللہ اُس کی مملکت اورسلطنت کو ہمیشہ قائم رکھے، کے عہد میں ۹۳۵ھ (مطابق ۲۹-۱۵۲۸ء) کو جامع مسجد کے اِس دروازے کی تعمیر عمل میں آئی۔اوراس کا بانی خان معظم خلف خان ولد مجلس قرا ہے۔

بلوچ مین کاخیال ہے کہ مسجد کا بانی جس شخص کوقرار دیا گیا ہے وہ ایک ترکی کا باشندہ تھا۔کتبے کی ایک نقل رَونشا کی

’’گور‘‘ پلیٹ ۵٦، نمبر۲۲/ میں دیکھی جاسکتی ہے۔[1]

ط: پارہ-ڈھالا تالاب:

نیاسرائے (اولڈ مالدہ) ریلوے اسٹیشن کے مشرق میں تقریباً ایک میل کے فاصلے پر مذکور نام کا ایک تالاب موجود ہے۔ اِس تالاب کو’کورباڑی دیگھی‘ بھی کہتے ہیں۔ مندرجہ ذیل حکایت جو علاقہ میں زبان زد ہے، اول الذکر نام کی توجیہ پیش کرتی ہے۔’’پارہ-ڈھالا تالاب‘‘ کا مطلب ہوتا ہے: ایک ایسا تالاب جس میں پارہ[2] یا سیماب کو پھینک دیا جائے۔

کہتے ہیں کہ ایک بار ایک تاجر پارہ لے کر اولڈ مالدہ آیا جس کی قیمت ایک لاکھ روپے تھی مگر اُسے اپنے اجناس تجارت کا کوئی بھی خریدار نہ ملا چنانچہ وہ اِس جگہ کی ظاہری غربت کے بارے میں یہ کہتے ہوئے شکوہ کرنے لگا کہ عبث ہی میں مالدہ نے فراوانی دولت میں شہرت حاصل کر لی ہے، اُسے تو اپنے سیمابی کھیپ کی ترسیل کیلئے ایک بھی بندہ نظر نہیں آیا۔ یہ ساری باتیں ایک دھوبن، جو اس وقت تالاب کے کنارے اپنے کام میں مصروف تھی، کے لئے ناقابل برداشت تھیں۔ تاجر بھی وہیں بیٹھا شکوہ کناں تھا۔ سواُس دھوبن نے اپنے پیدائشی شہر کی نیک نامی اور ساکھ کو بچانے

1۔علی الترتیب حسین شاہ (۹۱۸ھ مطابق ۱۵۱۲ء) اور نصرت شاہ (۹۳۰ھ مطابق ۱۵۲۴ء) کے دو کتبے جو ۱۸۷۴ء میں باچاماری کے نزدیک ایک چھوٹے سے گاؤں مولناٹولی سے بلوچ مین کے ذریعے ریکارڈ کئے گئے تھے، وہ اولاً دریافت نہیں کئے جاسکے کیونکہ مٹی کی وہ کٹیا جس میں مسٹر ای، وی ویسٹ میکوٹ نے انہیں دریافت کیا تھا اُسے مہانندا بہالے گئی تھی۔ پھر آگے چل کر یہ دونوں کتبے ندی کنارے ایک چھوٹی سی احاطہ بندی کے پاس پڑے ہوئے ملے تھے سو فوری طور پر ہی انہیں کسی محفوظ مقام پر پہنچا دیا جانا چاہئے تھا۔ وہ پیر (صاحب) جن کی قبر کے اوپر عہد ماضی میں یہ کتبے نصب کئے گئے تھے، اُن کے نام کے حوالے سے لگتا ہے کہ مسٹر ویسٹ میکوٹ نے غلط اطلاع بہم پہنچائی تھی۔ مقامی افراد (ایک معمرترین شخص حاجی جمیعت سمیت، جو مٹی کی اصلی کٹیا کو بحال کر رہا ہے) کا ایقان ہے کہ پیر (صاحب) کا اصلی نام سراج الدین تھا۔ نہ کہ سلطان شہاب الدین، جیسا کہ مسٹر ویسٹ میکوٹ نے بیان کیا ہے۔ (اسٹیپلٹن)

2۔ پارہ ایک سیال دھات کا نام ہے جو چاندی کی طرح سفید، وزنی اور بے قرار یا متحرک ہوتی ہے۔ تنہا آنچ پر نہیں ٹھہرتی۔ اِسے سیماب بھی کہتے ہیں۔ اصلا یعنی لغوی اعتبار سے سنسکرت زبان کا لفظ ہے سو اردو میں سنسکرت ہی سے ماخوذ ہے۔ (میزان)

کیلئے تاجر کو پوری رقم ادا کر کے حکم دیا کہ وہ سارا پارہ تالاب میں پھینک دے۔[1] تاجر کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اُس نے زرنیلامی کے ایک حصے سے اولڈ مالدہ میں عظیم الشان پکی گھاٹ کی تعمیر کرائی تھی۔۔۔۔۔اولڈ مالدہ سے تالاب کا فاصلہ،قدیم زمانے میں رہی شہر کی حد درجہ وسعت اور پھیلاؤ پر ایک گواہ ہے۔

﴿یادگار نمبر۲﴾ مینار نیما سرائے

یہ مینار اولڈ مالدہ میں کالندری۔مہانندا سنگم کے نزدیک مہانندا ندی کے جانب مخالف واقع ہے اور کہتے ہیں کہ یہ نام اِس جگہ کے گور اور پنڈوہ کے بالکل بیچوں بیچ واقع ہونے کی وجہ سے وضع ہوا ہے۔مینار کا زیریں حصہ تاہنوز قائم

﴿تصویر نمبر۳۲﴾ مینار نیما سرائے
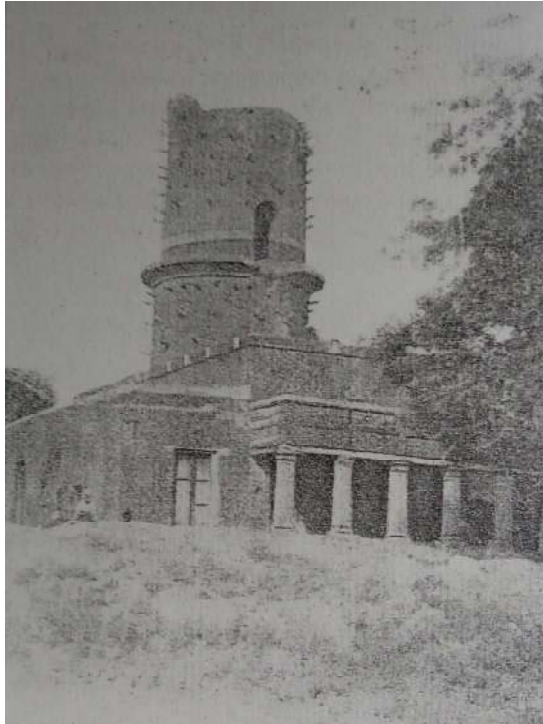
ہے اور اس کی باہری سطح پر ہاتھی دانت جیسی سنگین میخیں بنائی گئی ہیں۔رَونشا کے مطابق، یہ ایک انتہاہی مینار تھا جہاں پر

1۔مشرقی بنگال میں کسی حوض کے پانی کو صاف کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ حوض کے اندر بانس کے ایک ٹکرے کو پارہ شامل کر کے ڈال دیتے ہیں۔(ایچ،ای،اسٹیپلٹن)

خطرے یا حملے کے وقت شہر گوریا پنڈوہ کو بروقت متنبہ کرنے کیلئے آگ جلائی جاتی تھی جبکہ مسٹر ایف، سی، فانشا، بی، سی، ایس کا قیاس ہے کہ یہ ایک ہَن ٹنگ ٹاور تھا جسے اغلب طور پر چوکسی یا آگاہی مینار کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ ساخت اور بناوٹ کے اعتبار سے یہ مینار بڑی حد تک فتح پور سکری میں واقع اکبر کے ''ہرن مینار'' اور لاہور کے نزدیک شکوہ پور میں بنائے گئے 'مینار شکوہ' سے مشابہت رکھتا ہے۔ مینار کا بالائی حصہ تو گر چکا ہے تاہم نیچے کی دو منزلیں اب تک قائم ہیں جن کی اونچائی لگ بھگ ۵۵/فٹ ہے۔ بنیاد میں حلقہ بندی ۵۸/فٹ ۹/انچ ہے اور قطر ۱۸/فٹ ۹/انچ ہے۔ یہ مینار جسے اب محکمہ آثار قدیمہ کے تحت جگہ دیگر ایک 'محفوظ یادگار' قرار دے دیا گیا ہے، ایک ہشت پہلو بنیاد پر قائم ہے جن میں سے ہر فیس تقریباً ۱۸/فٹ وسیع ہے۔[1]

﴿یادگار نمبر۳﴾ انگریز آباد یا انگلش بازار

لگے ہاتھوں علی وجہ الاختصار انگلش بازار کا تذکرہ بھی بے محل نہ ہوگا جسے عمومی طور انگریز آباد کہتے ہیں اور جو ضلع کا ہیڈکوارٹر ہے۔

۱۶۸۵ء سے لیکر ۱۶۹۳ء تک ایسٹ انڈیا کمپنی کی جانب سے بعنوان ''Maulda and Englesavade'' روزناموں کی اشاعت (جو اس وقت لائبریری آف دی انڈیا آفس، لنڈن میں محفوظ ہے) اِس بات کا ثبوت ہے کہ سترہویں صدی عیسوی کی نصف اخیر کے دوران انگلش بازار میں کمپنی کا ایک باقاعدہ اسٹیشن تھا۔ اِس کی وجہ اغلب طور پر یہ تھی کہ یہ اونچی جگہ شہتوت کی کھیتی اور خام ریشم کی پیداوار کیلئے موزوں ترین تھی۔ لگ بھگ ۱۷۷۰ء میں کمپنی نے اولڈ مالدہ میں واقع اپنے کارخانہ کو بند کر دیا، اور اُس کی جگہ پر انگلش بازار میں ایک تجارتی ادارے کی تشکیل عمل میں آئی۔ موجودہ مجسٹریٹ کورٹ قدیم رہائشی عمارت ہے۔ کارخانے کی حفاظت ایک بلند چہار دیواری کی مدد سے کی جاتی تھی جس کے چاروں گوشوں میں برج بنائے گئے تھے اور ان برجوں میں ۸/توپیں نصب کی گئی تھیں[2] اِس حصار بند

1۔ ہرن مینار، فتح پور سکری کے ساتھ اِس مینار کی تعمیراتی یکسانیت کی وجہ سے ایسا لگتا ہے کہ نیا سرائے کا یہ مینار بھی دور اکبری ہی میں بنایا گیا تھا۔ محراب دار کوٹھریاں جو تاہنوز بنیاد کے ہر فیس میں موجود دیکھی جاسکتی ہیں، ممکنہ طور پر کالندری۔مہانندا سنگم کے نزدیک نقل وحمل اور اسباب تجارت کے نگراں کار اور منتظم سپاہیوں کے قیام کے ارادے سے بنائی گئی تھیں۔(ایچ، ای، اسٹیپلٹن)

2۔ ان میں سے دو توپیں اب تک سرکٹ ہاؤس کے سامنے پڑی ہوئی ہیں۔(اسٹیپلٹن)

عمارت کی تاریخ تعمیر اور اولین مکیں کا نام مندرجہ ذیل کتبہ میں مذکور ہے جو اب کمپاؤنڈ کے وسط میں ایک ستون پر نصب کیا ہوا ہے:

Erected
by
Thomas Henchman
Anno
1771
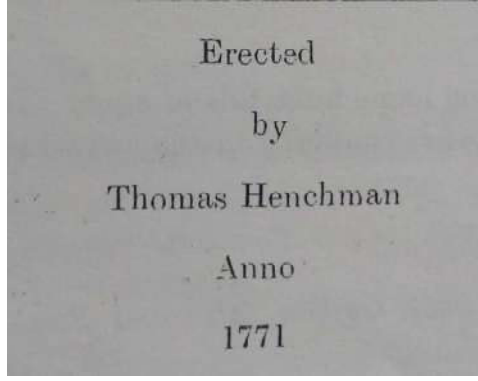
تعمیر شدہ، از: تھامس ہینچ مین۔ سن عیسوی: ۱۷۷۱

مقامی لوگ سرکاری اقامت گاہ کو'باڑی کوٹھی' کے نام سے پکارتے تھے۔ یہاں ریشم کے کپڑے بنے جاتے اور پھر انہیں سمندر پار دیگر جگہوں میں ایکسپورٹ کرنے کیلئے کلکتہ بھیج دیا جاتا۔ کپڑوں کو مختلف رنگوں میں بھی رنگا جاتا، اور کچھ کپڑوں پہ تو سونے چاندی کے دھاگوں سے بھی پھول بوٹے کاڑھے جاتے تھے۔ ۱۸۲۵ عیسوی میں مسٹر لیمبؔ کی رہائش گاہ (موجودہ سرکٹ ہاؤس) تعمیر کی گئی تھی اور میدانؔ میں دو تالاب کھودے گئے تھے۔ ۱۸۵۲ عیسوی میں فیکٹری کے جانب جنوب میدانؔ پر نیل کا ایک کارخانہ [1] بھی لگایا گیا تھا اور اُس سے متصل ہی افسروں کے قیام کے لئے مکانات بھی تعمیر کئے گئے تھے، مگر نیل کا یہ کاروبار بہت ہی جلد بند ہوگیا اور منیجر کی رہائش گاہ جو میدانؔ کے جنوب مشرقی گوشہ میں واقع تھی، ضلع اسکول میں بدل گئی۔ ۱۰؍جولائی ۱۸۵۸ء بروز سوموار اِس اسکول کا افتتاح عمل میں آیا، ۱۸۶۱ء میں بنایا گیا موجودہ ''چیریٹیبل ہاسپٹل''، منشی غلام حسین، صاحب ریاض السلاطین کے قدیمی مکان کی جگہ پر واقع ہے۔

۱۸۶۳ء میں ملکی زبان میں صدر اسکول کی شروعات ہوئی مگر ۱۹۰۱ء میں یہ اسکول، ضلع اسکول میں مدغم ہوگیا۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ ۱۸۳۴ء تک اِس ضلع کی عدالتی زبان فارسی تھی، اس کے بعد فارسی کی جگہ پر بنگلہ کو اختیار کیا گیا اور یہ بات بھی کہ ۱۸۱۳ء میں وسیع ترین اضلاع دیناجپور، راج شاہی اور پورنیہ کے درمیان خود ضلع مالدہ کی تشکیل عمل میں آئی۔ ضلع کا پہلا مجسٹریٹ مسٹر ولیم بریڈن تھا۔

1۔ نیل کے دیگر کارخانے ۱۷۸۵ء اور ۱۸۴۵ء میں انگلش بازار کے جنوب مغرب میں واقع سنگھا ٹالاؔؤ میں قائم کئے گئے تھے۔

نیدرلینڈی فیکٹری:

ایک روایت ایسی ہے کہ ڈاک بنگلہ کے جنوب میں تھوڑی ہی دوری پر جو عمارت ہے وہ پہلے ایک نیدرلینڈی فیکٹری تھی۔ یہاں کمپاؤنڈ میں کچھ پرانی قبریں ہیں جن کے اندر 'مسکارن ہاس' (Mascarenhas) نامی فیملی کے افراد دفنائے گئے تھے۔ (ان کے نام یہ ہیں):

"Maria, d.1813, aged 43; Ambrozio Jose, d.1799; aged 12; and Antonio Custodio,, d.1795, aged 30"

حسین شاہ کے زمانے کا کتبہ:

راقم السطور کے مکان کے قریب محلّہ چک انبیا کے امام باڑہ میں ایک کتبہ نصب کیا ہوا ہے جس میں ۹۱۳ ہجری (مطابق ۱۵۰۷ء) کی تاریخ درج ہے۔ بانی مسجد جس شخص کو قرار دیا گیا ہے وہ ممکنہ طور پر وہی ولی محمد، مجلس المجالس مجلس منصور ہے جس نے فیروز پور، گور میں چھوٹی سونا مسجد کی تعمیر کرائی ہے۔ کتبے کا متن اور ترجمہ مندرجہ ذیل ہے:

بـنـی هذا المسجد مجلس المجالس مجلس اخیار فی سنة ثلثة عشر وتسعمأة من الهجرة النبویة۔

ترجمہ: مجلس المجالس مجلس اخیار نے ۹۱۳ ہجرۂ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) میں اس مسجد کی تعمیر کرائی۔

فیروز پور مسجد میں نصب کیا گیا کتبہ:

انگلش بازار پولیس اسٹیشن کے شمال مغرب میں واقع ایک مسجد کی چہار دیواری پر ایک اور قدیم کتبہ نصب کیا ہوا ہے جس میں حسین شاہ کی حکومت کے دوران ایک مدرسہ کی تعمیر کا ریکارڈ ہے اور تاریخ یکم رمضان ۹۰۷ھ (مطابق ۱۵۰۲ء) درج ہے۔ یقینی طور پر یہ کتبہ گور کے کسی مدرسہ مثلاً درس باڑی یا بیل باڑی سے یہاں پر لایا گیا ہے۔ کتبے کا متن اور ترجمہ مندرجہ ذیل ہے:

قـال النبی صلی الله علیه وسلم اطلبوا العلم ولو بالصین ☆ امر ببناء هذه المدرسة الشریفة السـلـطـان الاعـظم الاكرم سید السادات منبع السعادات المجاهد فی سبیل الله المنان الفاتح لـكـامـرو وكـامـنته بعون الرحمن علاء الدنیا والدین ابو المظفر حسین شاه السلطان الحسینی خـلـد الله ملكه لتدریس علوم الدین وتعلیم احكام الیقین راجیا من الله الاجر العظیم وسائلا منه

رضوانه القدیم فی غرة شهر رمضان سنة سبع وتسعمأة۔

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: علم حاصل کرو، اگرچہ چین سے ہو☆ عزت واحترام والے بادشاہ، سرداروں کے سردار، خوش بختیوں کے سرچشمہ، بہت نعمتیں عطا کرنے والے خدا کی راہ کے مجاہد، بندوں پر دنیا وآخرت میں رحم کرنے والے کی مدد سے کامرواور کامنتہ کو فتح کرنے والے، علاء الدنیا والدین، ابوالمظفر سلطان حسین شاہ الحسینی، اللہ تعالیٰ اُس کی مملکت کو سدا قائم رکھے، نے علوم دینیہ کی تدریس اوراحکام یقینیہ کی تعلیم کے لئے بے پایاں جزائے خیراور سرمدی رضوان الٰہی کا امیدوار بن کر یکم ماہ رمضان ۹۰۷ھ (مطابق ۱۵۰۲ء) میں اِس بابرکت مدرسہ کی تعمیر حکم دیا۔

حیدرپور مسجد میں نصب کیا گیا کتبہ:

حیدرپور، انگلش بازار میونسپلٹی میں حالیہ دنوں تعمیر شدہ ایک مسجد کے دروازے کے اوپر حسین شاہ کے زمانے کا ایک تیسرا کتبہ بھی پایا گیا ہے۔ مقامی کہانی یہ ہے کہ یہ تختی آستانہ حضرت اخی سراج الدین المعروف پیران پیر کے نزدیک واقع میرادَل گاؤں میں ''امبیکا چرن داس'' نامی ایک شخص کے مکان کے گراؤنڈ پر پڑی ہوئی ملی تھی۔ وہاں سے حیدرپور کے دو مسلمان اُسے اٹھالائے اور مسجد پر نصب کردیا۔

ذیل میں پیش کیا گیا یہ کتبہ الفاظ وعبارات کے اعتبار سے نصرت شاہ ولد علاء الدین شاہ کے زمانے میں چالیسا پارہ میں نصب کئے گئے کتبے سے بڑی حد تک میل کھاتا ہے، جس سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ آخر الذکر مقام میں موجود ''سقایہ'' کے بانی نے ضرور اس کتبہ کو اِس کی اصلی جگہ پر دیکھا ہوگا اور پھر اس کی نقل اتاری ہوگی۔ یہ بات اتفاقی طور پر چالیسا پارہ والی بوامالتی کی شناخت کو اُس بی بی مالتی کے روپ میں بھی پیش کردیتی ہے جس نے روضہ اخی سراج الدین کے نزدیک واقع مسجد کی تعمیر کرائی تھی۔

قال اللہ تعالی من جاء بالحسنة فله عشر امثالها ☆ بنی هذه السقاية السلطان المعظم المكرم علاء الدنيا والدين ابو المظفر حسين شاه السلطان بن سيد اشرف الحسينی خلد الله ملكه وسلطانه فی سنة عشر وتسعمأة۔

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: جوایک نیکی لائے تو اس کے لئے اس جیسی دس نیکیاں ہیں۔ عزت و احترام والے بادشاہ، علاء الدنیا والدین، ابوالمظفر سلطان حسین شاہ بن سید اشرف الحسینی، اللہ اس کی مملکت اور

سلطنت کو ہمیشہ قائم رکھے، نے ۹۱۰ھ (مطابق ۵-۱۵۰۴ء) میں اس سقایہ کی تعمیر کرائی۔[1]

1۔ یہ کتبہ نیا ہے اوراس کی دریافت کیلئے میں مولوی نجم الحسین کا رہین منت ہوں۔ایک سقایہ کی تعمیر بجائے خود یہ رائے پیش کرتی ہے کہ یہ سقایہ یا تو کسی امام باڑہ میں تعمیر کیا گیا تھا یا پھر شیخ اخی سراج الدین ایک شیعہ تھے [نیچے نوٹ کو ملاحظہ فرمائیں۔مترجم] کیونکہ علی العموم اس طرح کے سقایہ شہادت امام حسین کی یاد میں تعمیر کئے جاتے ہیں جہاں سے راہگیروں کو پانی اور شربت پلایا جاتا ہے، خصوصاً ماہ محرم کے پہلے عشرہ میں، یعنی جس مہینے میں یہ حادثہ پیش آیا تھا۔

انگلش بازار سے چوتھائی میل کے فاصلے پر واقع فیروز پور کی مکتب مسجد میں ایک اور ٹوٹا ہوا کتبہ موجود ہے جس میں کسی ''**سلطان بن السلطان ناصر الدنیا و الدین**'' کی جانب سے ایک دروازے کی تعمیر کا ریکارڈ ہے۔ٹاکس کو دیکھ کر لگتا ہے کہ یہ کتبہ حسینی بادشاہ نصرت شاہ کے زمانے کا ہے، اور اگرچہ کتبے کا آخری حصہ ٹوٹ چکا ہے مگر پھر بھی آخری دو لفظ کسی قدر تیقن ہی کے ساتھ ''**ثلثة و تسع مأة**'' نظر آتے ہیں۔اس طور پر [؟]۹۳ ہجری کی تاریخ برآمد ہوتی ہے جو اس خیال کو یقینی بنا دیتی ہے کہ کتبہ حسینی شاہی سلسلہ کے نصرت شاہ ہی سے تعلق رکھتا ہے۔(اسٹیپلٹن)

نوٹ: سقایہ پینے پلانے کے برتن کو بھی کہتے ہیں اور جگہ کو بھی، کوئی شک نہیں کہ مذکورہ کتبات میں یہ لفظ جگہ یا سائبان کے معنی میں استعمال ہوا ہے، تاہم اس سے یہ معنی اخذ کر لینا کہ لفظ سقایہ اہل تشیع حضرات کی ''سبیل'' ہی کیلئے مختص ہے، قطعی طور پر نا قابل قبول اور بعید از فہم ہے۔ بلکہ لغوی اعتبار سے تو سقایہ ہر اُس سائبان یا مشربہ کو کہتے ہیں جہاں بھی پانی وغیرہ پینے پلانے کا انتظام ہو۔ دوسری بات یہ ہے کہ ماہ محرم الحرام کے پہلے عشرے میں سبیلیں لگوانا صرف اہل تشیع حضرات ہی کا خاصہ نہیں ہے بلکہ ان گنت اہل سنت حضرات بھی اس عمل کی انجام دہی میں نظر آجاتے ہیں، سو اگر تھوڑی دیر کیلئے ''سقایہ'' کو ماہ محرم کی سبیل کے معنی میں خاص بھی کر لیا جائے تب بھی اِسے شیعیت کا لازمہ قرار دینا روا نہیں۔ تیسری بات یہ کہ قدیم زمانہ میں آج کی طرح آب رسانی کا نہ تو نظم تھا اور نہ ہی سہولت تھی، مسافروں اور راہگیروں کیلئے بروقت پانی کا حصول ایک بڑا مسئلہ بن جاتا تھا۔سو مخیر حضرات سڑکوں کے کنارے یا سرائے وغیرہ کے آس پاس کنواں کھدوا دیا کرتے یا پھر کوئی آبی مخزن بنا کر اُس سے افادہ یا اُس کی حفاظت کیلئے وہاں ایک سائبان تعمیر کر دیا کرتے تھے۔راقم سطور کا گمان غالب یہ ہے کہ کتبات میں ذکر شدہ ''سقایہ'' بھی اسی قسم کا کوئی رفاہی اقدام تھا نہ کہ خاص محرم کی سبیلیں۔ چوتھی بات اور سب سے اہم بات یہ کہ، اگر حضرت اخی سراج الدین علیہ الرحمہ کے آستانہ کے نزدیک واقع کسی گاؤں سے کوئی ایسا کتبہ برآمد ہو گیا جس میں ''آپ کے بقول'' شیعیت کا کوئی

انگلش بازار کے دیگر آثار و مساجد

کتی ٹولہ مسجد:

یہ مسجد۔۔۔علی منزل، کتی ٹولہ کے بالکل نزدیک واقع ہے، اور اس کی تعمیر ۱۲۵۷ ہجری (مطابق ۱۸۴۱ عیسوی) میں شعورہ نامی ایک بیوہ عورت نے کرائی تھی۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس مسجد کے کتبے کو شیخ محمد عاشوری معروف بہ شیخ علیم الدین ولد نظام الدین نے تحریر کیا تھا۔ کتبہ مندرجہ ذیل ہے:

بنای مسجد هذا شعورا نیک نام .... سروش غیب گفته که سنه بالا راحت
در سنه یکهزار و دو صد و پنجاه وهفت اتمام .. آنچه تحریر کرده قلم خوشخرام

ترجمہ: نیک نام شعورا نے ۱۲۵۷ھ میں اس مسجد کی تعمیر کرائی تو روح الامین نے کہا "سنہ بالا راحت" (بڑے تسکین کا سال)۔ اور خوش گام قلم نے اِسے تحریر کیا ہے۔

چک قربان علی میں موجود قبریں اور پھوندن مسجد:

میر مظفر علی ولد صلاح الدین چک قربان علی کا ایک باشندہ تھا۔ ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۸۶۹ء میں اس نے وفات پائی اور اس کی قبر پھوندن مسجد، جس میں خود کئی ساری قبریں ہیں، کے جنوب مغربی گوشے میں ۱۰۰ ارگز کی دوری پر واقع ایک چبوترہ کے جنوب میں موجود ہے۔ جو قبر چبوترہ کے وسط میں سیاہ سنگ مرمر والے ایک مزین تابوت کے ساتھ بنی ہے، وہ اُس میر قربان علی کے بھائی میر سلطان علی کی ہے جس کے نام پر اِس جگہ کا نام رکھا گیا ہے۔ اول الذکر کی شکستہ قبر پھوندن مسجد کے شمال مغرب میں ۱۰۰ ارگز کی دوری پر موجود ہے۔

لگے ہاتھوں بتاتے چلیں کہ مسجد کے تین گنبد ہیں اور اس کی تعمیر اسی مضافات شہر کی رہنے والی پھوندن نامی ایک خاتون نے ۱۲۰۸ھ مطابق ۱۷۹۴ء میں کرائی تھی۔ مندرجہ ذیل کتبہ مسجد پر نصب شدہ ہے اور کہتے ہیں کہ اِس کتبے کو

وصف موجود ہے تو اس سے یہ کہاں لازم آجاتا ہے کہ حضرت آئینہ ہند شیعی نظریات کے حامل تھے؟ تحقیق و تلاش کا وہ کونسا فنی ضابطہ ہے جس کی بنیاد پر آپ نے حضرت اخی سراج کو ممکنہ طور پر ایک شیعہ قرار دے دیا؟ کیا آپ کے مصنفات کے اندر یا آپ کے شیوخ واساتذہ یا آپ کے خلفاء و تلامذہ کی حیات و خدمات سے کسی بھی طور پر اس بات کا ثبوت بہم پہنچتا ہے کہ شیعیت کو اختیار کرنا تو بہت دور کی بات، آپ اُس سے ذرا متاثر بھی تھے؟ بخدا نہیں، تو پھر بلاکسی وجہ وثبوت کے آپ پر شیعیت کی الزام تراشی کہاں کی دیانت داری ہے؟ (میزان)

صاحب ریاض السلاطین منشی غلام حسین نے تحریر کیا تھا:

بنای مسجد پھوندن خوش انجام۔۔۔۔بدور شاہ عالم یافت تمام

سروش غیب گفتش سال تاریخ۔۔۔۔ برد کفر شد ایں دار اسلام(۱۲۰۸ھ)

ترجمہ: پھوندن نے مسجد کی تعمیر کرائی۔۔۔اس کا خاتمہ بالخیر ہو۔۔۔اور شاہ عالم کے دور میں یہ کام انجام پذیر ہوا۔ غیبی فرشتہ نے اِس کی تاریخ تعمیر پکار کر بتائی ''برد کفر شد ایں دار اسلام ''۔(کفر کافور ہوااور یہ دار الاسلام بن گیا)۔ترسیم وقت کے حروف جمع کرنے سے ۱۲۰۸ھ کی تاریخ برآمد ہوتی ہے۔

خیر اللہ مسجد:

پھوندن مسجد کے قریب ایک اور مسجد ہے جس کی تعمیر ۱۲۵۸ھ مطابق ۱۸۴۲ء میں عتیق اللہ کے بھائی منشی خیر اللہ نے کرائی تھی۔منشی غلام حسین کے ایک شاگرد منشی عبدالکریم نے اس مسجد کیلئے کتبہ تحریر کیا تھا جو مندرجہ ذیل ہے:

منشی خیر اللہ مرد صاحب دیں۔۔۔۔ساخت مسجد ز روی صدق و یقین

ہاتف غیب گفت تاریخش۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔حبذا واہ واہ والتحسین

ترجمہ: مرد صاحب دیں، شیخ خیر اللہ نے پورے اخلاص و یقین کے ساتھ اِس مسجد کی تعمیر کرائی تو ہاتف غیب نے اِس کے ظہور کا وقت پکار کر بتایا ''حبذا واہ واہ والتحسین ''(سبحان اللہ، ماشاءاللہ، شاباش)۔

مدفن منشی غلام حسین:

پھوندن مسجد کے مشرق میں بیس گز کی دوری پر ریاض السلاطین، جس کا حوالہ زیر نظر کاوش میں بکثرت پیش کیا گیا ہے، کے مصنف منشی غلام حسین سلیم زید پوری کی قبر موجود ہے۔آپ نے انگلش بازار میں واقع آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی کی ریشم فیکٹری کے منیجر مسٹر جارج اُڈنی کی درخواست پر ۸۸-۱۷۸۷ء میں بنگال کی یہ تاریخ مرتب فرمائی، اور وہ تاریخ ہجری جس میں انہوں نے اس کام کو مکمل کیا یعنی ۱۲۰۲ھ کی تاریخ، عنوان کتاب کے عربی حروف کی عددی خاصیات کو جمع کرنے سے برآمد ہو جاتی ہے۔

مسلم سلاطینِ بنگال کے عہد ہی سے چلی آ رہی عمارتوں میں سے متعدد عمارتوں میں جو کتبات پائے گئے، ان کی جانچ پڑتال میں منشی کو کافی زیادہ دقتیں اٹھانی پڑیں۔علاوہ ازیں، انہوں نے تاریخ کے ایسے متعدد اور متفرق ماخذ سے بھی استفادہ کیا جواب ناپید ہیں۔۔۔۔وہ زید پور، اودھ کے رہنے والے تھے اور جیسا کہ ماقبل میں بتایا جا چکا ہے کہ

روایت کے مطابق اِن دنوں 'چیریٹیبل ہاسپٹل' جس جگہ پر قائم ہے اُسی جگہ پر پہلے ان کا مکان ہوا کرتا تھا۔ان کی وفات کا مادۂ تاریخ جسے ان کے شاگرد منشی عبدالکریم نے ترتیب دیا ہے 'منشی ز عالم رفتہ '' ہے۔یعنی منشی دنیا سے رخصت ہوئے، (۱۲۳۳ھ: مطابق ۱۸۱۸ء)۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ منشی غلام حسین کی تحریر کے چند آخری جملے یہ دکھانے کیلئے نقل کردیئے جائیں کہ اُس وقت کی حکومت بنگال کے ذمہ داروں کے حق میں ان کی رائے کیسی تھی اوران کا اپنا فلسفہ کس قدر وسیع تھا:

''انگریزی: عیسائیوں کے درمیان حکمت ودانائی کی مانگ پٹی کے ساتھ مرصع اور کشادہ دلی واخلاق حمیدہ کے لباس فاخرہ کے ساتھ مزین ہے۔عزم واستقلال، جنگ میں پھرتی، زمانہ نشاط میں تیزی، حکومت میں انصاف اور مظلوموں کی دادرسی کے اعتبار سے یہ لوگ اپنی مثال آپ ہیں، اوران لوگوں کی راست گوئی اتنی محکم ہے کہ یہ لوگ کبھی بھی وعدہ خلافی نہیں کرتے، چاہے اس کے لئے انہیں اپنی جان ہی کیوں نہ گنوانی پڑ جائے۔اپنے سماج میں یہ لوگ دروغ گو شخص کو قطعاً قبول نہیں کرتے۔ یہ لوگ دین دار، باوفا، رحم دل اور عزت دار ہوتے ہیں۔ان لوگوں نے نہ تو مکروفریب کا کوئی حرف سیکھا ہے اور نہ ہی بدی وبدکاری کا کوئی سبق پڑھا ہے، اور عقائد ونظریات کی مغائرت کے باوجود یہ لوگ مذہب اسلام، اس کے قوانین اوراس کی نشر واشاعت میں کبھی بھی دخل اندازی نہیں کرتے''۔[1]

گفتگوئے کفر ودین آخر بیکجا میکشد۔۔خواب یک خواب است باشد مختلف تعبیرها

ترجمہ: کفراور دین کا سارا جھگڑا ایک ہی منزل تک لے جاتا ہے، (اور) تعبیر اگرچہ الگ الگ ہے تاہم خواب تو ایک ہی ہے۔

1۔شاعرمشرق، ڈاکٹر اقبال مرحوم نے فرمایا تھا: مدہ آں غم کہ شایان دلے نیست ۔۔۔مہرباں! وہ غم تو نہ دے جو دل کے قابل نہیں ہے۔منشی غلام حسین کے تاریخی ورک کے تئیں صد ہا ستائش کے ساتھ ہم یہی بات اُن کے زیرنظر تبصرہ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہنا چاہتے ہیں۔کوئی شک نہیں کہ حکمت ودانائی، تحقیق وتلاش اوراختراعات وایجادات کے حوالے سے نئی دنیا میں جو تاریخ ساز سربلندیاں مغرب نے حاصل کی ہیں وہ بہرصورت ناقابل انکار ہے تاہم جن قومی، اخلاقی، معاشرتی اور مذہبی اوصاف کے ساتھ منشی غلام حسین نے اہل مغرب کو متصف قرار دیا ہے، ہم بڑی حد تک اُس سے اِختلاف کرتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ حکومت بنگال کے جن برطانوی اہل کاروں سے منشی کا سابقہ تھا، وہ واقع میں بہت شریف النفس، انصاف پسند، دیندار اور باوفا رہے ہوں لیکن یہ باتیں کلی طور پر قومی حیثیت سے ان پر

صادق نہیں آتیں۔اگر تحقیقی طور پر ان کے سیاہ احوال، جابرانہ کردار اور ہلاکت خیز کارناموں کا صرف برطانوی ہند ہی کے پس منظر میں تجزیہ کرنے لگیں تو کالے کرتوتوں کا ایک دفتر بن جائے گا لیکن چونکہ یہ محل تفصیلی تجزیہ کا متحمل نہیں ہے اس لئے فی الحال ہم صرف نازش علم وفن، قائد انقلاب، اسیر انڈمان حضرت علامہ فضل حق خیرآبادی کی ''الثـــورة الهندية'' سے ایک اقتباس پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں جس سے اہل مغرب بالخصوص منشی غلام حسین کے ممدوحین کی قلعی کھل جاتی ہے۔علامہ صاحب لکھتے ہیں:

''وہ (یعنی علامہ) بڑی مشکلات میں مبتلا اور ترش رو ظالموں کے ہاتھوں میں گرفتار ہے، ان ظالموں نے اسے اچھے لباس سے معرا کر کے غم وحزن کی وادیوں اور ایسے تنگ وتاریک قید خانوں میں ڈال دیا ہے جو سیاہ فتنوں کے مرکز ہیں، وہ محبوس وحزیں سخت دل، اچکے اور ظالم افراد پر نظر کرتے ہوئے اپنی رہائی سے مایوس ہے مگر اللہ کی رحمت سے ناامید نہیں ہے۔ وہ ایک سیدھا سادھا، نرم خو اور مریض وکمزور ہوتے ہوئے شریر و بدفطرت کی قید میں ہے اور ظالم و جابر، بدخلق و بدکردار کے مظالم سے حیران و پریشان ہے۔ وہ آفت رسیدہ ایسے مصائب میں مبتلا ہے جن کی سختیوں تک قیاس کرنے والے کا قیاس نہیں پہنچ سکتا اور ایسا مضطر ومحتاج ہے جو سخت عذاب واحتباس میں گرفتار ہو چکا ہے۔ وہ سفید رو، سیاہ دل، متلون مزاج، ترش رو، کنجی آنکھ، گندم گوں بال والوں کی قید میں آچکا ہے۔ (چند جملوں کے بعد) اُسے قید کر کے ہر ممکن مصیبت پہنچائی گئی ہے۔ اُس کا قصور صرف ایمان اور اِسلام پر مضبوطی سے قائم رہنا اور علماء اعلام میں شمار ہونا ہے۔ اِس سے اِن ظالموں کا مقصد نشانِ درس وتدریس کو مٹانا اور علم کے جھنڈے کو نیچے گرانا ہے۔ وہ صفحات ِقرطاس سے بھی نام ونشان مٹانا چاہتے ہیں۔ (چند جملوں کے بعد) ان کے دل میں اور بھی بہت سے مفاسد چھپے ہوئے تھے، مثلاً مسلمانوں کو ختنہ کرانے سے روکنا، شریف و پردہ نشیں خواتین کا پردہ ختم کرانا نیز دوسرے احکام دینِ مبین کو مٹانا، وغیرہ۔ (کچھ صفحات کے بعد) جب کوئی اِن (قیدیوں) میں سے مر جاتا ہے تو نجس وناپاک خاکروب جو درحقیقت شیطان خناس یا دیو ہوتا ہے، اس کی ٹانگ پکڑ کر کھینچتا ہوا غسل وکفن کے بغیر اس کے کپڑے اتار کر ریگ کے تودے میں دبا دیتا ہے، نہ اس کی قبر کھودی جاتی ہے، نہ نماز جنازہ پڑھی جاتی ہے۔ (باغی ہندوستان، از علامہ۔ ترجمہ: عبدالشاہد خان شیروانی)

جناب عالی! یہ تو محض 'مشتے نمونہ از خروارے' ہے، ورنہ تفصیلی خاکہ تو اتنا دل خراش اور دردناک ہے کہ روح کانپ اٹھتی ہے۔اب اِن کربناک حالات اور مناظر کو سامنے رکھتے ہوئے منشی غلام حسین کے زیرِ نظر تبصرہ کے تعلق سے اس

سنگین ستون پر نصب شدہ کتبہ:

''پھوندن مسجد'' کے بالکل نزدیک، جانب مشرق، سید امام علی نامی زید پور کے ایک اور باشندے جس نے ۱۹رصفر المظفر ۱۲۰۹ھ ہجری (مطابق ۹۴-۱۷۹۳ء عیسوی) میں وفات پائی تھی، کی قبر سے متصل ایک سنگین ستون پر ایک کتبہ نصب شدہ دیکھا جاسکتا ہے۔ کتبے کے الفاظ مندرجہ ذیل ہیں:

سید امام علی از زیدپور آمد در اینجا شده عمرش شد داخل فی الجنت سال وفات نوزدهم روز ماه صفر ۱۲۰۹۔

ترجمہ: سید امام علی زید پور سے آئے اور اپنی زندگی یہاں پر گزاری۔ وہ خلد باشی ہوجائیں۔ (ان کا سال وفات ''داخل فی الجنة'' والے جملے سے برآمد ہوجاتا ہے) انہوں نے ۱۹رصفر ۱۲۰۹ھ میں وفات پائی۔

مقبرہ ترکانی شہید یا گھوڑا شہید:

سرکٹ ہاؤس، انگلش بازار کے جانبِ مخالف ''گروٹریننگ اسکول'' کے سامنے ایک قبر ہے جس کے بارے میں مقامی لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ ایک ترک شخص کی قبر ہے جس نے شہادت پائی تھی۔ اِسی قبر کے نزدیک ایک اور قبر ہے جسے گھوڑا پیر کہتے ہیں۔ ترکانی شہید یا گھوڑا پیر کے نام سے معروف اِسی نوعیت کی اور بھی دو قبریں ہیں، ایک انگلش بازار سے ایک میل دور راج محل روڈ کے موڑ پر رَتھ باڑی میں ہے جبکہ دوسری قبر باغ باڑی میں ہے۔ اِن دنوں لوگ ان قبروں پہ دعا درود وغیرہ کرتے ہیں اور مٹی سے تیار کردہ گھوڑے بطور نذر پیش کرتے ہیں۔ (اللہ ایسی واہیات سے بچائے: مترجم) مقامی روایت یہ ہے کہ یہ کچھ ترک سپاہیوں کی قبریں ہیں جو یہاں محمد بختیار کے ساتھ آئے تھے اور اُن دنوں لڑی گئی ایک جنگ میں شہادتیں پائی تھیں۔ یہ بات ناممکن نہیں ہے، کیونکہ ایسا تو سوچا بھی نہیں جاسکتا کہ لکھن سین کے متعلقین نے بغیر کسی جدوجہد کے محمد بختیار کے سامنے ہتھیار ڈال دیا تھا۔

﴿یادگار نمبر۴﴾ باغ باڑی یا بلاّل باڑی

باغ باڑی غالبًا گور کے قدیم ترین حصوں میں سے ایک حصہ ہے اور اس کا ربع دائرہ اُس کے تقریبًا ایک ایک میل طویل کناروں کے ساتھ گراں بار طریقے پر پشتہ بند ہے۔ یہ باغ باڑی انگلش بازار کے شمال مغرب میں دو یا تین

کے علاوہ اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ، ع: نشیمن سے دھواں اٹھتا ہے تم کہتے ہو ساون ہے؟ نوٹ! تبصرہ کے نیچے درج شعر کا محاکمہ ہم ارباب دانش پر چھوڑتے ہیں۔ (میزان)

میل دور راج محل کی طرف جانے والی شاہراہ کے دائیں بازو پر واقع ہے۔احاطہ بندی، مشرق تا مغرب کی بنسبت شمال تا جنوب زیادہ وسیع ہے اور اِس کی تشکیل چوٹی میں ۵۰ یا ۶۰/فٹ چوڑی، بنیاد میں ۱۵۰/فٹ چوڑی اور ۲۰/فٹ اونچی ایک پشتہ بندی کے ذریعے عمل میں آئی ہے۔ یہ احاطہ شمال جنوب سمتوں میں پھیلی ہوئی ایک فصیل کے ذریعے دو نصف حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے، اور فصیل کے جانب مغرب ایک کشادہ خندق بھی ہے۔ کہتے ہیں کہ نصف مشرقی حصہ (جس کے اندر شمال جنوب سمتوں میں بہنے والا ''تمنا دیگھی'' [1] نامی ایک وسیع ترین تالاب بھی موجود ہے) بلاّل سینؔ کے محل پر مشتمل تھا جبکہ نصف مغربی حصے میں قلعے کی تعمیر کی گئی تھی۔ جنوبی باؤنڈری کی تشکیل لکھنوَر سے دیوکوٹ تک جانے والی اونچی اٹھی ہوئی سڑک کے سیکشن کے ذریعے عمل میں آ گئی تھی ۔۔۔ اِس روڈ کے تئیں مسلم مؤرخین کی رائے یہ ہے کہ اِس کو بنانے کی شروعات محمد بختیار نے کی تھی اور تیرہویں صدی عیسوی کے ربع اول میں غیاث الدین عیاض نے اِسے انجام تک پہنچایا تھا۔۔۔۔۔ جبکہ ۷۵/فٹ چوڑی خندق، جو سڑک کے شمالی بازو کے ساتھ بہتی ہے اور مغرب، شمال اور مشرق میں حصار کا احاطہ کرتی ہے، کو دیکھ کر لگتا ہے کہ وہ شاید کالندری کی طرح (چھچھلی کے جانب جنوب) سوناٹولہ میں واقع آخرالذکر ندی کی ایک وسیع ترین کاٹ کے جنوبی کنارے سے لیکر انگلش بازار کے موجودہ محل وقوع کے نزدیک مہانندا تک آبی آمدورفت کا ایک ذریعہ رہ چکی ہے۔

مقامی روایت یہ ہے کہ راج محل کی طرف سے محمد بختیار کی پیش قدمی کی وجہ سے 'چھچھلی' سے اول مرتبہ فرار کے بعد لکھن سینؔ نے مشرقی بنگال کی طرف نکل بھاگنے کے لئے مہانندا تک اِسی (اونچی) سڑک کا استعمال کیا تھا۔۔۔ اب یہ روایت اگر صحیح ہے تو یہ بجائے خود اس بات پر غماز ہے کہ مغربی بنگال سے دیوکوٹ تک جانے والی اِس اونچی سڑک کی تعمیر دراصل سینؔ یا پھر ان کے پیش رو پالؔ راجاؤں نے کرائی تھی اور مسلم بادشاہوں نے محض اُس کی اصلاح اور بہتری کا کام کرایا تھا۔ باغ باڑی کے شمال میں لگ بھگ ایک میل کے فاصلے پر کالندری ندی کے کنارے آراپورؔ (معروف بہ: امیر پور۔۔۔ کہتے ہیں کہ اس کا اصلی نام ارہت پور ہے) نامی ایک گاؤں کا وجود ہمارے ذہن کو مزید پیچھے بدھسٹ وقتوں کی طرف لے جاتا ہے۔۔۔ آراپور گاؤں سے کوتوالیؔ کا قریب ہونا اس بات کی جانب اشارہ کرتا ہے کہ امکانی طور پر جنوب کی طرف پیش قدمی کرنے سے پہلے مسلمانوں نے گور کے بالکل شمالی سرے میں ساگر دیگھی کے آس

1۔ کہتے ہیں کہ یہ نام 'تَرپَن دیگھی' کی ایک بگڑی ہوئی شکل ہے یعنی ایک ایسا تالاب جس میں آباواجداد کی روحوں کو خوش کرنے کے لئے نذریں پیش کی جاتی ہیں۔ (ایچ، ای، اسٹیپلٹن)

پاس ہی قیام کیا تھا اور پھر ناصر الدین محمود کے زمانے میں حصار اریا میں منتقل ہوئے تھے۔

﴿یادگار نمبر۵﴾ چھچلی

یہ جگہ انگلش بازار کے شمال مغرب میں آٹھ میل کے فاصلے پر گنگارامپور کی دوسری طرف واقع ہے اور موجودہ کالندری ندی اور اس کی سابق گزرگاہ، جو اب سوناٹولہ کی طرف مڑ گئی ہے اور جس کے کنارے خشک ہو چکے ہیں، کے درمیان خطے کے شمال مغربی زاویہ پر محیط ہے۔ یہ علاقہ جنوبی اور مشرقی حصوں میں پانی سے بھری ہوئی ایک گہری خندق کے ذریعے محفوظ کیا گیا تھا۔ بوچانن ہیملٹن نے اپنے وقت کی ایک معروف روایت اس طرح بیان کی ہے کہ چھچلی بنگال کے ہندو راجہ 'آدیسور' جس نے قنوج سے برہمنوں کو یہاں لاکر آباد کیا تھا، کی راجدھانی تھی۔ یہ جگہ اینٹوں اور مٹی کے ایسے ٹوٹے ہوئے برتنوں سے بھری ہوئی ہے جن کی دونوں جوانب آسمانی رنگ سے صیقل کی گئی ہیں جو بلاشبہ ایک طویل المدت حرفت کے دوران صنعتی طور پر بام عروج تک پہنچ گئے تھے۔ اِس جگہ کی پوزیشن اور اِس حقیقت کے مدنظر کہ غیاث الدین عیاض نے ۱۲۲۰ھ میں کالندری ندی کے جانبِ مخالف شمال مغرب میں تقریباً تین میل کی دوری پر واقع بسان کوٹ (مورچہ بشنوپور) میں ایک چھوٹا سا قلعہ تعمیر کیا تھا، یہ بات بالکل ممکن ہے کہ مسلمانوں کے دورِ حکومت میں بھی چھچلی کو ایک اہم ترین مرکز تسلیم کیا جاتا تھا۔

کتبہ مسعود شاہ جانی:

فرینکلن نے خطے کے نام کی توضیح اس طرح سے کی ہے کہ یہ جگہ شمال مغرب میں مکمل طور پر گور کی ''چھچلی گھاٹ'' یعنی بعید ترین گھاٹ یا باؤنڈری میں واقع تھی۔ جنرل کیوننگھم نے یہاں (ممکنہ طور پر حضرت شاہ جلال کے چلہ خانوں میں سے ایک کے اندر) ایک اہم ترین کتبہ دریافت کیا تھا جس میں ۶۴۷ھ (مطابق ۱۲۴۹ء) کی تاریخ درج ہے۔ کتبہ ۷رفٹ ساڑھے ۷رانچ لمبا اور ۱رفٹ ڈھائی انچ چوڑا ہے اور ایک باقی ماندہ ٹوٹی پھوٹی عمارت، جو پانی سے بھری ہوئی خندق اور کالندری ندی کی سابق گزرگاہ کے درمیان دونوں سے سوسوگز دور سابق شہر کے جنوب مغربی حصے میں واقع ہے، کے اندر اوندھے منہ پڑا ہوا ہے۔ کتبے[1] کا متن کچھ اس طرح ہے:

امر ببناء هذه البقعة المباركة السلطان المعظم شمس الدنيا والدين ابو المظفر ايلتمش

1۔ یہ کتبہ 'گنگارامپور کتبہ' کے نام سے معروف ہے، کیونکہ جنرل کیوننگھم نے بدقسمتی سے یہ تحریر کردیا ہے (رپورٹ، ص:۴۵) کہ انہوں نے یہ کتبہ شمال مشرق میں ایک میل کے فاصلے پر واقع گنگارامپور سے دریافت کیا تھا۔ اسٹیپلٹن

السلطان یمین خلیفة الله ناصر امیر المؤمنین انار الله برهانه وثقل بالحسنی میزانه وجددت العمارة فی ایام دولة السلطان الاعظم ناصر الدنیا والدین ابو المظفر محمود شاه السلطان ناصر امیر المؤمنین خلد الله ملکه وسلطانه فی نوبة ایالت الملک المعظم جلال الحق والدین ملک ملوک الشرق مسعود شاه جانی برهان امیر المؤمنین خلد الله دولته فی غرة محرم سنة سبع و اربعین و ستمأة۔

ترجمہ: عزت واحترام والے بادشاہ، خلیفہ الٰہی کے دست راست، امیر المؤمنین کے مدگار، دین ودنیا کے آفتاب، ابوالمظفر سلطان ایلتمش، اللہ اس کے برہان کو منور فرمائے اوراس کے میزان کو حسنات کے ذریعے وزنی بنادے، نے اس بابرکت عمارت کی تعمیر کا حکم دیا۔ امیر المؤمنین کے مددگار، عظمت والے بادشاہ، ناصر الدنیا والدین، ابوالمظفر سلطان محمود شاہ، اللہ اس کی مملکت اور سلطنت کو سدا آباد رکھے، کے عہد میں ۔۔۔ بلند مرتبت فرماں روا، امیر المؤمنین کے برہان، مشرق کے بادشاہوں کے بادشاہ، جلال الحق والدین مسعود شاہ جانی، اللہ اس کی امارت کو ہمیشہ قائم رکھے، کی گورنری کے دوران یکم محرم ۶۴۷ھ میں اس عمارت کی مرمت کی گئی۔

دہلی کے غلام بادشاہ ناصر الدین (۶۴۴ھ ۔۔۔ ۶۶۴ھ، مطابق ۱۲۴۶ء ۔۔۔ ۱۲۶۵ء) کی فرماں روائی کے ماتحت بنگال کے اِس گورنر کی علی العموم تسلیم شدہ تاریخ کے بارے میں، مذکورہ بالا تاریخ کی وجہ سے، شکوک وشبہات سر اٹھانے لگتے ہیں۔ حاکمانِ بنگال کے حوالے سے شائع شدہ تازہ ترین فہرست میں بھی ملک جانؔی کی طرف فقط ایک ہی سال (۶۵۶ھ ۔۔ ۶۵۷ھ) کی گورنری منسوب کی گئی ہے، اگرچہ یہ بھی ممکن ہے (جیسا کہ کیوننگھم نے ریمارک کیا ہے: رپورٹ، ص:۱۷۱) کہ یہ مسعؔود دوبار گورنر رہا ہو۔۔۔ ایک بار اس وقت جب یہ کتبہ تحریر کیا گیا اور دوسری بار ۶۵۶ ہجری میں۔

﴿یادگار نمبر ۶﴾ گوامالتی

گوامالتی ۔۔۔ انگلش بازار کے جنوب مغرب میں چھ میل دور، موجودہ کلیا چک روڈ کے بائیں بازو میں واقع ہے۔ یہاں پر مسٹر ہینری کریٹن کی رہائش گاہ ہوا کرتی تھی جو ۱۷۸۶ء سے لے کر ۱۸۰۸ء تک اس جگہ پر نشو ونما پانے والی ایک نیل فیکٹری کے مشہور منیجر تھے۔ انہوں نے گور کا ایک سروے کیا تھا اور ساتھ ہی کھنڈرات کے آبی رنگ والے خاکے بھی بنائے تھے، اور وہ ایسے اول شخص تھے جنہوں نے ضلع میں ایک ایسا اسکول بنایا تھا جس میں مقامی بچوں کو ان

کی نجی زبان میں تعلیم دی جاتی تھی۔عہد ماضی میں اس کارخانے کے نزدیک جانب مشرق ایک بہت ہی خوبصورت مسجد ہوا کرتی تھی جو اینٹوں اور پتھروں سے تعمیر کی گئی تھی مگر اب اس کا محض ایک مزین مینار ہی باقی رہ گیا ہے۔مسٹر کریٹن نے یہاں سے بہت سارے تراشیدہ پتھر اور گور کے کھنڈرات سے کتبات جمع کئے تھے مگر اب وہ ساری (بیش قیمت چیزیں) منتقل کر لی گئی ہیں۔منشی الٰہی بخش نے اپنی ''خوشید جہاں نما'' میں اس مسجد سے متعلق ایک ایسے کتبے کا ذکر کیا ہے جس میں سلطان (غیاث الدین) بہادر شاہ کا نام مکتوب ہے اور ۷۱۱ھ (مطابق ۱۳۱۱ء) کی تاریخ درج ہے۔یہ واقعہ اس بات کی جانب اشارہ کرتا ہے کہ شمس الدین فیروز شاہ (جس کے نام پر پنڈوہ کا نام فیروز آباد رکھا گیا تھا) کے اسی بیٹے نے اِس مسجد کی تعمیر کرائی تھی مگر نہ تو منشی نے کتبے کی کوئی نقل پیش کی ہے اور نہ ہی (آج کی تاریخ تک) اُس کتبے کا کوئی سراغ لگایا جا سکا ہے۔تاہم اگر منشی صحیح ہے تو اتنی بات طے ہے کہ گوا مالتی مسجد، گور اور پنڈوہ میں تعمیر شدہ قدیم ترین مساجد میں سے ایک ہے۔ یہاں ایک خیرات خانہ بھی ہوا کرتا تھا جس کے کچھ باقیات تاہنوز موجود ہیں۔

یہ نام گوا مالتی شاید ''بوامالتی'' کی ایک بگڑی ہوئی شکل ہے۔مقامی حکایت یہ ہے کہ نالاآتی (یا، مالاتی) نامی ایک خاتون سلطان نصرت شاہ (۹۲۹ھ۔تا۔۹۳۹ھ، مطابق ۱۵۱۸ء۔تا۔۱۵۳۲ء) کی کنیز تھی، اور یہ کہ حرم سرا میں اسے ''بوامالاتی۔۔یا بوامالتی'' کے نام سے پکارا جاتا تھا۔بوا (بؔ کے ضمہ کے ساتھ) کا معنی ہوتا ہے: بڑی بہن۔راقم السطور کو ایسا لگ رہا ہے کہ بوامالاآتی نے شاہی خاندان کے اندر ایک نمایاں پوزیشن حاصل کر لی تھی، اور یہ کہ یہ وہی بوامالاتی ہیں جس نے پیران پیر میں جہانیاں مسجد کی تعمیر کرائی تھی۔علاوہ ازیں ایک سقایہ بھی مہیا کرایا تھا جس کا ذکر چالیسا پارہ، اولڈ مالدہ سے دریافت شدہ کتبے میں اس طرح آیا ہے کہ وہ سقایہ ۹۳۸ھ (مطابق ۱۵۳۲ء) میں تعمیر کیا گیا تھا۔

﴿یادگار نمبر ۷﴾ گنگاسنان اور نہانے کی گھاٹ، سعد اللہ پور

انگلش بازار کے جنوب مغرب میں چھ میل کے فاصلے پر واقع سعد اللہ پور میں نہانے کی ایک گھاٹ ہے جہاں بھاگیرتھی ندی کی طرف اترتی ہوئی لمبی سیڑھیاں بنائی گئی ہیں۔ یہاں پر ہندوؤں کی میت سوزی کیلئے ایک وسیع شمشان بھومی بھی ہے البتہ یہاں کوئی مندر نہیں ہے۔ کہتے ہیں کہ گور کے مسلم بادشاہوں نے اس جگہ کو اس لئے مقرر کیا تھا کہ ہندو لوگ گنگا کے قدیم تلا کے نزدیک اپنی میتوں کو جلا سکیں اور دیگر پوتر رسم و رواج کو ادا کر سکیں۔ یہاں پوس (دسمبر)

کے مہینے میں چودھویں کی رات کو ایک سالانہ میلہ بھی منعقد کیا جاتا ہے۔

﴿یادگار نمبر ۸﴾ گور کا آخری دارالحکومت ٹانڈہ

اولین یورپین جس نے ۱۵۸۵ء میں اس جگہ کا ذکر کیا ہے، وہ رالف فچ ہیں:

''ٹانڈہ گورَن (گور) کی سرزمین پر واقع ہے۔ عہد ماضی میں یہاں ایک سلطنت ہوا کرتی تھی مگر اب یہ جگہ جلال الدین اکبر کے زیر تصرف ہے۔ یہاں کی وسیع ترین تجارت اور خرید و فروخت سوت اور سوتی کپڑوں کی ہے۔ عام طور پر لوگ اپنی کمر کے ارد گرد ایک چھوٹا کپڑا لپیٹے برہنہ ہی گھومتے رہتے ہیں۔ ملک بنگالہ کا یہی معیار ہے۔ یہاں کافی تعداد میں شیر ہیں، جنگلی بھینسیں ہیں اور دیگر جنگلی جان دار مظاہر کی بہتات ہے۔ یہ لوگ پکے بت پرست ہیں۔ ٹانڈہ گنگا ندی سے ایک فرسنگ کی دوری پر واقع ہے، کیونکہ قدیم زمانوں میں برسات کے موسم میں ندی اپنے کناروں کے اوپر سے بہنے لگتی تھی اور ریاست جل تھل ہو جاتی اور بہت سارے گاؤں بہہ جاتے تھے۔ اس لئے لوگ دور رہتے تھے۔ گنگا کی قدیم گزرگاہ جہاں سے دھارائیں مڑ چکی ہوتیں، خشک رہ جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ شہر پانی سے اتنا دور واقع ہے''

یہ باتیں رینل کے میپ کے ساتھ پوری طرح میل کھاتی ہیں جسے تقریباً دو سو سال بعد بنایا گیا تھا اور جہاں ہم یہ پاتے ہیں کہ تارہ (Tarrah) مادھی پور کے شمال مغرب میں ایک میل کی دوری پر اور قلعہ گور کے جنوب مغرب میں اِس بُعد سے تھوڑے زیادہ فاصلے پر، بھاگیرتھی کے سمت مخالف نشان زد کی گئی ہے۔

بوچانن ہیملٹن نے ۱۸۱۰ء میں تنگرہ (وہ ٹانڈہ کو اسی نام سے پکارتا تھا) کے بارے میں مندرجہ ذیل آراء پیش کی ہیں اور متعلقہ میپ سے یہ جگہ ایک وسیع چوکور قلعے کی طرح نظر آتی ہے:

''کلیا چک ڈویژن میں جو واحد کھنڈر موجود ہے وہ تنگرہ ہے، ایک ایسی جگہ جسے قابل لحاظ قدامت کا درجہ حاصل نہیں ہے۔ مغل بادشاہ ہمایون نے جب شیر شاہ کے آل و اطفال کو حکومت ہندوستان سے محروم و معزول کر دیا تو ریاست بنگال نے دوبارہ دہلی کی فرماں برداری اور تابعداری کا پٹہ گردن سے اتار پھینکا اور نئے شاہی خانوادے نے گور کو چھوڑ کر گنگا کی قدیم گزرگاہ کے قریب تنگرہ میں اقامت اختیار کر لی۔ فاصلہ اتنا کم تھا کہ یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ ان لوگوں نے دارالحکومت کو منتقل کیا ہے بلکہ صرف یہ لگتا تھا کہ ایک نئے محل یا نئی رہائش گاہ کی تعمیر کی گئی ہے۔ اگرچہ کہتے ہیں کہ ان شہزادوں نے اولین طور پر گور میں غارت گری کی تھی تاہم نہ تو گور کو پوری طرح برباد کیا گیا تھا اور نہ ہی عوام نے تنگرہ کے دربار کی پوری طرح پیروی کی تھی۔ تنگرہ میں بھی نہ تو کبھی کوئی بڑا محل بن سکا اور نہ ہی آج وہاں کوئی ایسا قابل لحاظ کھنڈر ہے جو یہ بتا سکے کہ ان شہزادوں نے ایک ٹھاٹ باٹ والی زندگی گزاری تھی یا کسی پرشکوہ عمارت کی تعمیر کا

کام کرایا تھا۔

ٹانڈہ کو تانرہ تحصیل، ضلع فیض آباد، متحدہ صوبہ سے ممتاز کرنے کے لئے خواص پور کے نام سے پکارتے تھے مگر کہتے ہیں کہ ۱۸۲٦ء کے سیلاب کی زد میں آ کر ٹانڈہ کے تباہ ہو جانے کی وجہ سے یہ نام اب رام کلی کے مغرب میں ایک میل دور بھاگیرتھی کے مشرقی کنارے پر واقع ایک جگہ کو دے دیا گیا ہے جبکہ ٹانڈہ کے مجوزہ محل وقوع کو محلّہ کھیرتی سے ندی کے عین دوسری طرف ''جولوا بھدال'' نامی گاؤں سے نشان زد کیا جاتا ہے جو جدید خواص پور کے جنوب میں ایک میل سے بھی کم فاصلے پر واقع ہے۔

سلیمان کرارانی کے بارے میں کہتے ہیں کہ اس نے ۱۵٦۵ء میں دارالحکومت کو گور سے ٹانڈہ کی طرف منتقل کیا تھا اور یہ جگہ بنگال کے قدیم مغل گورنروں کی پسندیدہ رہائش گاہ تھی۔[1] ۱٦٦۰ء میں اورنگزیب کے جنرل میر جملہ نے شاہ شجاع پر چڑھائی کی تو اس نے اپنی فوج کو راج محل سے ہٹا کر پیچھے ٹانڈہ لے آیا اور پھر اسی شہر کے قرب وجوار میں کہیں، ایک خونریز جنگ لڑی گئی جس میں بالآخر شاہ شجاع کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ اِس تاریخ کے بعد تاریخ میں پھر کبھی ٹانڈہ کا ذکر نہیں آیا۔ یہ لفظ ''ٹانڈہ'' عام طور پر لوگ ''چار اراضی'' پر محمول کرتے ہیں اور اگر وہ اراضی چھوٹی ہو تو اسے ''تانری'' کہتے ہیں۔ چنانچہ ضلع مالدہ کے کے متعدد گاؤں کے نام یہی لفظ ''تانری'' کے ساتھ کے ساتھ ختم ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر سات تانری اور بھارتی تانری وغیرہ۔

''خواجہ'' مٹھائی کی ایک جانی پہچانی قسم ہے جو خاصی شہرت رکھتی ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ مٹھائی سب سے پہلے ٹانڈہ، بنگال میں بنائی گئی تھی۔ میر مالاتی نامی ایک فقیر جن کی قبر ٹانڈہ کے محل وقوع کے نزدیک اب بھی موجود ہے، نے ایک مقامی بقال کو یہ سکھایا تھا کہ آخر یہ مٹھائی بناتے کس طرح ہیں۔[2]

1۔ آگے چل کر مان سنگھ نے ۹٦-۱۵۹۵ء میں دارالحکومت کو ٹانڈہ سے راج محل میں منتقل کر دیا جہاں منریق کے مطابق ۱٦۴۱ء میں شاہ شجاع نے بھی رہائش اختیار کی تھی۔

2۔ مجھ تک پہنچی اطلاعات کے مطابق، ٹانڈہ کا ''خواجہ'' ہلکی پیسٹری (puff-paste) ایک گندھا ہوا آٹا جسے ذائقہ دار پیسٹری بنانے کیلئے استعمال کیا جاتا ہے) قسم کی ایک مٹھائی ہے۔ امکانی طور پر اِس فقیر نے خواجہ بنانے کے اِس نسخہ کو جنوبی بہار کے ایک گاؤں سیلوٹ جو راج گیر سے زیادہ دور نہیں ہے، سے یہاں لایا ہوگا۔ یہ گاؤں اب بھی اِس مٹھائی کیلئے مشہور ہے۔ (ایچ، ای، اسٹیپلٹن)

﴾یادگار نمبر۹﴿ بہرال

ہیڈکوارٹر انگلش بازار کے شمال مغرب میں ۲۱ میل اور رَتواپولیس اسٹیشن کے جنوب مشرق میں دو میل دور کالندری ندی کے کنارے یہ گاؤں آباد ہے۔ اسی جگہ پر دانا شاہ نامی ایک فقیر کی اعانت سے نواب سراج الدولہ کی گرفتاری عمل میں آئی تھی۔ اس کی گرفتاری کے حالات کو اسٹیوارٹؔ نے اپنی ’ہسٹوری آف بنگال‘ میں اس طرح بیان کیا ہے:

’’اپنی بیوی لطف النساء اور دیگر ایک یا دو عورتوں کو ایک نقاب دار رتھ کے اندر بٹھا کر اپنے ساتھ ہاتھیوں پر بیش بہا جواہرات اور ڈھیر سارے روپے پیسے لے کر تیز رفتاری کے ساتھ وہ بھگوان گولہ پہنچا جہاں سے وہ اِسی مقام پر استادہ اپنی نجی کشتیوں میں سے ایک پر سوار ہو کر فرانسیسی حریت پسند مسٹر لاؔ، جسے اُس نے حکم دے رکھا تھا کہ وہ اُس کے ساتھ شریک سفر ہو جائے یا پورنیہ تک فرار میں اُس کی مدد کرے، کے ساتھ ملاقات کی امید پر ندی کے راستے آگے بڑھنے لگا، مگر راج محل کے جانبِ مخالف تک پہنچ جانے پر بھوک سے پریشان ہو جانے کی وجہ سے اس کی بیوی اور وہ دانا شاؔہ نامی ایک مسلم درویش کی کوٹھری میں گئے اور گزارش کی کہ وہ انہیں کچھ کھانا کھلائے۔ یہ شخص وہی تھا جسے سراج الدولہ نے اپنے زمانہ عروج میں ایک بار بے عزت کیا تھا، یہ بات اُس درویش کے ذہن میں اب تک چبھ رہی تھی۔ بہر حال! اُس فقیر نے سراج الدولہ کو خوش آمدید کہا اور ان لوگوں کے لئے کھچڑی بنانے لگا مگر درپردہ اُس نے اپنے خدام میں سے ایک کو ندی پار میر جعفر خان کے بھائی میر قاسم کے پاس (سراج الدولہ کی اطلاع پہنچانے کے لئے) بھیج دیا۔ چنانچہ یہ آگاہی مل جانے پر میر قاسم نے فوری طور پر راج محل میں موجود سپاہیوں کو حکم دیا اور بہرال میں واقع فقیر کے گھر کی طرف پیش قدمی کی جہاں اُس نے بدنصیب فراریؔ کو گرفتار کر لیا‘‘۔

﴾یادگار نمبر۱۰﴿ دیوتلہ [1] یا قصبہ تبریز آباد

پنڈوہ کے شمال میں ۱۵ میل دور، دیوکوٹ کو جانے والی پادشاہی روڈ کے کنارے اور ضلع مالدہ کی شمالی باؤنڈری کے جنوب میں ڈیڑھ میل کے فاصلے پر مصنوعی طور پر مرتفع ایک علاقہ موجود ہے جو اپنے ہندوانہ نام دیوتلہ، جنگل کے ایک سرے سے لیکر دوسرے سرے تک پھیلے ہوئے ان گنت تالاب اور قرب و جوار میں پائے جانے والے ہندوانہ

1۔ چلہ خانہ کے اندر سے کتبے کی میری دریافت اور مولوی نجم الحسین کے ذریعے دروازے کے اوپر نصب شدہ کتبے کی تازہ خواندگی کی وجہ سے خان صاحب کے ذریعے پیش کردہ کیوننگھم کی مختصر سرگزشت کی جگہ میں نے دیوتلہ کی مفصل تازہ تفصیلات رقم کر دی ہے۔ اسٹیپلٹن

آثار و باقیات کی وجہ سے بغیر کسی شک وشبہ کے ایک قدیم ترین ہندوانہ بودو باش والی جگہ ہے۔ایک عمدہ تالاب کے جنوب مغرب میں اور شاہراہ (جو عہد ماضی میں ادینہ مسجد کے قریب بنی ہوئی سڑک ہی کی طرح سائڈ سائڈ میں اینٹیں

﴿تصویر نمبر۳۳﴾ چلہ خانہ شاہ جلال، دیوتلہ

لگا کر پختہ بنائی گئی تھی) کے جانبِ مغرب یا سمتِ مخالف حضرت شاہ جلال الدین پنڈوی کا ایک چلہ خانہ یا تکیہ (مذہبی تربیت گاہ) موجود ہے۔مقامی لوگ بتاتے ہیں کہ یہ چلہ خانہ اِس کثیر السیاحت شیخ کے ۳۶۰؍عارضی قیام گاہوں میں سے ایک قیامگاہ ہے۔یہ چلہ خانہ ایک چھوٹے سے آنگن جس میں چند قبریں بھی نظر آتی ہیں، میں واقع ہے اور مرکزی عمارت کے عین جنوب مغرب میں سفید رنگ کی ایک چھوٹی سی جدید العہد بھی مسجد ہے۔کیوننگھم نے ۸۰-۱۸۷۹ء میں اِس خطے کا دورہ کیا تھا اور مندرجہ ذیل ریمارک قلمبند کیا تھا۔(رپورٹ، از: کیوننگھم۔ص:۹۴، ۹۵):

''چہار دیواری کے داخلی دروازے کے اوپر سیاہ سنگ مرمر پر نہایت عمدگی کے ساتھ کندہ کیا ہوا ایک کتبہ ہے جس میں ۸۶۸ ہجری میں باربک شاہ کی حکومت کے دوران ایک 'جامع مسجد' کی تعمیر کا ریکارڈ ہے۔یہاں احاطے کے اندر کئی سارے ہندوانہ ستون پڑے ہوئے ہیں اور۔۔۔وشنو کی چار بازوؤں والی ایک عمدہ استادہ ہیئت ہے۔۔۔کتبہ

ایک ایسی انوکھی طرزِ تحریر کا بہترین نمونہ ہے جو اس زمانے میں مروج تھی، جس کے مطابق حروف کی تمام عمودی لکیریں اوپر کی طرف اٹھی ہوتی ہیں اور انہیں اس طرح مساوی فاصلوں پر ترتیب دیتے ہیں کہ وہ دیکھنے میں ایک ریلنگ کی طرح نظر آئے''۔

زیرِ نظر کتبے اور اس کے علاوہ چلہ خانہ کے دروازے کے اوپر موجود دوسرے کتبے کو بھی دورۂ کیونگھم سے چھ سال پہلے ہی مسٹر ای، وی ویسٹ میکوٹ نے دریافت کر لیا تھا اور پھر 'جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ۱۸۷۴ء' میں مسٹر ویسٹ میکوٹ ہی کی جانب سے پیش کردہ 'کتبات کے نقوش طباعت' (rubbings) سے مسٹر بلوچ مین نے کتبات کی توضیح پیش کر دی تھی مگر چونکہ اُس وقت جگہ کا نام غلطی سے ''تیروآباد'' پڑھ لیا گیا تھا اور علاوہ ازیں مسٹر بلوچ مین نے (حکمراں بادشاہ کے نام سمیت) دوسرے کتبے کے زیادہ تر حصے کی رمز کشائی بھی نہ کر پائی تھی اس لئے اب نظرِ ثانی کے بعد اصلاح شدہ متن اور ترجمہ نیچے پیش کیا جا رہا ہے:

(۱) کتبہ: باربک شاہ۔ تاریخ: رجب ۸۶۸ ہجری مطابق مارچ ۱۴۶۴ء۔

قال الله تعالی اجعلتم سقاية الحاج وعمارة المسجد الحرام كمن آمن بالله واليوم الآخر وجاهد في سبيل الله لايستؤون عند الله والله لايهدى القوم الظلمين☆ قال النبى صلى الله عليه وسلم من بنى مسجدا فى الدنيا بنى الله له سبعين قصرا فى الجنة ☆بنى هذا المسجد الجامع بقصبة تبريز آباد خان الاعظم وخاقان المعظم ناصح الملوک والسلاطين كافى العصر والزمان الغ مرابط خان دامت معاليه فى زمن الملک العادل الباذل الفاضل ركن الدنيا والدين ابو المظفر باربک شاه السلطان بن محمود شاه السلطان خلد الله ملكه وسلطانه واعلى امره وشانه فى الخامس من رجب رجب قدره سنة ثمان وستين و ثمانمأة ۔

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تو کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانا اور مسجد حرام کی خدمت کو اس کے برابر ٹھہرا لیا جو اللہ اور قیامت پر ایمان لایا اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا، وہ اللہ کے نزدیک برابر نہیں، اور اللہ ظالموں کو راستہ نہیں دکھاتا ☆ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس نے دنیا میں ایک مسجد بنائی، اللہ اس کے لئے جنت میں ستر محل بنائے گا ☆عظیم ترین خان، ذی مرتبت خاقان، حکمرانوں اور تاجوروں کو اچھی باتیں بتانے والے، زمانے کے (بروں اور بدوں کے مقابل) کفایت کرنے والے، الغ مرابط خان ۔۔۔ اللہ اس کی بلندیوں کو ہمیشہ قائم رکھے ۔۔۔۔ نے ۔۔۔ انصاف ور، فیاض اور صاحب علم و فضل بادشاہ، رکن الدنیا والدین، ابوالمظفر سلطان باربک شاہ ابن سلطان محمود شاہ ۔۔۔ اللہ اس

کی مملکت اور قوت کو سدا باقی رکھے اور اس کی شان وشوکت کو بلند تر فرمائے۔۔۔ کے دور حکومت میں ۔۔۔ ۵/رجب ۔۔۔ اِس کی قدر و منزلت بڑھتی رہے۔۔۔ ۸۶۸ھ کو قصبہ تبریز آباد میں اس جامع مسجد کی تعمیر کرائی۔

(۲) کتبہ: حضرت اعلی (سلیمان کرارانی)۔ تاریخ: ذی قعدہ ۹۷۸ھ (مطابق مئی ۱۵۷۱ء)۔

قال النبی صلی الله علیه وسلم من بنی مسجدا فی الدنیا بنی الله تعالی سبعین قصورا فی الجنة وبنی(؟) المسجد فی القصبة المبارکة تبریز آباد عرف دیوتله فی عهد حضرت اعلی خلد الله تعالی ملکه واعلی شانه وبنی المسجد میان سلیمان بن .... میان صاحب جمع سلمه الله تعالی فی الدارین فی شهر ذی الحجة من شهور سنة ثمان وسبعین وتسعمأة (عمت میامنه ؟)۔

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس نے دنیا میں ایک مسجد بنائی، اللہ اس کے لئے جنت میں ستر محل تعمیر فرمائے گا۔ حضرت اعلی، اللہ تعالی اُس کی مملکت کو ہمیشہ قائم رکھے اور اس کی شان کو بلند تر فرمائے، کے عہد میں بابرکت قصبہ تبریز آباد معروف بہ دیوتلہ میں مسجد کی تعمیر کی گئی۔ سلیمان میاں ولد۔۔۔۔ میاں، ریوینیوکلکٹر (صاحب جمع)، اللہ تعالی دونوں جہاں میں اسے سلامتی عطا کرے، نے ۹۷۸ھ کے مہینوں میں سے ذی الحجہ کے مہینے، اِس کی برکتیں عام ہو جائیں، میں مسجد کی تعمیر کرائی۔

سلیمان خان کرارانی (جس کا اصلی نام وہی تھا جو اُس ریوینیوکلکٹر کا تھا جس نے ۹۷۸ھ میں دیوتلہ مسجد کی تعمیر کرائی تھی) ۹۷۲ھ سے تقریباً بیس سال پہلے بنگال کے سوری بادشاہوں کے ماتحت جنوبی بہار کا گورنر تھا۔ ۹۷۱ھ میں جب اِن سوری بادشاہوں میں سے آخری بادشاہ کو ایک غاصب نے قتل کر دیا تو سلیمان نے اپنے بھائی تاج خان کو اِس مہم کے ساتھ بھیجا کہ وہ اُس غاصب کو نکال باہر کرے، اور پھر اگلے ہی سال تاج خان کی وفات کے بعد سلیمان نے بنگال کو بھی اپنی قلمرو میں شامل کر لیا اور ''دارالحکومت'' کو گور سے ٹانڈہ منتقل کر دیا۔ سلیمان خان کرارانی ۹۸۰ھ مطابق ۱۵۷۲ء میں اپنی وفات تک جنوبی بہار اور بنگال میں حکومت کرتا رہا۔ اُس کے مشہور جنرل کالا پہاڑ نے اُس کے لئے ۹۷۵ھ میں اوڈیشہ کو بھی فتح کر لیا تھا۔ سلیمان، اکبر کی بالادستی کو تسلیم کرنے کے حوالے سے کافی محتاط تھا اور اسی لئے صرف ''حضرت اعلی'' کا لقب استعمال کرتا تھا جو کتبات میں مذکور ہے۔

کوئی شک نہیں کہ سلیمان نے اپنے نام پر کوئی سکہ ڈھالنے سے بھی احتراز کیا تھا، مگر اُس کی وفات کے بعد اُس کے دوسرے بیٹے داؤد نے بغاوت کر دی تاہم ۹۸۲ء میں اُسے بنگال اور بہار کو اکبر کے حوالے کرنا ہی پڑا۔ ہاں!

اوڈیشہ کا فرماں رواو ہی بنا رہا۔ آئندہ سال داؤد نے بارِ دگر بنگال پر حملہ کردیا مگر ۹۸۴ھ مطابق ۱۵۷۶ء میں راج محل کی جنگ میں حسین قلی خان جہاں کے ہاتھوں اسے شکست کا منہ دیکھنا پڑا اور بالآخر وہ قتل کر دیا گیا۔ افغان اس کے بعد بھی وقت وقت پر پریشانیاں کھڑی کرتے رہے تاوقتیکہ ۱۰۲۲ھ مطابق ۱۶۱۳ء میں (ان لوگوں کے لیڈر) عثمان کو شکست دیکر قتل نہیں کر دیا گیا مگر حقیقی طور پر داؤد کی موت کے بعد ہی سے بنگال اور اوڈیشہ دونوں سلطنتِ مغلیہ کے حصے بن چکے تھے۔

(۳) کتبہ:

چلہ خانہ کی اندرونی دیوار میں 'آستانہ' یعنی شیخ کی جائے مراقبہ کے بائیں طرف ایک تیسرا کتبہ مؤرخہ ۹۳۴ھ (مطابق ۱۵۲۷ء) بھی نصب کیا گیا ہے جس میں حسینی سلسلہ کے نصرت شاہ کے ذریعے ایک مسجد کی تعمیر یا راجح طور پر باربک شاہ کے دور حکومت میں تعمیر شدہ قدیم مسجد کی بحالی کا ریکارڈ ہے۔ یہ کتبہ اس لحاظ سے خصوصی دلچسپی کا باعث ہے کہ اس میں شیخ کا نام ''شیخ جلال محمد تبریزی'' درج کیا گیا ہے۔

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من بنی للہ مسجدا بنی اللہ لہ بیتا مثلہ فی الجنۃ ☆ بنی ھذا المسجد فی عھد سلطان بن السلطان ناصر الدنیا والدین ابو المظفر نصرتشاہ السلطان بن حسین شاہ السلطان خلد اللہ ملکہ و سلطانہ فی بلاد الشیخ جلال محمد التبریزی و بانیہ شیر ملک کار فرمانہ فی سنۃ اربع وثلثین و تسعمأۃ۔

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس نے اللہ کیلئے ایک مسجد بنائی، اللہ اس کے لئے اسی کی طرح جنت میں ایک گھر بنائے گا ☆ شاہ ابن شاہ، ناصر الدنیا والدین، ابوالمظفر سلطان نصرت شاہ ولد سلطان حسین شاہ، اللہ اُس کی مملکت اور حکومت کو ہمیشہ قائم رکھے، کے عہد میں ۹۳۴ھ (مطابق ۱۵۲۷ء) کو شیخ جلال محمد تبریزی کے دیار میں اس مسجد کی تعمیر عمل میں آئی۔ اور مسجد کا بانی اس کا کارگزار (کارفرمان) شیر ملک ہے۔

اس سیکشن کے آغاز ہی میں پیش کی گئی ایک حالیہ عکسی تصویر کی نقل کو دیکھ کر دیوتلہ میں واقع ''چلہ خانہ شاہ جلال'' کی دلآویز خوبصورتی کا کسی حد تک اندازہ لگایا جا سکتا ہے، جبکہ کتبہ باربک شاہ کو پلیٹ نمبر ۴ کی دوسری تصویر کے طور پر شامل کر دیا گیا ہے۔ جنرل کیوننگھم نے غالبًا وشنو کی اُس تصویر کو ہٹا دیا ہے جس کا اُس نے حوالہ دیا تھا کیونکہ دیوتلہ میں اب بظاہر تو ایسی کوئی بھی تصویر نظر نہیں آتی۔ تاہم اُس نے اِس کا ایک توضیحی خاکہ اپنے رپورٹ کی پلیٹ نمبر ۲۷ میں پیش کر دیا ہے۔ جن ستونوں کا جنرل کیوننگھم نے ذکر کیا تھا، وہ اب تک دیوتلہ کے صحن میں موجود ہیں۔

ضمیمہ:الف۔۔۔۔۔کتابیات

مندرجہ ذیل تخلیقات گور، پنڈوہ اور دیگر متعلقہ مقامات وامور کے حوالے سے کلیدی مآخذ کا درجہ رکھتی ہیں:

(۱)ابوعمر منہاج الدین عثمان بن سراج الدین الجوجانی (منہاج سراج)۔۔۔۔۔طبقات ناصری۔۔۔۔تہذیب وترتیب، از: کیپٹین ڈبلیو، نساؤلیس، مولوی خادم حسین اور مولوی عبدالحی۔مطبوعہ:۶۴ - ۱۸۶۳ء۔بائبلیوتھیکا انڈیکا [1]، ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال۔

انگریزی ترجمہ، از: میجر ایچ۔جی۔راورٹی۔مطبوعہ:۹۷-۱۸۷۳ء۔ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال۔۔۔انگریزی ترجمہ ۱۸۸۱ء میں لندن سے بھی شائع ہو چکا ہے۔

(۲)ضیاءالدین برنی۔۔۔۔۔تاریخ فیروز شاہی۔۔۔۔تہذیب وترتیب، از: سید احمد خان۔مطبوعہ: ۱۸۴۸ء۔مخزن علم انڈیکا۔

(۳): شمسی سراج عفیف۔۔تاریخ فیروز شاہی۔۔تہذیب وترتیب، از: مولوی ولایت حسین۔مطبوعہ: ۱۸۹۱ء۔مخزن علم انڈیکا۔

(تخلیق اول، نیچے فیروز شاہ کے عہد تک نمبرا رہی کا ایک تسلسل ہے جبکہ تخلیق دوم کے مصنف نے فیروز شاہ کو اس کی بنگال فوجی مہم کے حوالے سے موضوع سخن بنایا ہے۔۔۔اِن دونوں تخلیقات کا خلاصہ ایلیٹ اور ڈاؤنسن نے اپنی ''ہسٹوری آف انڈیا ایز ٹولڈ بائی اِٹس اون ہسٹوریَنس'' کی جلد سوم، مطبوعہ: ۱۸۷۱ء، ٹروبنر، لندن میں پیش کیا ہے۔)

(۴)محمد قاسم ہندوشاہ استر آبادی، معروف بہ: ''فرشتہ''۔۔۔۔۔تاریخ فرشتہ۔۔۔۔۔۔انگریزی ترجمہ، از: الیگزینڈر ڈاؤ۔تین جلدیں۔مطبوعہ: ۱۸۷۱ء، لندن۔

1۔''Bibliotheca Indica'' کا معنی تو لغت میں کتاب گھر، کتب خانہ اور مرکز علم وفن وغیرہ کے آتا ہے تاہم مشرقی ادبیات سے متعلق ایک ایسے مجموعہ تحقیقات کا نام ہے جو نصابی مطبوعات، انگریزی تراجم، فہرست نگاری، لغات، قواعد، علم الکتاب اور ''رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال'' کی جانب سے پیش کردہ اسٹڈیز پر مشتمل ہو۔۔۔اتنی توضیحات کے بعد بتاتے چلیں کہ اِس کے بعد کتابیات کے اِس ضمیمہ میں جہاں بھی ''Bibliotheca Indica'' کی اصطلاح آئے گی، ہم اردو متبادل کے طور پر ''مخزن علم انڈیکا'' کی ایک ''خودساختہ ترکیب'' استعمال کریں گے۔سو اِس ترکیب سے انگریزی کی اصل اصطلاح سمجھ لی جائے۔(میزان)

(۵) ابوالفضل علامی ۔۔۔۔۔ آئین اکبری ۔۔۔۔تہذیب ترتیب، از: ایچ، بلوچ مین ۔ برائے: مخزن علم انڈیکا، ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال ۔ سن اشاعت: ۷۷-۱۸۶۷ء ۔۔۔۔۔ انگریزی ترجمہ: جلداول، از: ایچ، بلوچ مین ۔ جلد دوم وسوم، از: ایچ، ایس جیریٹ ۔ مطبوعہ: ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال ۔ ۹۴-۱۸٦۸ء ۔

(٦) ابوالفضل علامی ۔۔۔۔ اکبرنامہ ۔۔۔ تہذیب وترتیب، از: احمد علی وعبدالرحیم ۔ مطبوعہ: ۸٦-۱۸۷۳ء ۔ مخزن علم انڈیکا، ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال ۔۔۔۔۔ انگریزی ترجمہ، از: ایچ، بیوریج ۔ مطبوعہ: ۱۸۹۷ء اور ۱۹۲۱ء ۔ مخزن علم انڈیکا ۔

(۷) خواجہ نظام الدین احمد ۔۔۔ طبقات اکبری ۔۔۔ انگریزی ترجمہ، از: بی، ڈی ۔ مطبوعہ: مخزن علم انڈیکا، نمبر: ۲۲۵، جلد اول، ۱۹۲۷ء (دہلی کے فیروز شاہ کے ذریعے بنگال پر دومرتبہ فرج کشی اور اِکدالا کے محاصرہ کی تفصیلات صفحہ نمبر ۲۴۴ تا ۲۴۷ / میں درج ہیں) ۔

(۸) میر غلام حسین خان ۔۔۔۔ سیر المتأخرین ۔۔۔۔ یہ کتاب ۱۱۱۸ ہجری سے لیکر ۱۱۹۴ ہجری (مطابق ۱۷۰٦ء تا ۱۷۸۳ء) تک کے حالات پر میر غلام حسین خان کی لکھی ہوئی ایک ہندوستانی تاریخ ہے جس کا انگریزی ترجمہ مسٹر ریمنڈ، مابعد نام حاجی مصطفیٰ نے کیا ہے ۔ (مطبوعہ: ۱۸۰۲ء، کلکتہ ۔۔۔ چار جلدیں) ممکنہ طور پر کتاب کی اشاعت ۱۷۸٦ء میں ہوئی تھی ۔

(۹) غلام حسین سلیم ۔۔۔ ریاض السلاطین، تحریر شدہ: ۸-۱۷۸۷ء ۔۔۔ تہذیب وترتیب، از: عبدالحق عابد ۔ مخزن علم انڈیکا، ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ۹۸-۱۸۹۰ء ۔۔۔ انگریزی ترجمہ، از: عبدالسلام (خان بہادر) اشاعت: ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال ۔ ۴-۱۹۰۲ء ۔

(۱۰) محمد علی خان انصاری ۔۔۔ تاریخ مظفری ۔۔۔ دور تیموری سے لیکر ۱۲۲۵ھ مطابق ۱۸۱۰ء تک کی ہندوستانی تاریخ ۔ (ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال) ۔

(۱۱) الف: ڈاکٹر فرانسس بوچانن ہیملٹن ۔۔۔ ضلع دیناجپور کے تئیں ڈاکٹر فرانسس بوچانن ہیملٹن کی جغرافیائی، شماریاتی اور تاریخی تصریحات ۔۔۔۔ یہ رپورٹ ۸-۱۸۰۷ء میں آنریبل کورٹ آف ڈائریکٹر، ایسٹ انڈیا کمپنی کی خواہش پر مرتب کیا گیا تھا جس کی اشاعت ''گلینگ اِن سائنس'' کے ماہانہ نمبرات اور ''جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی'' کلکتہ، باپٹسٹ پریس، ۱۸۳۳ء، میں ہوئی تھی ۔

(۱۱) ب: ڈاکٹر بوچانن ہیملٹن ۔۔۔۔ اکاؤنٹ آف دی ڈسٹرکٹ آف پورنیہ، ۱۰-۱۸۰۹ء ۔۔۔۔ تہذیب و ترتیب: وی، ایچ، جیکسن، (پٹنہ: بہار اینڈ اڑیسہ گورنمنٹ پریس، ۱۹۲۸ء)۔

(۱۱) ج: مونٹ گومیری مارٹن ۔۔۔۔ ایسٹرن انڈیا ۔۔۔۔ (۱۸۳۸ء) میں ۱۱/الف اور ۱۱/ب کی اشاعت ثانی۔

(۱۲) الف: میجر ولیم فرینکلن ۔۔۔۔۔ جرنل آف اَروٹ فروم راج محل ٹو گور ۔۔۔۔ (ریگولیٹنگ آفیسر، بنگال اسٹیبلشمنٹ) بھاگلپور۔ ۱۱-۱۸۱۰ء۔ ایسٹرن بنگال اینڈ آسام گورنمنٹ پریس، شیلونگ نے ۱۹۱۰ء میں تحریر کو دوبارہ شائع کیا تھا۔

(۱۲) ب: بیوریج ۔۔۔۔ گور کے احوال وکوائف کے تئیں میجر فرینکلن کے قلمی نسخہ پر ایچ، بیوریج کا نوٹ۔ جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ص: ۸۵ تا ۹۳۔ ۱۸۹۴ء۔

(۱۳) میجر چارلس اسٹیوارٹ ۔۔۔۔ ہسٹوری آف بنگال فروم دی فرسٹ محمڈن انویشن انٹیل 1757۔ ۱۸۱۳ء۔ بلیک بیری اینڈ کمپنی، لندن۔ (یہ تحریر نمبر ۴/ اور نمبر ۹/ کی تخلیقات پر انحصار کرتی ہے)

(۱۴) ایچ، کریٹن ۔۔۔۔۔۔ روئنز آف گور ۔۔۔۔ جس میں مقامی جغرافیائی نقشہ کے ساتھ ۱۸/مناظر کی ترجمانی وتوضیح کی گئی ہے۔ (بلیک، پَر بیوری اینڈ ایلین ۔ ۱۸۱۷ء، لندن)

(۱۵) منشی الٰہی بخش، انگریز آباد ۔۔۔۔ خورشید جہاں نما ۔۔۔۔ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال وثیقہ نمبر ڈی/ ۳۳۱۔ (یہ کتاب ۱۸۵۳ء اور ۱۸۶۳ء کے درمیان لکھی گئی تھی)

(۱۵) الف: ایچ، بیوریج ۔۔۔۔ 'خورشید جہاں نما' پر ایچ بیوریج کا نوٹ (جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ج: ۶۴، پارٹ: ۱، نمبر: ۳، ص: ۱۹۴ تا ۲۳۶۔ ۱۸۹۵ء۔

(۱۶) ایچ، بلوچ مین ۔۔۔۔ ریسرچز اِن ٹو دَ ہسٹوری آف بنگال ۔۔ (جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ۷۵-۱۸۷۳ء)۔ کنٹر بیوشن ٹو دَ جیوگرافی اینڈ ہسٹوری آف بنگال (مسلم دور حکومت)۔۔ نمبر: ۱، پارٹ: ۱، جغرافیائی: پارٹ ۲، تاریخی، مشتمل بر کتبات وغیر مطبوعہ سکے، جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ج: ۴۳ (۱)، ۱۸۷۳ء، نمبر ۲، جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ج: ۴۳ (۱)، ۱۸۷۴ء اور نمبر ۳، جرنل آف دی ایشاٹک سوسائٹی آف بنگال، ج: ۴۴ (۱)، ۱۸۷۵ء ۔۔۔۔۔ مزید عربی و فارسی کتبات نمبر ۲/ پر بلوچ مین کے نوٹس، جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ۱۸۷۲ء۔ ص: ۱۰۲/ تا ۱۰۷۔ (گنگارامپور، دیناجپور، دیوکوٹ کتبات)۔

(۱۷) ایل، بی، بی، کنگ، قائم مقام کلکٹر ضلع مالدہ کا حکومت بنگال کے نام باقیات گور کی موجودہ حالت پر مؤرخہ

۲۹؍ مارچ ۱۸۷۵ء کو بھیجا گیا خط۔ (روئیداد جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ص: ۹۳، ۱۸۷۵ء)۔

(۱۸) جیمس فرگیوسن ۔۔۔۔۔ ہسٹوری آف انڈین اینڈ ایسٹرن آرکی ٹیکچر۔ (لندن، ۱۸۷۶ء ۔۔۔ اشاعت ثانی، از: برگیز اینڈ اسپئیر، لندن، ۱۹۱۰ء۔ جان میری)

(۱۹) جے، ایچ، رَونَشا ۔۔۔ گور: اِٹس رئنز اینڈ اِنسکر پشنز۔ (لندن، ۱۸۷۸ء۔ سی، کیگن پاؤل اینڈ کمپنی)

(۲۰) میجر جنرل الیگزینڈر کیو ننگھم ۔۔۔ آثاریاتی رپورٹ، ج: ۱۵ ۔۔۔ ۱۸۷۹-۸۰ء میں پٹنہ سے لیکر سنارگاؤں تک بہار اور بنگال کا ایک دورہ۔ (کلکتہ، آفس آف دی سپرنٹنڈنٹ آف گورنمنٹ پرینٹنگ، ۱۸۸۲ء)۔

(۲۱) ایک نئی تانبے کی پلیٹ جسے اُمیش چندرا باتویالؔ نے دَھرماپالا سے دریافت کیا۔ جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ص: ۳۹؍ تا ۶۲، مع پلیٹ۔ ۱۸۹۴ء۔

(۲۲) ایپگرافیا انڈیکا۔ ج: ۲۔ گورنمنٹ آف انڈیا پریس، کلکتہ۔ ۱۸۹۴ء۔ (صفحہ نمبر ۲۸۲؍ تا ۲۸۸؍ میں پاؤل ہارن نے پنڈوہ اور گور سے متعلق کتبات کی ریڈنگ پیش کی ہے)۔

(۲۳) الف: منموہن چکرورتی ۔۔۔ سرٹین ڈِسپیوٹیڈ اور ڈاؤٹ فل ایوینٹس اِن دہسٹوری آف بنگال، پارٹ: ۱ ۔۔۔ جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ج: ۴، [N. S.]، ۱۹۰۸ء۔ ص: ۱۵۱؍ تا ۱۵۸۔ (مسلمانوں کے فتح بنگال کے بعد اولین تیس سالوں کی وقائع نگاری)

(۲۳) ب: منموہن چکرورتی ۔۔۔ قدیم بنگال کے جغرافیائی حالات پر نوٹس ۔۔۔ جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ج، ۴۔ ص: ۲۶۷؍ تا ۲۹۲، ۱۹۰۸ء۔ (صفحہ نمبر ۲۷۳؍ تا ۲۸۴؍ میں گور اور لکشمناوتی کی تاریخ پر ایک مباحثہ پیش کیا گیا ہے)

(۲۳) ج: منموہن چکرورتی ۔۔۔ گور اور بنگال کے دیگر قدیم مقامات پر نوٹس ۔۔۔ جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ج: ۵، ص: ۱۹۹؍ تا ۲۳۴، ۱۹۰۹ء۔

(۲۳) د: منموہن چکرورتی ۔۔۔۔ پری مغل موسقز آف بنگال ۔۔۔۔ جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ج: ۶، ۱۹۱۰ء، ص: ۲۳؍ تا ۳۸۔

(۲۴) رجنی کانتہ چکرورتی ۔۔۔ گور۔ ایر۔ اتہاس، (دو جلدیں ۔۔۔ ۱۹۰۹ء، مالدہ۔ شائع شدہ، از: ایم، عابد علی خان)۔

(۲۵) رام پرساد چندرا ۔۔۔۔ گوراراج مالا ۔۔۔۔ ۱۳۱۹ء بنگلہ تاریخ (مطابق ۱۹۱۲ء)۔

(۲۶) جی،ای،لیم برن آئی سی،ایس۔۔۔بنگال ڈسرکٹ گزیٹیر، مالدہ، (کلکتہ سیکریٹریئل بک ڈپو، ۱۹۱۸ء) ۔۔۔اس کتاب میں موجود تاریخی بیانات بہت زیادہ غلط ہیں،سوچاہیئے کہ مکمل طور پر تحریر کی نظر ثانی کی جائے۔

(۲۷) ایس،ایچ،ہوڈی والا۔۔۔۔بنگالہ۔۔۔جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی، بنگال، ۱۹۲۰ء مسکوکیات تتمہ نمبر:۳۴۔ص:۱۹۹تا۲۱۲۔(اس بات پر نظر کہ یہ کہاں ڈھالا گیا تھا۔۔۔گور لکھنوتی،ٹانڈہ یا پھر راج محل میں؟)۔

(۲۸) آر،سی، مجومدار۔۔۔کرونولوجی آف دی سینا کنگس۔جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی، بنگال، ج:۱۷،ص: ۷تا۱۶۔ ۱۹۲۱ء۔

(۲۹) ایچ،نیویل۔۔مینٹ ٹاؤنز آف ڈلہی سلطانس، جرنل آف دی ایشیاٹک آف بنگال،مسکوکیاتی تتمہ،۱۹۲۱ء ۔ص:۱۱۶تا۱۳۰۔(اس تحریر میں فتح آباد وفرید پور، گور ولکھنوتی، ست گاؤں، شریف آباد اور سنارگاؤں جیسی ٹکسالی جگہوں پر گفتگو کی گئی ہے)

(۳۰) این، کے، بھٹاسالی، ڈھاکہ۔۔۔۔کوئنز اینڈ کرونولوجی آف دی اَرلی انڈیپنڈنٹ سلطانس آف بنگال ۔۔۔(ڈبلیوہیفر اینڈ سنز،کیمبرج، ۱۹۲۲ء)

(۳۱) ایچ،ای،اسٹیپلٹن ۔۔۔کنٹریبوشن ٹو دہسٹوری اینڈ اِیتھنولوجی آف نارتھ ایسٹرن انڈیا۔

چہارم: بنگال کرونولوجی ڈیورنگ دَ پیریڈ آف انڈیپنڈنٹ مسلم رول۔جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ج:۱۸، ۱۹۲۲ء،ص:۴۰۷تا۴۳۰۔(۱۲۸۳ء۔۔۱۳۳۹ء)۔

(۳۲) این، کے، بھٹاسالی۔۔۔ڈیٹ مینیشن آف دی ایپوک آف دی پرگناتی ایرا۔انڈین اینٹی کوائری، ج:۵۳، ۱۹۲۳ء۔ص:۳۱۴تا۳۲۰۔

ضمیمہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ب

قدیم ترین مسلم دورِ حکومت سے لیکر نیچے مغل بادشاہ محمد شاہ کے زمانے تک ضلع مالدہ، بنگال۔۔۔۔بالخصوص گور اور پنڈوہ میں دریافت کیئے جانے والے عربی و چند فارسی کتبات کی مقامی جغرافیائی فہرست نگاری۔

(۱) تاریخ: ۶۳۰ ہجری مطابق ۱۲۳۲ عیسوی۔۔۔۔بادشاہ: شمس الدین التمش۔۔۔۔۔مقام: گور۔۔۔۔حوالہ: کیوننگھم۔آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا رپورٹ، ج: ۱۵،ص: ۴۵ اور پلیٹ نمبر ۲۰۔کتبہ انڈین میوزیم، کلکتہ میں موجود ہے جس میں ایک کنواں کی کھدائی کا ریکارڈ ہے۔

(۲) تاریخ: ۶۴۷ ہجری مطابق ۱۲۴۸ عیسوی۔۔۔۔بادشاہ: جلال الدین مسعود جانی (گورنر آف بنگال)۔مقام: بچھلی، جو مالدہ کے شمال مغرب میں ۸/میل کے فاصلے پر واقع ہے۔۔۔۔حوالہ: کیوننگھم۔ایضا، پلیٹ نمبر ۲۱۔مطالعہ کیلیئے ملاحظہ فرمائیں: ''تذکرۂ گور و پنڈوہ''۔۔۔زیرِ عنوان: کتبہ مسعود شاہ جانی۔

(ب) تاریخ: ۷۱۱ ہجری مطابق ۱۳۱۱ عیسوی۔۔۔بادشاہ: غیاث الدین بہادر شاہ (اپنے والد شمس الدین فیروز شاہ کے ساتھ مشترک حکمراں)۔۔۔مقام: گوامالتی، گور۔۔۔حوالہ: تذکرۂ گور و پنڈوہ، زیرِ عنوان: گوامالتی۔

(۳) تاریخ: ۷۷۰ ہجری مطابق ۱۳۶۹ عیسوی (۷۷۶ ہجری مطابق ۱۳۷۴ عیسوی؟)۔۔۔۔بادشاہ: سکندر شاہ۔۔۔۔مقام: ادینہ مسجد، حضرت پنڈوہ۔۔۔۔۔حوالہ: (الف) بلوچ مین، جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ۱۸۷۳ء۔ص: ۲۵۷۔(ب) کیوننگھم، آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا، ج: ۱۵،ص: ۹۳۔(ج) رَونشاہ، گور۔ص: ۶۲، پلیٹ نمبر ۴۵۔(د) تذکرۂ گور و پنڈوہ، زیرِ عنوان: عمارت کے عقب پر موجود کتبہ سکندر شاہ۔(۷۷۶ ہجری کی توضیح کے لئے 'خورشید جہاں نما' از: منشی الٰہی بخش کی 'تلخیص' از: بیوریج، مطبوعہ: جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ۱۸۹۵ء، ص: ۲۱۲۔اور ایپگریفیکا انڈیکا، ج: ۲،ص: ۲۸۳، از: پی، ہارن ملاحظہ فرمایئے)۔

(۴) تاریخ: ۸۵۹ ہجری مطابق ۱۴۵۵ء۔۔۔۔۔بادشاہ: ناصر الدین محمود شاہ۔۔۔۔۔مقام: یہ کتبہ جس میں ہلال نامی ایک شخص کے ذریعے ایک مسجد کی تعمیر کا ریکارڈ ہے، اب آستانہ شاہ گدا، اولڈ مالدہ کی چہار دیواری کے دروازے کے اوپر نصب شدہ ہے۔۔۔۔حوالہ: (الف) بلوچ مین، جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ۱۸۷۴ء۔ص: ۲۹۴/تا ۲۹۵۔(ب) رَونشاہ، گور۔ص: ۲۷، اور پلیٹ نمبر ۴۶۔(ج) تذکرۂ گور و پنڈوہ، زیرِ عنوان: آستانہ شاہ گدا۔

(۵) تاریخ: ۸۶۲ ہجری مطابق ۱۴۵۷ عیسوی۔۔۔۔بادشاہ: ناصر الدین محمود شاہ۔۔۔۔مقام: کوتوالی گیٹ

کے نزدیک تعمیر شدہ پانچ محرابوں والا پل۔۔۔۔۔حوالہ: (الف) کیونگھم، آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا رپورٹ، جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ص:۵۷، پلیٹ نمبر۲۰۔(ب) بلوچ مین، جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ۱۸۷۵ء۔ص:۲۸۹۔(ج) تذکرۂ گوروپنڈوہ، پلیٹ نمبر۶۔

(۶) تاریخ: ۸۶۳ھ ہجری مطابق ۱۴۵۹ء۔۔۔۔بادشاہ: ناصرالدین محمودشاہ۔۔۔۔۔مقام: باورچی خانہ، آستانہ حضرت نور قطب العالم، چھوٹی درگاہ، پنڈوہ کے شمالی دروازے کا بالائی حصہ، اندر کی طرف۔۔۔۔حوالہ: (الف) بلوچ مین، جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ۱۸۷۳ء۔ص:۲۷۱۔(ب) رَونشا، گور۔ص:۵۲، پلیٹ:۴۶، نمبر۴۔(ج) تذکرۂ گوروپنڈوہ، زیرعنوان: باورچی خانہ میں لگا کتبہ، اور پلیٹ نمبر۶۔

(۷) تاریخ: ۸۶۵ھ ہجری مطابق ۱۴۶۰ عیسوی۔۔۔۔۔بادشاہ: رکن الدین باربک شاہ۔۔۔۔۔مقام: گور کی کسی مسجد سے دریافت کیا گیا ہے، اب انڈین میوزیم، کلکتہ میں موجود ہے۔۔۔۔۔حوالہ: بلوچ مین، جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ۱۸۷۴ء، ص:۲۹۵۔

(۸) تاریخ: ۸۶۸ھ ء مطابق ۱۴۶۴ عیسوی۔۔۔۔۔بادشاہ: رکن الدین باربک شاہ۔۔۔۔۔مقام: دیوتلہ، شمالی باؤنڈری، ضلع مالدہ۔۔۔۔۔حوالہ: (الف) بلوچ مین، جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ۱۸۷۴ء، ص: ۲۹۶۔(ب) کیونگھم، آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا، ص:۹۴۔(ج) تذکرۂ گوروپنڈوہ، زیرعنوان: دیوتلہ یا قصبہ تبریز آباد، اور پلیٹ نمبر۴۔

(۹) تاریخ: ۸۷۰ھ ہجری مطابق ۱۴۶۵ عیسوی۔۔۔۔بادشاہ: دورحکومت باربک شاہ، مگر کتبے میں کسی بھی بادشاہ کا نام ذکر نہیں کیا گیا ہے۔۔۔۔مقام: آستانہ شاہ نعمت اللہ، فیروزپور، گور کے صحن میں یہ کتبہ موجود ہے۔۔۔۔حوالہ: (الف) رَونشا، گور۔ص:۳۶(جہاں پر تاریخ غلطی سے ۹۷۰ھ ہجری لکھ دی گئی ہے)، (ب) تذکرۂ گوروپنڈوہ، زیر عنوان: مقبرہ شاہ نعمت اللہ (جہاں پر خان جہاں کے ذریعے ایک دروازہ کی تعمیر کا ریکارڈ ہے)۔

(۱۰) تاریخ: ۸۷۱ھ ہجری مطابق ۱۴۶۶ عیسوی۔۔۔۔۔بادشاہ: رکن الدین باربک شاہ۔۔۔۔۔مقام: ممکنہ طور پر نیم دروازہ، گور سے حاصل کیا گیا ہے۔۔۔۔۔حوالہ: (الف) کیونگھم، آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا، ص:۵۳۔(ب) رونشا، گور، ص:۱۸، (ج) تذکرۂ گوروپنڈوہ، زیرعنوان: شاہی محل۔

(۱۱) تاریخ: [؟]۸۷۰ھ ہجری مطابق ۱۴۶۵ عیسوی۔۔۔۔۔۔بادشاہ: شمس الدین یوسف شاہ۔۔۔۔۔مقام: ساک موہن مسجد، اولڈ مالدہ۔۔۔۔حوالہ: (الف) بلوچ مین، جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ۱۸۷۴ء،

ص:۲۹۸۔(ب) تذکرۂ گوروپنڈوہ، زیرعنوان: ساک موہن مسجد۔

(۱۲) **تاریخ:** ۸۸۰ھ ہجری مطابق ۱۴۷۵ء عیسوی ۔۔۔ **بادشاہ:** شمس الدین یوسف شاہ ۔۔۔ **مقام:** اغلب طور پر چام کٹی مسجد، گور سے حاصل کیا گیا ہے ۔۔۔ **حوالہ:** (الف) کیوننگھم، آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا، ص:۶۰۔(ب) رَونشا، گور، ص:۳۰۔(ج) تذکرۂ گوروپنڈوہ، زیرعنوان: جنرل کیوننگھم کی تصریحات (چام کٹی مسجد کے تئیں)۔

(۱۳) **تاریخ:** ۸۸۴ھ ہجری مطابق ۱۴۷۹ء عیسوی ۔۔۔۔ **بادشاہ:** شمس الدین یوسف شاہ ۔۔۔۔ **مقام:** درس باڑی یا مدرسہ، فیروز پور، گور ۔۔۔ **حوالہ:** (الف) بیوریج، جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ۱۸۹۵ء، ص: ۲۲۲۔(ب) کیوننگھم، آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا، ص:۷۶ اور پلیٹ نمبر ۲۲ (جس کی ایک نقل تذکرۂ گوروپنڈوہ میں پلیٹ نمبر ۳ر کے طور پر پیش کردی گئی ہے)۔(ج) تذکرۂ گوروپنڈوہ، زیرعنوان: درس باڑی مسجد۔

(۱۴) **تاریخ:** ۸۸۴ھ ہجری مطابق ۱۴۷۹ء عیسوی ۔۔۔۔ **بادشاہ:** شمس الدین یوسف شاہ ۔۔۔۔ **مقام:** سجدہ گاہ، چھوٹی درگاہ، پنڈوہ ۔۔۔۔ **حوالہ:** (الف) بلوچ مین، جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ۱۸۷۳ء، ص: ۲۷۶۔(ب) کیوننگھم، آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا، ص:۸۵۔(ج) رَونشا، گور۔ص:۵۰، اور پلیٹ ۴۷، نمبر ۵۔ (د) تذکرۂ گوروپنڈوہ، زیرعنوان: سجدہ گاہ۔

(۱۵) **تاریخ:** ۸۸۵ھ ہجری مطابق ۱۴۸۰ء عیسوی ۔۔۔۔ **بادشاہ:** شمس الدین یوسف شاہ ۔۔۔۔ **مقام:** تانتی مسجد، گور (لیکن اب یہ کتبہ احاطہ قدم رسول کے اندر موجود ہے)۔**حوالہ:** (الف) بلوچ مین، جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال۔۱۸۷۳ء۔ص:۲۷۷۔(ب) ای، آئی، ج:۲، ص:۲۸۴۔(ج) بیوریج، جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ۱۸۹۵ء، ص:۲۱۸۔(د) تذکرۂ گوروپنڈوہ، زیرعناوین: قدم رسول و تانتی پارہ مسجد۔

(۱۶) **تاریخ:** ۸۸۹ھ ہجری مطابق ۱۴۸۴ء عیسوی ۔۔۔۔ **بادشاہ:** جلال الدین فتح شاہ ۔۔۔۔ **مقام:** گن مانت مسجد، گور ۔۔۔ **حوالہ:** تذکرۂ گوروپنڈوہ، زیرعناوین: گن مانت مسجد، چھوٹی ساگر دیگھی، بھیٹا چاند سوداگر اور کمبھیر پیر تالاب، اور پلیٹ نمبر ۴۔

(۱۷) **تاریخ:** ۸۹۱ھ ہجری مطابق ۱۴۸۶ء عیسوی ۔۔۔۔ **بادشاہ:** جلال الدین فتح شاہ ۔۔۔ **مقام:** ماڈرن مسجد، مادھی پور، گور ۔۔۔۔ **حوالہ:** ای، آئی، ج:۲، پی، ہارن، ص:۲۸۷، (اس کتبے میں مقبرہ مولانا برخوردار ولد تاج خان کے سرا کی طرف سید دستور ولد سید راحت کے ذریعے ایک مسجد کی تعمیر کا ریکارڈ ہے)۔

(۱۸) **تاریخ:** گمشدہ ۔۔۔۔ **بادشاہ:** جلال الدین فتح شاہ ۔۔۔۔ **مقام:** چھلا مسجد، گور ۔۔۔۔ **حوالہ:** ای، آئی،

ایضاً،ص:۲۸۷/تا۲۸۸،(علت گمشدہ ہے، دولت خان وزیرلشکر مذکور ہے)۔

(۱۹) تاریخ: ۸۹۴ھ ہجری مطابق ۱۴۸۹ء عیسوی۔۔۔۔۔بادشاہ: سیف الدین فیروز شاہ دوم۔۔۔۔۔مقام: ممکنہ طور پر یہ کتبہ گوامالتی، گور کی کسی مسجد سے دریافت کیا گیا ہے۔۔۔۔حوالہ: (الف) بلوچ مین، جرنل آف دی ایشیا ٹک سوسائٹی آف بنگال، ۱۸۷۴ء، ص:۲۹۹۔ (ب) رَونشا، گور۔ص:۴۷، اور پلیٹ ۴۸، نمبر ۷۔

(۲۰) تاریخ: [۔۔]۸ھ ہجری مطابق۔۔۔۔۔بادشاہ: سیف الدین فیروز شاہ دوم۔۔۔۔۔مقام: ای، وی، ویسٹ میکوٹ نے کٹرہ، اولڈ مالدہ سے یہ کتبہ دریافت کیا تھا۔ اب تو یہ گم شدہ ہے تاہم اس کی ایک نقل رَونشا کی ''گور'' میں ملاحظہ کر سکتے ہیں۔۔۔۔۔حوالہ: (الف) بلوچ مین، جرنل آف دی ایشیا ٹک سوسائٹی آف بنگال، ۱۸۷۴ء، ص: ۲۹۹/تا۳۰۰۔ (ب) رَونشا، گور۔ص:۶۷، اور پلیٹ ۴۹، نمبر ۸۔

(۲۱) تاریخ: ۸۹۶ھ ہجری مطابق ۱۴۹۰ء عیسوی۔۔۔۔بادشاہ: ناصر الدین محمود شاہ دوم۔۔۔۔مقام: چلہ خانہ، چھوٹی درگاہ، پنڈوہ کے اوپر بائیں جانب۔۔۔۔۔حوالہ: (الف) بلوچ مین، جرنل آف دی ایشیا ٹک سوسائٹی آف بنگال، ۱۸۷۳ء، ص: ۲۸۹، اور پلیٹ ۷، نمبر ۳۔ (ب) کیونگھم، آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا، ص: ۸۴۔ (ج) رَونشا، گور۔ص:۶۷، اور پلیٹ ۴۹، نمبر ۸ (د) تذکرۂ گورو پنڈوہ، زیرِعنوان: چلہ خانہ شیخ نور قطب العالم۔

(۲۲) تاریخ: ۸۹۸ھ ہجری (ربیع الاول) مطابق ۱۴۹۳ء عیسوی۔۔۔۔ بادشاہ: شمس الدین مظفر شاہ۔۔۔۔مقام: یہ کتبہ گور کے جنوب مشرق میں ۲۰/میل دور مہانندا کے کنارے پر واقع نواب گنج سے دریافت کیا گیا ہے، تاہم امکانی طور پر یہ کتبہ عہد ماضی میں گور کی ایک مسجد سے منتقل کیا گیا تھا جس مسجد کے بارے میں ریاضؔ میں یہ ریکارڈ ہے کہ اس کی تعمیر شمس الدین مظفر شاہ نے کرائی تھی۔ اب یہ کتبہ کلکٹر ہاؤس، ضلع مالدہ کے کمپاؤنڈ میں موجود ہے۔ حوالہ: (الف) پروسیڈنگ آف دی ایشیا ٹک سوسائٹی آف بنگال، ۱۸۹۰ء، ص: ۲۴۲۔ (ب) تذکرۂ گورو پنڈوہ، زیرِعنوان: شمس الدین مظفر شاہ۔

(۲۳) تاریخ: ۸۹۸ھ ہجری (رمضان المبارک) مطابق ۱۴۹۳ء عیسوی۔۔۔بادشاہ: شمس الدین مظفر شاہ۔ مقام: چلہ خانہ، چھوٹی درگاہ، پنڈوہ کے اوپر نصب شدہ مرکزی کتبہ۔۔۔۔حوالہ: (الف) بلوچ مین، جرنل آف دی ایشیا ٹک سوسائٹی آف بنگال، ۱۸۷۳ء، ص: ۲۹۰، اور پلیٹ ۶، نمبر ۲۔ (ب) رَونشا، گور۔ص: ۷۷۔ (ج) تذکرۂ گورو پنڈوہ، زیرِعنوان: چلہ خانہ شیخ نور قطب العالم (اس کتبہ میں ایک صوفی خانہ کی تعمیر کا ریکارڈ ہے)۔

(۲۴) تاریخ: ۸۹۹ھ ہجری (۱۰/ذی قعدہ) مطابق ۱۴۹۴ء عیسوی۔۔۔۔بادشاہ: علاء الدین حسین شاہ۔ مقام:

درگاہ اولاد سلطان ابراہیم بلخی۔ چالیسا پارہ، اولڈ مالدہ (رالی برادرس کے جیوٹ گڈاؤن کے نزدیک لب روڈ)۔حوالہ: (الف) بلوچ مین، جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ۱۸۷۴ء، ص:۳۰۲۔(ب) رَونشا، گور۔ص:۸۷، پلیٹ ۵۰، نمبر ۱۔(ج) تذکرۂ گورو پنڈوہ، زیرِعنوان: چالیسا پارہ میں پائے جانے والے کتبے (زیرِنظر کتبہ اور سابق الذکر کتبہ کے درمیان تقریباً ۱۴ر مہینے کا فاصلہ ہے)۔

(۲۵) تاریخ: ۹۰۰ھ ہجری مطابق ۱۴۹۵ء عیسوی۔۔۔۔بادشاہ: علاء الدین حسین شاہ۔۔۔۔۔مقام: چھوٹی مسجد، اولڈ مالدہ (اب گم شدہ ہے)۔۔۔۔حوالہ: (الف) بلوچ مین، جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ۱۸۷۳ء، ص:۳۰۲۔(ب) رَونشا، گور۔ص:۸۷، پلیٹ ۵۰، نمبر ۱۱۔(ج) تذکرۂ گورو پنڈوہ، زیرِعنوان: چھوٹی مسجد۔

(۲۶) تاریخ: ۹۰۷ھ ہجری مطابق ۱۵۰۲ء عیسوی۔۔۔۔۔بادشاہ: علاء الدین حسین شاہ۔۔۔۔۔مقام: مدرسہ حسین شاہ، گور۔مگر اب یہ کتبہ انگلش بازار میں ایک مسجد کے باہر نصب کیا ہوا ہے۔۔۔۔۔۔حوالہ: (الف) بلوچ مین ، جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ۱۸۷۴ء، ص:۳۰۳ (ب) رَونشا، گور، ص:۸۰، پلیٹ ۵۱، نمبر ۱۲ (ج) تذکرۂ گورو پنڈوہ، زیرِعنوان: فیروز پور مسجد میں نصب کیا گیا کتبہ۔

(۲۷) تاریخ: ۹۰۹ھ ہجری مطابق ۱۵۰۴ء عیسوی۔۔۔۔۔بادشاہ: علاء الدین حسین شاہ۔۔۔۔۔مقام: فرینکلن نے احاطہ قدم رسول، گور کے دروازہ کے نزدیک اس کتبے کو دریافت کیا تھا۔۔۔۔حوالہ: تذکرۂ گورو پنڈوہ، زیرِعنوان: قدم رسول، نوٹ ۱۔

(۲۸) تاریخ: ۹۱۰ھ ہجری مطابق ۵-۱۵۰۴ء عیسوی۔۔۔۔۔بادشاہ: علاء الدین حسین شاہ۔۔۔۔۔مقام: مسجد مصطفیٰ خان، گیلا باڑی (یہ جگہ انگلش بازار سے ۵ر میل دور مہانندا ندی کے کنارے آباد ہے تاہم ممکنہ طور پر کتبہ گور سے لایا گیا ہے)۔حوالہ: بلوچ مین، جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ۱۸۷۴ء، ص:۳۰۴، (اس کتبے میں ایک دروازے کی تعمیر کا ذکر ہے)۔

(۲۹) تاریخ: ۹۱۰ھ ہجری مطابق ۵-۱۵۰۴ء۔۔۔۔بادشاہ: علاء الدین حسین شاہ۔۔۔۔مقام: یہ کتبہ اس وقت تو حیدر پور، انگلش بازار میونسپلٹی میں نئی تعمیر شدہ ایک مسجد کے دروازہ کے اوپر موجود ہے، تاہم اسے آستانہ حضرت اخی سراج الدین کے نزدیک واقع میر ادل نامی ایک جگہ سے دریافت کیا گیا تھا۔حوالہ: تذکرۂ گورو پنڈوہ، زیرِعنوان: حیدر پور مسجد میں نصب کیا گیا کتبہ۔(اس کتبے میں زائرین تک پانی پہنچانے کے مقصد سے تعمیر کئے گئے ایک سقایہ شیڈ کا ریکارڈ ہے)

(۳۰) تاریخ: ۹۱۱ھ ہجری مطابق ۱۵۰۵ء عیسوی۔۔۔۔۔ بادشاہ: علاء الدین حسین شاہ۔۔۔۔۔ مقام: آستانہ شاہ گدا، اولڈ مالدہ کے دروازہ کے اوپر نصب کیا گیا ہے۔۔۔۔ حوالہ: (الف) بلوچ مین، جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ۱۸۷۳ء، ص: ۲۹۴، (ب) رَونشا، گور۔ص: ۸۲، پلیٹ ۵۲، نمبر ۱۴۔ (ج) تذکرۂ گورو پنڈوہ، زیر عنوان: آستانہ شاہ گدا۔

(۳۱) تاریخ: ۹۱۳ھ ہجری مطابق ۱۵۰۷ء عیسوی۔۔۔۔۔ بادشاہ: علاء الدین حسین شاہ۔۔۔۔ مقام: یہ کتبہ اب امام باڑہ، چک انبیاء، انگلش بازار میں موجود ہے۔۔۔۔۔ حوالہ: (الف) بیوریج، جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ۱۸۹۵ء، ص: ۱۹۸، (ب) تذکرۂ گورو پنڈوہ، زیر عنوان: حسین شاہ کے زمانے کا کتبہ۔

(۳۲) تاریخ: ۹۱۴ھ ہجری مطابق ۱۵۰۸ء عیسوی۔۔۔۔۔ بادشاہ: علاء الدین حسین شاہ۔۔۔۔ مقام: (اولڈ؟) مالدہ کی کسی مسجد سے دریافت کیا گیا ہے۔۔۔۔ حوالہ: بلوچ مین، جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ۱۸۷۴ء، ص: ۳۰۵۔

(۳۳) تاریخ: ۹۱۵ھ ہجری مطابق ۱۵۰۹ء عیسوی۔۔۔۔۔ بادشاہ: علاء الدین حسین شاہ۔۔۔۔۔ مقام: چلہ خانہ، چھوٹی درگاہ، پنڈوہ کے دروازہ کے اوپر نصب شدہ دائیں ہاتھ والا کتبہ۔۔۔۔۔ حوالہ: (الف) کیونِنگھم، آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا، ص: ۸۴ (ب) رونشا، گور۔ص: ۸۲، پلیٹ ۵۲، نمبر ۱۵، (یہاں پر غلطی سے تاریخ ۹۱۱ھ ہجری لکھ دی گئی ہے)۔

(۳۴) تاریخ: ۹۱۶ھ ہجری مطابق ۱۵۱۰ء عیسوی۔۔۔۔ بادشاہ: علاء الدین حسین شاہ۔۔۔۔ مقام: روضہ شیخ اخی سراج الدین، گور کی چہار دیواری پر نصب شدہ بائیں ہاتھ والا کتبہ۔۔۔۔۔ حوالہ: (الف) بلوچ مین، جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال ۱۸۷۳ء، ص: ۲۹۴۔ (ب) کیونِنگھم، آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا، ص: ۷۱۔ (ج) رَونشا، گور۔ص: ۸۶، پلیٹ ۵۳، نمبر ۱۶۔ (د) تذکرۂ گورو پنڈوہ، زیر عنوان: روضہ شیخ اخی سراج الدین عثمان (اس کتبہ میں روضہ کے ایک دروازہ کی تعمیر کا ریکارڈ ہے)۔

(۳۵) تاریخ: ۹۱۶ھ ہجری مطابق ۱۵۱۰ء عیسوی۔۔۔۔ بادشاہ: علاء الدین حسین شاہ۔۔۔۔ مقام: کیونِنگھم نے اس کتبے کو مذکورہ بالا جگہ ہی سے دریافت کیا تھا مگر اب یہ گمشدہ ہے۔۔۔ حوالہ: (الف) کیونِنگھم، آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا۔ص: ۷۱۔ (ب) رونشا، گور۔ص: ۸۶، پلیٹ ۵۴، نمبر ۱۷، (اس کتبہ میں ایک دروازہ کی تعمیر کا ریکارڈ تھا)۔

(۳۶) تاریخ: ۹۱۸ھ ہجری مطابق ۱۵۱۲ء عیسوی۔۔۔۔۔ بادشاہ: علاء الدین حسین شاہ۔۔۔۔ مقام: یہ کتبہ ممکنہ

طور پر گومتی گیٹ سے دریافت کیا گیا تھا مگر اب آستانہ شاہ نعمت اللہ، فیروز پور، سوادِ گور میں موجود ہے۔۔۔۔حوالہ: (الف) ای، آئی۔ج:۲،ص:۲۸۵۔(ب) تذکرۂ گورو پنڈوہ، زیرِعنوان: گومتی گیٹ (ج) کیو تنگھم، آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا،ص:۵۲۔(د) بلوچ مین، جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ۱۸۷۳ء،ص:۲۹۵۔(ر) رَونشا، گور۔ص:۸۸، پلیٹ ۵۵،نمبر ۱۹۔

(۳۷) تاریخ: ۹۱۸ھ ہجری مطابق ۱۵۱۲ء عیسوی۔۔۔۔بادشاہ: علاءالدین حسین شاہ۔۔۔۔۔مقام: ای، وی، ویسٹ میکوٹ نے اس کتبہ کو اولڈ مالدہ کے جنوب میں ایک میل دور مولا ناٹولی میں سراج الدین نامی ایک پیر کی قبر سے دریافت کیا تھا۔حوالہ: (الف) بلوچ مین، جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ۱۸۷۴ء،ص:۳۰۵۔(ب) رَونشا، گور۔ص:۸۶، پلیٹ ۵۴،نمبر ۱۸۔(ج) تذکرۂ گورو پنڈوہ، زیرِعنوان: مزار شاہ لنکا پتی، پارہ شاہ منڈائی۔

(۳۸) تاریخ: ۹۲۳ھ ہجری مطابق ۱۵۱۷ء عیسوی۔۔۔۔۔بادشاہ: علاءالدین حسین شاہ۔۔۔۔مقام: گیلا باڑی، انگلش بازار کے نزدیک موجود 'مسجد دولت نظیر' سے یہ کتبہ دریافت کیا گیا تھا۔۔۔۔۔حوالہ: (الف) بلوچ مین، جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ۱۸۷۴ء،ص:۳۰۶۔(ب) رَونشا، گور۔ص:۸۸، پلیٹ ۵۵،نمبر ۲۰۔

(۳۹) تاریخ: گمشدہ۔۔۔۔بادشاہ: علاءالدین حسین شاہ۔۔۔۔مقام: مادھی پور مسجد، گور۔۔۔۔۔حوالہ: ای، آئی۔، ج:۲، پی، ہارن، ص:۲۸۸، (اس کتبے میں ملک یزید معظم ظفر خان ولد ملک۔۔۔نامی ایک شخص کے ذریعے ایک مسجد کی تعمیر کا ریکارڈ ہے)۔

(۴۰) تاریخ: ۹۲۶ھ ہجری مطابق ۱۵۲۰ء عیسوی۔۔۔۔بادشاہ: ناصرالدین نصرت شاہ۔۔۔۔مقام: یہ کتبہ داخل دروازہ، گور کے پاس دریافت کیا گیا تھا، اب گومتی گیٹ میوزیم میں موجود ہے۔۔۔۔۔حوالہ: (الف) ایپگرافیا اِنڈو -موز لے میکا، ۱۹۱۱-۱۲ء، جی، یزدانی۔ص:۵،۶، پلیٹ ۳۱۔(ب) تذکرۂ گورو پنڈوہ، زیرِعنوان: داخل دروازہ یا قلعے کا صدر دروازہ۔

(۴۱) تاریخ: ۹۳۰ھ ہجری مطابق ۱۵۲۴ء عیسوی۔۔۔۔۔بادشاہ: ناصرالدین نصرت شاہ۔۔۔۔۔مقام: ای، وی، ویسٹ میکوٹ نے اس کتبے کو (مع کتبہ نمبر ۳۷) اولڈ مالدہ کے نزدیک واقع مولا ناٹولی سے دریافت کیا تھا۔حوالہ: (الف) بلوچ مین، جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ۱۸۷۴ء،ص:۸-۳۰۷۔(ب) رَونشا، گور۔ص:۹۰، پلیٹ ۵۶،نمبر ۲۱۔(اس کتبے میں کسی مسجد کے دروازے کی تعمیر کا ریکارڈ ہے)۔

(۴۲) تاریخ: ۹۳۱ھ ہجری مطابق ۲۵-۱۵۲۴ء عیسوی۔۔۔۔۔بادشاہ: ناصرالدین نصرت شاہ۔۔۔۔۔مقام:

روضہ حضرت اخی سراج الدین، گور کی چہار دیواری پر دائیں ہاتھ والا کتبہ۔۔۔۔۔حوالہ: تذکرۂ گوروپنڈوہ، زیرِعنوان: روضہ شیخ اخی سراج الدین عثمان۔(اس کتبہ میں روضہ کے ایک دروازے کی تعمیر کا ریکارڈ ہے)

(۴۳) **تاریخ:** ۹۳۲ھ ہجری مطابق ۱۵۲۶ء عیسوی۔۔۔**بادشاہ:** ناصرالدین نصرت شاہ۔۔۔**مقام:** فرینکلن نے ۱۸۱۰ء میں ریکارڈ کیا ہے کہ یہ کتبہ اُن دنوں سونا مسجد، گور میں ہوا کرتا تھا۔۔۔۔۔۔**حوالہ:** (الف) کیوننگھم، آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا، ص: ۶۷۔ (ب) رَونشا، گور۔ص: ۱۵۔ (ج) تذکرۂ گوروپنڈوہ، زیرِعنوان: بارہ دواری یا پرشکوہ سونا مسجد، رام کلی۔

(۴۴) **تاریخ:** ۹۳۳ھ ہجری مطابق ۱۵۲۷ء عیسوی۔۔۔**بادشاہ:** ناصرالدین نصرت شاہ۔۔۔۔۔**مقام:** گور کی کسی مسجد سے دریافت کیا گیا تھا، اب اندین میوزیم، کلکتہ میں موجود ہے۔۔۔۔**حوالہ:** بلوچ مین، جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ۱۸۷۴ء، ص: ۳۰۷۔

(۴۵) **تاریخ:** ۹۳۴ھ ہجری مطابق ۱۵۲۸ء عیسوی۔۔۔**بادشاہ:** ناصرالدین نصرت شاہ۔۔۔**مقام:** یہ کتبہ چلہ خانہ شیخ جلال تبریزی، دیوتلہ کے اندر موجود ہے۔۔۔**حوالہ:** تذکرۂ گوروپنڈوہ، زیرِعنوان: دیوتلہ یا قصبہ تبریز آباد۔

(۴۶) **تاریخ:** ۹۳۵ھ ہجری مطابق ۱۵۲۸-۲۹ء عیسوی۔۔۔**بادشاہ:** ناصرالدین نصرت شاہ۔۔۔۔**مقام:** یہ کتبہ اولڈ مالدہ کے جنوب میں ڈیڑھ میل دور شاہ ابراہیم چیتن لنکا پتی، پارہ شاہ منڈائی کی قبر پر موجود ہے۔۔۔۔۔**حوالہ:** (الف) بلوچ مین، جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ۱۸۷۴ء، ص: ۳۰۷-۸۔ (ب) رَونشا، گور۔ص: ۹۰، پلیٹ ۵۶، نمبر ۲۲۔ (ج) تذکرۂ گوروپنڈوہ، زیرِعنوان: مزار شاہ لنکا پتی، پارہ شاہ منڈائی۔(اس کتبے میں کسی مسجد کے ایک دروازے کی تعمیر کا ریکارڈ ہے)

(۴۷) **تاریخ:** ۹۳۷ھ ہجری مطابق ۱۵۳۰ء عیسوی۔۔۔۔**بادشاہ:** ناصرالدین نصرت شاہ۔۔۔۔**مقام:** آستانہ قدم رسول، گور۔**حوالہ:** (الف) بلوچ مین، جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ۱۸۷۲ء، ص: ۳۳۸۔ (ب) کیوننگھم، آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا، ص: ۵۵۔ (ج) رَونشا، گور۔ص: ۹۲، پلیٹ ۵۷، نمبر ۲۳۔ (د) ای، آئی، ج: ۲، ص: ۲۸۶۔ (ر) تذکرۂ گوروپنڈوہ، زیرِعنوان: قدم رسول۔

(۴۸) **تاریخ:** ۹۳۸ھ ہجری مطابق ۱۵۳۱-۳۲ء عیسوی۔۔۔۔۔۔**بادشاہ:** ناصرالدین نصرت شاہ۔۔۔۔۔**مقام:** چالیسا پارہ، اولڈ مالدہ میں سید شاہ کی قبر پر موجود ہے۔۔۔۔**حوالہ:** (الف) بلوچ مین، جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ۱۸۷۴ء، ص: ۳۰۸، (ب) رونشا، گور ص: ۹۴، پلیٹ ۵۸، نمبر ۲۴۔ (ج) کیوننگھم، آرکیالوجیکل سروے

آف انڈیا،ص:۳۷، (د) تذکرۂ گور و پنڈوہ، زیرِعنوان: چالیسا پارہ میں پائے جانے والے کتبے۔ (اس کتبے میں بوا مالتی نامی ایک عورت کے ذریعے پینے کے پانی کا ایک شیڈ مہیا کرانے کا ریکارڈ ہے)

(۴۹) تاریخ: ۹۴۱ھ ہجری مطابق ۳۵-۱۵۳۴ءعیسوی۔۔۔۔۔بادشاہ: غیاث الدین محمود شاہ۔۔۔۔۔مقام: جہانیاں مسجد، گور۔۔۔حوالہ: (الف) بلوچ مین، جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف انڈیا ۱۸۷۲ء، ص: ۴۰-۳۳۹، (ب) کیونگھم، آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا، ص:۳۷۔ (ج) رَونشا، گور، ص:۱۰، پلیٹ ۵۸، نمبر۲۵۔ (د) تذکرۂ گور و پنڈوہ، زیرِعنوان: جہانیاں مسجد۔ (ایسا لگتا ہے کہ اس مسجد کی تعمیر بھی بی بی مالتی نامی اُسی خاتون نے کرائی ہے جس نے آخرالذکر کتبے میں بیان شدہ پینے کے پانی کا شیڈ مہیا کرایا تھا)

(۵۰) تاریخ: ۹۴۱ھ ہجری مطابق ۳۵-۱۵۳۴ءعیسوی۔۔۔۔۔بادشاہ: غیاث الدین محمود شاہ[؟]۔۔۔۔مقام: یہ کتبہ اب انڈین میوزیم میں چار پینلوں پر موجود ہے، اور غالباً روضہ حضرت اخی سراج الدین، گور سے دریافت کیا گیا ہے۔۔۔۔۔حوالہ: (الف) کیونگھم، آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا، ص:۲۷، پلیٹ ۲۰۔ (ب) تذکرۂ گور و پنڈوہ، زیرِعنوان: روضہ شیخ اخی سراج الدین عثمان، نوٹ ۱۔

(۵۱) تاریخ: ۹۴۳ھ ہجری مطابق ۱۵۳۶ءعیسوی۔۔۔۔بادشاہ: غیاث الدین محمود شاہ۔۔۔۔۔مقام: اولڈ مالدہ کے جنوب میں واقع شاہ پور کے نزدیک ایک جنگل سے منشی الٰہی بخش نے اس کتبے کو دریافت کیا تھا۔۔۔حوالہ: بیوریج، جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ۱۸۹۵ء، ص: ۱۵-۲۱۴۔ (اس کتبہ میں غیاث الدین محمود شاہ جو علی العموم عبد شاہ اور عبدالبدر کے نام سے بھی جانا جاتا تھا، کے ذریعے ایک دروازہ کی تعمیر کا ریکارڈ ہے)

(۵۲) تاریخ: ۹۷۸ھ ہجری مطابق ۱۵۷۱ءعیسوی۔۔۔بادشاہ: حضرت اعلیٰ سلیمان کرارانی۔۔۔۔مقام: یہ کتبہ چلہ خانہ شیخ جلال تبریزی، دیوتلہ کے دروازہ کے اوپر موجود ہے۔۔۔۔حوالہ: (الف) بلوچ مین، جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ۱۸۷۴ء، ص:۲۹۷۔ (ب) تذکرۂ گور و پنڈوہ، زیرِعنوان: دیوتلہ یا قصبہ تبریز آباد۔

(۵۳) تاریخ: ۹۸۰ھ ہجری مطابق ۱۵۷۳ءعیسوی۔۔۔بادشاہ: حضرت اعلیٰ سلیمان کرارانی یا اس کے لڑکے بایزید کا دورِعروج، مگر کتبہ میں کسی بادشاہ کا نام ذکر نہیں کیا گیا ہے۔۔۔مقام: روضہ شیخ علاءالحق پنڈوی کی چہار دیواری کے دروازہ کے اوپر کتبہ موجود ہے۔۔۔۔۔حوالہ: تذکرۂ گور و پنڈوہ، زیرِعنوان: شیخ علاءالحق۔

(۵۴) تاریخ: ۹۹۰ھ ہجری مطابق ۱۵۸۲ءعیسوی۔۔۔۔۔بادشاہ: اکبر کا دورِ حکومت، مگر کتبے میں کسی بادشاہ کا نام ذکر نہیں کیا گیا ہے۔۔۔۔مقام: یہ کتبہ مسجد قطب شاہی یا سونا مسجد پنڈوہ کے دروازہ کے اوپر موجود ہے۔۔۔۔حوالہ:

(الف) رَونشا، گور، ص:۵۶۔(ب) بیوریج، جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ۱۸۹۵ء، ص:۲۱۶۔(ج) تذکرۂ گوروپنڈوہ، زیرعنوان: مسجد قطب شاہی۔

(۵۵) تاریخ: ۹۹۳ھ ہجری مطابق ۱۵۸۵ء عیسوی۔۔۔۔۔بادشاہ: اکبر کا دورحکومت، مگر کتبے میں کسی بادشاہ کا نام ذکر نہیں کیا گیا ہے۔۔۔۔مقام: کتبہ مسجد قطب شاہی، پنڈوہ کے منبر کے اوپر نصب شدہ ہے۔۔۔۔حوالہ: (الف) رَونشا، گور، ص:۵۶۔(ب) بیوریج، ایضا۔(ج) تذکرۂ گوروپنڈوہ، زیرعنوان: مسجد قطب شاہی۔

(۵۶) تاریخ: ۹۹۳ھ ہجری مطابق ۱۵۸۵ء عیسوی۔۔۔۔۔بادشاہ: اکبر کا دورحکومت، مگر کسی بادشاہ کا نام ذکر نہیں کیا گیا۔۔۔۔مقام: عہد ماضی میں یہ کتبہ ''مسجد قطب شاہی'' ہی کی چہار دیواری کے دروازہ کے اوپر نصب شدہ تھا مگر اب گم شدہ ہے۔حوالہ: تذکرۂ گوروپنڈوہ، زیرعنوان: مسجد قطب شاہی۔

(۵۷) تاریخ: ۱۰۰۴ھ ہجری مطابق ۱۵۹۶ء عیسوی۔۔۔۔بادشاہ: اکبر کا دورحکومت، مگر کسی بادشاہ کا نام ذکر نہیں کیا گیا۔۔۔۔مقام: جامع مسجد یا سونا مسجد، اولڈ مالدہ۔۔۔۔حوالہ: (الف) رَونشا، گور، ص:۴۴۔(یہاں پر رَونشا نے غلطی سے تاریخ کو ۹۷۴ھ ہجری لکھ دیا ہے) یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس مسجد کی تعمیر معصوم نامی اُسی تاجر نے کرائی تھی جس کے بھائی نے اِسی سے متصل کارواں سرائے کو بنایا تھا، ممکنہ طور پر کٹرہ کا بھی یہی مطلب ہوتا ہے۔ (یعنی: شاید، کارواں سرائے: مترجم)۔(ب) تذکرۂ گوروپنڈوہ، زیرعنوان: جامع مسجد۔۔۔بعدازا: چھوٹی مسجد۔

(۵۸) تاریخ: ۱۰۱۷ھ ہجری مطابق ۱۶۰۸ء عیسوی۔۔۔۔بادشاہ: جہانگیر کا دورحکومت، مگر کتبے میں کسی بادشاہ کا نام ذکر نہیں کیا گیا ہے۔۔۔۔مقام: مزارات شیخ علاء الحق وحضرت نور قطب العالم، چھوٹی درگاہ، پنڈوہ کو محیط چہار دیواری میں داخل ہوتے وقت راستہ کے بالکل بائیں جانب نظر آنے والی عنایت اللہ کی قبر پر یہ کتبہ موجود ہے۔حوالہ: تذکرۂ گوروپنڈوہ، زیرعنوان: کالا پتھر۔

(۵۹) تاریخ: ۱۰۲۰ھ ہجری مطابق ۱۶۱۲ء عیسوی۔۔۔۔۔بادشاہ: جہانگیر کا دورحکومت، مگر کتبے میں کسی بادشاہ کا نام ذکر نہیں کیا گیا ہے۔۔۔۔مقام: مزار حضرت نور قطب العالم، چھوٹی درگاہ، پنڈوہ کے سرہانے موجود ایک ستون پر یہ کتبہ نصب شدہ ہے۔۔۔۔حوالہ: تذکرۂ گوروپنڈوہ، زیرعنواں: حضرت نور قطب العالم۔ یہاں فرینکلن کے ذریعے پیش کی گئی تاریخ (۱۰۰۰ھ ہجری) اور متن کی اصلاح کی گئی ہے۔

(۶۰) تاریخ: ۱۰۷۵ھ ہجری مطابق ۱۶۶۴ء عیسوی۔۔۔بادشاہ: شاہ اورنگزیب کا دورحکومت، مگر کتبے میں کسی بادشاہ

کا نام ذکر نہیں کیا گیا ہے۔۔۔۔مقام: جامع مسجد، بڑی درگاہ، پنڈوہ۔۔۔۔۔حوالہ: تذکرۂ گوروپنڈوہ، زیرعنوان: جامع مسجد۔(بڑی درگاہ کی تفصیلات میں: مترجم) اس کتبے میں شاہ نعمت اللہ، فیروز پور، گور کے ذریعے مسجد کی اصلاح ومرمت کا ریکارڈ ہے۔

(۶۱) تاریخ: ۱۰۸۴ھ ہجری مطابق ۱۶۷۳ء عیسوی۔۔۔۔۔**بادشاہ:** شاہ اورنگزیب کا دورحکومت، مگر کتبے میں کسی بادشاہ کا نام ذکر نہیں کیا گیا ہے۔۔۔۔۔**مقام:** بھنڈارخانہ، بڑی درگاہ، پنڈوہ۔۔۔۔**حوالہ:** تذکرۂ گوروپنڈوہ، زیر عنوان: بھنڈارخانہ۔(اس کتبے میں چاندخان نامی ایک شخص کے ذریعے بھنڈارخانہ کی تعمیر کا ریکارڈ ہے)

(۶۲) تاریخ: ۱۰۹۳ھ ہجری مطابق ۱۶۸۲ء عیسوی۔۔۔۔۔**بادشاہ:** شاہ اورنگزیب کا دورحکومت، مگر کتبے میں کسی بادشاہ کا نام ذکر نہیں کیا گیا ہے۔۔۔۔۔**مقام:** تنورخانہ، بڑی درگاہ، پنڈوہ۔۔۔۔**حوالہ:** تذکرۂ گوروپنڈوہ، زیرعنوان :تنورخانہ۔(اس کتبے میں ثناءاللہ نامی ایک شخص کے ذریعے تنورخانہ کی تعمیر کا ریکارڈ ہے۔

(۶۳) تاریخ: ۱۱۳۴ھ ہجری مطابق ۱۷۲۱ء عیسوی۔۔۔۔**بادشاہ:** محمد شاہ کا دورحکومت، مگر کتبے میں کسی بادشاہ کا نام ذکر نہیں کیا گیا ہے۔۔۔۔۔**مقام:** لکھن سینی دالان، بڑی درگاہ، پنڈوہ پر یہ کتبہ لگا ہوا ہے۔۔۔۔۔**حوالہ:** تذکرۂ گور وپنڈوہ، زیرعنوان: لکھن سینی دالان (اس کتبے میں مولوی ہیبت اللہ کے زمانہ تولیت میں آستانہ حضرت شاہ جلال یعنی جامع مسجد کی، کی گئی مرمت کا ریکارڈ ہے)۔

ضمیمہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ج

صاحب ”خورشید جہاں نما“ سید الٰہی بخش الحسینی، انگریز آبادکی حیات وخدمات

﴿ زیرنظر تحریر میں بنیادی طور پر مسٹر ایچ، بیوریج کے تذکرے اور جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ۱۸۹۵ء، ص: ۱۹۴/تا ۲۳۶ میں شائع شدہ ان کی نگارشات سے مدد لی گئی ہے، تاہم خان صاحب عابد علی خانؔ کی ضمنی اطلاعات کو بھی شامل کرلیا گیا ہے ﴾

سید الٰہی بخش ۱۲۴۰ھ مطابق ۱۸۲۴ء میں انگلش بازار کے محلّہ چک انبیاء میں پیدا ہوئے۔ ان کا گھرانہ بالائی صوبوں سے یہاں آیا تھا اور خاندان کے افراد، شاہان بنگال کے ماتحت اونچے اونچے عہدوں پر فائز ہوئے۔ آخرکار امتداد زمانہ یا کسی اور وجہ سے یہ لوگ نقل مکانی کرکے شہر اولڈ مالدہ میں آگئے جہاں اِن لوگوں نے ”بیروزگارٹولہ“ نامی ایک محلّہ میں سکونت اختیار کی۔ بظاہر ایسا لگتا ہے کہ اِسے بیروزگارٹولہ اِس لئے کہتے تھے کہ یہاں بیروزگار لوگوں کی بڑی آبادی تھی۔ یہ محلّہ، مغل ٹولی اور معصوم سوداگر کی مشہور ومعروف مسجد کے پڑوس ہی میں ہوا کرتا تھا۔ بعدازاں یہ لوگ مالدہ کے ایک اور قدیم محلّہ ساک موہن میں آباد ہوئے اور پھر آخرکار انگلش بازار میں اقامت اخیار کرلی۔ مصنف کے دادا مہراللہ کو ویسے تو اولڈ مالدہ میں دفنایا گیا تھا مگر چونکہ مصنف کے والد علی بخش اور خود مصنف انگلش بازار میں پیدا ہوئے اس لئے ایسا لگ رہا ہے کہ وہ (مہراللہ) یہیں انگلش بازار میں رہائش پذیر تھے اور انگریزی حکومت کی ملازمت کرتے تھے۔ سید الٰہی بخش ہمیں خود بتاتے ہیں کہ ان کی پیدائش چک انبیاء نامی محلّہ میں ہوئی تھی۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی انگلش بازار میں گزاری اور یہیں پر ۲/مارچ ۱۸۹۲ء میں ان کی موت واقع ہوئی۔

سید الٰہی بخش اپنی عمر کے آخری ایام میں ضلع اسکول، انگلش بازار میں فارسی کے استاد رہے جہاں انہوں نے اتفاقی طور پر ”تذکرۂ گوروپنڈوہ“ (Memoirs of Gaur and Pandua) کے مصنف کو فارسی اور اردو کی تعلیم دی۔ الٰہی بخش ایک بہت ہی سادہ ذہن انسان اور تاریخ کے ایک پرجوش طالب علم تھے۔ انہوں نے یہ علمی مذاق شاید اپنے دوست اور استاد منشی عبدالکریم سے حاصل کیا تھا جو اپنے وقت میں صاحبِ ریاض السلاطین غلام حسین سلیم کے شاگرد تھے۔ اِس حقیقت کے مدنظر کہ منشی عبدالکریم نے آستانہ مخدوم اخی سراج الدین کے نزدیک واقع قاضی گاؤں یا حضرت نگر میں اپنی پھوپھی کی طرف سے کچھ لگان معاف زمینیں وراثت میں پائی تھیں، یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ بھی گور کا ایک باشندہ بن چکے تھے۔ سید الٰہی بخش نے اپنی تحریر کے صفحہ ۱۴۴/ر میں اپنے ایک مورث اعلی میر کرہان،

جنہوں نے ۱۱۹۹ ہجری مطابق ۱۷۸۴ عیسوی کو اولڈ مالدہ میں وفات پائی تھی، کے مقبرہ کی زیارت کا ذکر کیا ہے۔ ان کی تحریر کا عنوان 'خورشید جہاں نما' دراصل ایک مادۂ تاریخ ہے جس سے ۱۲۷۰ ہجری یا ۱۸۵۳ عیسوی کی تاریخ برآمد ہوتی ہے۔ یہ وہی وقت ہے جب کتاب کی شروعات کی گئی تھی۔ وہ کم وبیش اپنی زندگی کے آخری لمحہ تک اِس کتاب کے ساتھ مشغول رہے، تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بنگال کی تاریخ ۱۲۸۰ھ مطابق ۱۸۶۳ء ہی میں مکمل ہو چکی تھی، کیوں کہ یہی وہ تاریخ ہے جب انہوں نے اپنے تذکرۂ روئیداد کو منظر عام پر پیش کیا تھا۔

حسب معمول، اللہ (عزوجل) اور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تعریف وتوصیف کے ساتھ کتاب کی شروعات ہوتی ہے، پھر آگے بڑھکر مصنف کے استاد اور دوست منشی عبدالکریم کی مدح سرائی کی جاتی ہے۔ ہم تک پہنچی اطلاعات کے مطابق منشی عبدالکریم دراصل باڑھ، ضلع پٹنہ کے ایک باشندہ تھے۔ وہ مالدہ آئے اور صاحبِ ریاض السلاطین غلام حسین کی خدمت میں داخل ہوئے۔ غلام حسین اُن دنوں مسٹر جارج اڈنی کے ماتحت ایک ڈاک منشی یا پوسٹ ماسٹر تھے۔ عبدالکریم کچھ وقت تک ناظر یعنی فوجدار کے بخشی یعنی اسسٹنٹ رہے پھر اس کے بعد ''مختار'' بن گئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ فارسی کے بڑے اچھے عالم تھے، اور مساجد کیلئے ایک یا دو کتبے بھی انہوں نے مرتب کئے تھے جنہیں الٰہی بخش نے نقل کیا ہے۔

'خورشید جہاں' نما کے صفحہ نمبر ۱۱۱ر سے لیکر ۲۲۶ر تک (گوروپنڈوہ وغیرہ سمیت) مالدہ کی سرگزشت بیان کی گئی ہے، اور یقینی طور پر یہی حصہ ۹۲؍۴ر صفحات پر مشتمل کتاب کا بیش بہا اور مفید ترین حصہ ہے۔ مصنف نے وسیع پیمانے پر مقامی معلومات اور اطلاعات بہم پہنچائی تھیں سو انہوں نے کچھ ایسے کتبات اور کچھ ایسی تفصیلات پیش کی ہیں جو میری دانش کے مطابق نہ تو رَونشا کی گور میں، نہ ہی کیوننگھم کے آثاریاتی سروے میں اور نہ ہی کسی اور کی کسی تخلیق میں نظر آتی ہیں۔ میجر اسٹیوارٹ نے غلام حسین کو تعریفوں کا جو تحفہ پیش کیا تھا، یعنی یہ کہ ''انہوں نے عمارتوں پر نصب شدہ کتبات کی تواریخ کو جانچنے پرکھنے میں کافی زیادہ دقتوں کا سامنا کیا ہے''۔۔۔الٰہی بخش تاہنوز ان تعریف وتوصیف کے زیادہ حقدار ہیں۔ بلاشبہ، الٰہی بخش نے بڑی ہی جانفشانی کے ساتھ کام کیا ہے اور گوروپنڈوہ کا متعدد بار دورہ بھی کیا ہے، کیونکہ وہ صرف متعدد کتبات ہی پیش نہیں کرتے بلکہ متعدد عمارتوں کی پیائش بھی پیش کرتے ہیں اور ساتھ ہی کچھ اس طرح کی روایات بھی پیش کرتے ہیں جو صرف ان کے مصادر اور مآخذ وغیرہ ہی سے حاصل کی جاسکتی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ الٰہی بخش کا غلام حسین کے بعد واقع ہونا ایک ایڈوانٹیج تھا تاہم اُن کا سب سے بڑا ایڈوانٹیج یہ تھا کہ وہ انگلش بازار میں پلے بڑھے تھے، جبکہ غلام حسین وہاں اپنی عمر کے آخری ایام ہی میں رونما ہوئے۔

الٰہی بخش اپنے ہاتھوں سے خوبصورت تغرا کتبات کی نقل نویسی کیا کرتے تھے اور انہوں نے بہتیرے خوبصورت کتبات کو اپنے گھر میں جمع کرلیا تھا۔ ان کا کمرہ کھنڈرات کی اُن عکسی تصاویر سے مزین تھا جو مسٹر بیوریج اور اِس باب میں دلچسپی رکھنے والے دگر فرنگیوں کے ذریعے انہیں پیش کی گئی تھیں۔ اُن کے پاس تقریباً ۱۰۰۰ اردو اور فارسی کتابوں کی ایک لائبریری بھی تھی، مگر جب ۱۸۹۷ء کے زلزلہ میں ان کا مکان گر گیا تو تغرا کتبات اور اُن کی کتابیں دونوں ہی (بیش بہا چیزیں) ضائع ہوگئیں۔ خورشید جہاں نما کی اصل کاپی کو اُن کے لڑکے سید علی سجاد نے بائیس ہزاری اسٹیٹ کے متولی کے پاس فروخت کردیا تھا۔ یہ کتاب اب تک امپریئل لائبریری، کلکتہ میں محفوظ ہے۔ الٰہی بخش ''جگت گرو' کے نام سے بھی جانے جاتے تھے، اورانہوں نے پیشن گوئی کی تھی کہ اُن کا 'مینٹل' مجھ پر آگرے گا۔

اے، اے، کے۔

ضمیمہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔د

سلاطین دہلی

پہلا شاہی گھرانہ۔۔۔۔غلام سلاطین:

(۱) قطب الدین ایبک، غلام محمد غوری۔۔۔۔۔ ۶۰۲ھ ہجری تا ۶۰۷ھ ہجری مطابق ۱۲۰۶ء عیسوی تا ۱۲۱۰ء عیسوی۔

(۲) آرام شاہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۶۰۷ھ ہجری مطابق ۱۲۱۰ء عیسوی۔

(۳) شمس الدین التمش۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۶۰۷ھ ہجری تا ۶۳۳ھ ہجری مطابق ۱۲۱۰ء عیسوی تا ۱۲۳۵ء عیسوی۔

(۴) رکن الدین فیروز شاہ اول۔۔۔۔۔۔۔۔ ۶۳۳ھ ہجری تا ۶۳۴ھ ہجری مطابق ۱۲۳۵ء عیسوی تا ۱۲۳۶ء عیسوی۔

(۵) رضیہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۶۳۴ھ ہجری تا ۶۳۷ھ ہجری مطابق ۱۲۳۶ء عیسوی تا ۱۲۳۹ء عیسوی۔

(۶) معزالدین بہرام شاہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۶۳۷ھ ہجری تا ۶۳۹ھ ہجری مطابق ۱۲۳۹ء عیسوی تا ۱۲۴۱ء عیسوی۔

(۷) علاء الدین مسعود شاہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۶۳۹ھ ہجری تا ۶۴۴ھ ہجری مطابق ۱۲۴۱ء عیسوی تا ۱۲۴۶ء عیسوی۔

(۸) ناصر الدین محمود شاہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۶۴۴ھ ہجری تا ۶۶۴ھ ہجری مطابق ۱۲۴۶ء عیسوی تا ۱۲۶۵ء عیسوی۔

(۹) غیاث الدین بلبن۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۶۶۴ھ ہجری تا ۶۸۶ھ ہجری مطابق ۱۲۶۵ء عیسوی تا ۱۲۸۷ء عیسوی۔

(۱۰) معزالدین کیقباد۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۶۸۶ھ ہجری تا ۶۸۹ھ ہجری مطابق ۱۲۸۷ء عیسوی تا ۱۲۹۰ء عیسوی۔

دوسرا شاہی گھرانہ۔۔۔۔۔خلجی:

(۱) جلال الدین فیروز شاہ دوم۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۶۸۹ہجری تا ۶۹۵ہجری مطابق ۱۲۹۰عیسوی تا ۱۲۹۵عیسوی۔

(۲) رکن الدین ابراہیم شاہ اول۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۶۹۵ہجری مطابق ۱۲۹۵عیسوی۔

(۳) علاء الدین محمد شاہ اول۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۶۹۵ہجری تا ۷۱۵ہجری مطابق ۱۲۹۵عیسوی تا ۱۳۱۵عیسوی۔

(۴) شہاب الدین عمر شاہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۷۱۵ہجری تا ۷۱۶ہجری مطابق ۱۳۱۵عیسوی تا ۱۳۱۶عیسوی۔

(۵) قطب الدین مبارک شاہ اول۔۔۔۔۔۔۔۔۔۷۱۶ہجری ۷۲۰ہجری مطابق ۱۳۱۶عیسوی تا ۱۳۲۰عیسوی۔

ناصر الدین خسرو شاہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۷۲۰ہجری مطابق ۱۳۲۰عیسوی۔

تیسرا شاہی گھرانہ۔۔۔۔۔تغلق:

(۱) غیاث الدین تغلق شاہ اول۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۷۲۰ہجری تا ۷۲۵ہجری مطابق ۱۳۲۰عیسوی تا ۱۳۲۵عیسوی۔

(۲) محمد تغلق دوم۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۷۲۵ہجری تا ۷۵۲ہجری مطابق ۱۳۲۵عیسوی تا ۱۳۵۱عیسوی۔

(۳) فیروز شاہ سوم۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۷۵۲ہجری تا ۷۹۰ہجری مطابق ۱۳۵۱عیسوی تا ۱۳۸۸عیسوی۔

(۴) تغلق شاہ دوم۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۷۹۰ہجری تا ۷۹۱ہجری مطابق ۱۳۸۸عیسوی۔۔

(۵) ابوبکر شاہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۷۹۱ہجری تا ۷۹۲ہجری مطابق ۱۳۸۸عیسوی تا ۱۳۸۹عیسوی۔

(۶) محمد شاہ سوم۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۷۹۲ہجری تا ۷۹۵ہجری مطابق ۱۳۸۹عیسوی تا ۱۳۹۲عیسوی۔

(۷) سکندر شاہ اول۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۷۹۵ہجری مطابق ۱۳۹۲عیسوی۔

(۸) محمود شاہ دوم۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۷۹۵ہجری تا ۷۹۷ہجری مطابق ۱۳۹۲عیسوی ۱۳۹۴عیسوی۔

(۹) نصرت شاہ (تخت سلطنت کے خالی رہنے کا وقت)۔۔۔ ۷۹۷ہجری تا ۸۰۲ہجری مطابق ۱۳۹۴عیسوی تا ۱۳۹۹عیسوی۔

(۱۰) محمود شاہ دوم (دوبارہ قائم شدہ)۔۔۔ ۸۰۲ہجری تا ۸۱۵ہجری مطابق ۱۳۹۹عیسوی تا ۱۴۱۲عیسوی۔

دولت خان لودھی (اپنے نام سے کوئی سکہ جاری نہیں کیا)۔۔۔ ۸۱۵ہجری تا ۸۱۷ہجری مطابق ۱۴۱۲عیسوی تا ۱۴۱۴عیسوی۔

چوتھا شاہی گھرانہ۔۔۔۔ سید:

(۱) خضر خان (اپنے نام سے کوئی سکہ جاری نہیں کیا)۔۔۔ ۸۱۷ہجری تا ۸۲۴ہجری مطابق ۱۴۱۴عیسوی تا ۱۴۲۱عیسوی۔

(۲) معزالدین مبارک شاہ دوم۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۸۲۴ہجری تا ۸۳۷ہجری مطابق ۱۴۲۱عیسوی تا ۱۴۳۳عیسوی۔

(۳) محمد شاہ چہارم۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۸۳۷ہجری تا ۸۴۷ہجری مطابق ۱۴۳۳عیسوی تا ۱۴۴۳عیسوی۔

(۴) عالم شاہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۸۴۷ہجری تا ۸۵۵ہجری مطابق ۱۴۴۳عیسوی تا ۱۴۵۱عیسوی۔

پانچواں شاہی گھرانہ۔۔۔۔ لودھی:

(۱) بہلول لودھی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۸۵۵ہجری تا ۸۹۴ہجری مطابق ۱۴۵۱عیسوی تا ۱۴۸۸عیسوی۔

(۲) سکندر دوم ولد بہلول۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۸۹۴ہجری تا ۹۲۳ہجری مطابق ۱۴۸۸عیسوی تا ۱۵۱۷عیسوی۔

(۳) ابراہیم دوم ولد سکندر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۹۲۳ہجری تا ۹۳۲ہجری مطابق ۱۵۱۷عیسوی تا

۱۵۲۶ءعیسوی۔

مغل بابر کا حملہ اور پانی پت میں ابراہیم دوم کی موت ---------------- ۹۳۲ھ ہجری مطابق ۱۵۲۶ء عیسوی۔

(۱) بابر --------------------------- ۹۳۲ھ ہجری تا ۹۳۷ھ ہجری مطابق ۱۵۲۶ء عیسوی تا ۱۵۳۱ء عیسوی۔

(۲) ہمایون --------------------------- ۹۳۷ھ ہجری تا ۹۴۷ھ ہجری مطابق ۱۵۳۱ء عیسوی تا ۱۵۴۰ء عیسوی۔

چھٹا شاہی گھرانہ ----- افغان (سوری)

(۱) فریدالدین شیر شاہ ------------------ ۹۴۶ھ ہجری تا ۹۵۲ھ ہجری مطابق ۱۵۳۹ء عیسوی تا ۱۵۴۵ء عیسوی۔

(۲) اسلام شاہ ولد شیر شاہ ---------------- ۹۵۲ھ ہجری تا ۹۶۰ھ ہجری مطابق ۱۵۴۵ء عیسوی تا ۱۵۵۲ء عیسوی۔

(۳) محمد عادل شاہ ------------------ ۹۶۰ھ ہجری تا ۹۶۴ھ ہجری مطابق ۱۵۵۲ء عیسوی تا ۱۵۵۶ء عیسوی۔

(۴) ابراہیم سوم ------------------ ۹۶۱ھ ہجری تا ۹۶۲ھ ہجری مطابق ۱۵۵۳ء عیسوی تا ۱۵۵۴ء عیسوی۔

(۵) سکندر شاہ سوم ------------------ ۹۶۲ھ ہجری مطابق ۱۵۵۴ء عیسوی۔

(نمبر ۴ / اور نمبر ۵ / یعنی ابراہیم سوم اور سکندر شاہ سوم، دونوں ہی عادل شاہ کے حریف رہے)

ساتواں شاہی گھرانہ ----- مغل:

(۲) ہمایون (دوبارہ) --------------- ۹۶۲ھ ہجری تا ۹۶۳ھ ہجری مطابق ۱۵۵۵ء عیسوی تا ۱۵۵۶ء عیسوی۔

(۳) اکبر ------------------------ ۹۶۳ھ ہجری مطابق ۱۵۵۶ء عیسوی۔

(۴) جہانگیر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۰۱۴ھ ہجری مطابق ۱۶۰۵ء عیسوی۔

(۵) شاہجہاں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۰۳۷ھ ہجری مطابق ۱۶۲۸ء عیسوی۔

(۶) اورنگزیب عالمگیر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۰۶۸ھ ہجری مطابق ۱۶۵۸ء عیسوی۔

(۷) شاہ عالم اول بہادر شاہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۱۱۹ھ ہجری مطابق ۱۷۰۷ء عیسوی۔

(۸) جہاندار شاہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۱۲۴ھ ہجری مطابق ۱۷۱۲ء عیسوی۔

(۹) فرخ سیر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۱۲۴ھ ہجری مطابق ۱۷۱۲ء عیسوی۔

(۱۰) رفیع الدرجات۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۱۳۱ھ ہجری مطابق ۱۷۱۹ء عیسوی۔

(۱۱) شاہجہاں دوم (رفیع الدولہ)۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۱۳۱ھ ہجری مطابق ۱۷۱۹ء عیسوی۔

(محمد شاہ وغیرہ۔۔۔۔۔ ۱۱۳۱ھ ہجری مطابق ۱۷۱۹ء عیسوی۔۔تا۔۔۔ ۱۱۶۱ھ ہجری مطابق ۱۷۴۸ء عیسوی)

ضمیمہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ر

﴿بنگال کی تسخیر اسلامی سے لیکر اکبر کے حتمی انسلاک تک فرماں روان بنگال کی فہرست﴾

گورنرز:

(۱) محمد بختیار خلجی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۵۹۹ہجری تا ۶۰۲ھ ہجری مطابق ۱۲۰۲ءعیسوی تا ۱۲۰۵ءعیسوی۔

(۲) عزالدین محمد شیران۔۔۔۔۔۔۔۔۔۶۰۲ھ ہجری تا ۶۰۵ھ ہجری مطابق ۱۲۰۵ءعیسوی تا ۱۲۰۸ءعیسوی۔

(۳) علاءالدین علی مردان۔۔۔۔۔۔۔۔۶۰۵ھ ہجری تا ۶۰۸ھ ہجری مطابق ۱۲۰۸ءعیسوی تا ۱۲۱۱ءعیسوی۔

(۴) حسام الدین......غیاث الدین عیاض، (اِس نے اپنے نام پر سکے جاری کئے تھے)۔۔۔۔۔۔۔۔۔۶۰۸ھ ہجری تا ۶۲۴ھ ہجری مطابق ۱۲۱۱ءعیسوی تا ۱۲۲۶ءعیسوی۔

(۵) ناصر الدین محمود (سلطان التمش کا دوسرا بیٹا)۔۔۔۔۔۔۶۲۴ھ ہجری تا ۶۲۷ھ ہجری مطابق ۱۲۲۶ءعیسوی تا ۱۲۲۹ءعیسوی

(۶) عزالملک علاءالدین جانی۔۔۔۔۔۔۔۶۲۷ھ ہجری مطابق ۱۲۲۹ءعیسوی۔

(۷) سیف الدین ایبک۔۔۔۔۔۔۔۔۔۶۲۷ھ ہجری تا ۶۳۱ھ ہجری مطابق ۱۲۲۹ءعیسوی تا ۱۲۳۳ءعیسوی۔

(۸) عزالدین تغرل تغان خان۔۔۔۔۔ ۶۳۱ھ ہجری تا ۶۴۲ھ ہجری مطابق ۱۲۳۳ءعیسوی تا ۱۲۴۴ءعیسوی۔

(۹) قمر الدین تیمور خان قیران۔۔۔۔۔۶۴۲ھ ہجری تا ۶۴۴ھ ہجری مطابق ۱۲۴۴ءعیسوی تا ۱۲۴۶ءعیسوی۔

(۱۰) اختیار الدین ازبک تغرل خان مجلس الدین (اپنے نام پر سکے جاری کروائے)۔۔۔۔۔۔۔۶۴۴ھ ہجری تا [؟] ۶۴۶ھ ہجری مطابق ۱۲۴۶ءعیسوی تا [؟] ۱۲۴۸ءعیسوی۔

(۱۱) جلال الحق والدین مسعود شاہ جانی۔۔۔۔۔ ۶۴۶ھ ہجری تا [؟] ۶۵۷ھ ہجری مطابق ۱۲۴۸ءعیسوی تا [؟] ۱۲۵۸ءعیسوی۔

(۱۲) عزالدین بلبن ازبک۔۔۔۔۔۔ ۶۵۷ھ ہجری تا ۶۵۹ھ ہجری مطابق ۱۲۵۸ءعیسوی تا ۱۲۶۰ءعیسوی۔

(۱۳) محمد ارسلان تا تار خان۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۶۵۹ھ ہجری تا [؟] ۶۶۴ھ ہجری مطابق ۱۲۶۰ءعیسوی تا [؟] ۱۲۶۵ءعیسوی۔

(۱۴) شیر خان۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔تاریخ: مشتبہ یا غیر معین

(۱۵)امین خان۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔تاریخ: مشتبہ یا غیر معین

(۱۶)مغیث الدین تغرل۔۔۔۔۔۔۔ ۶۷۷ہجری تا ۶۸۲ہجری مطابق ۱۲۷۸عیسوی تا ۱۲۸۳عیسوی۔

خاندان بلبن کے سلاطین:

(۱)ناصرالدین بغراخان ولد غیاث الدین بلبن، دہلی (کسی بھی سکے کا اِس کے نام پر جاری ہونا معلوم نہیں ہے) ۔۔۔۶۸۲ہجری تا ۶۹۰ہجری مطابق ۱۲۸۳عیسوی تا ۱۲۹۱عیسوی۔

(۲)رکن الدین کیکاؤس ولد غیاث الدین بلبن (لکھنوتی)۔۔۔۔۔۶۹۰ہجری تا ۷۰۱ہجری مطابق ۱۲۹۱عیسوی ۱۳۰۱عیسوی۔

(۳)شمس الدین فیروز شاہ ولد غیاث الدین بلبن (لکھنوتی)۔۔۔۔۔۷۰۱ہجری تا ۷۲۲ہجری مطابق ۱۳۰۱عیسوی تا ۱۳۲۲عیسوی۔

(۴)جلال الدین محمود شاہ ولد شمس الدین فیروز شاہ (لکھنوتی)۔۔۔۔۔۔۔۷۰۹یا ۷۰۹ہجری مطابق ۹یا ۱۳۰۹عیسوی۔

(۵)شہاب الدین بغرا شاہ ولد شمس الدین فیروز شاہ (لکھنوتی، مغربی بنگال کا مشترک حکمراں)۔۷۱۷ہجری تا ۷۱۸ہجری مطابق ۱۳۱۷عیسوی تا ۱۳۱۸عیسوی۔

(۶)الف: غیاث الدین بہادر شاہ ولد شمس الدین فیروز شاہ (بنگال کا مشترک حکمراں)۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۷۱۰ہجری تا ۷۲۲ہجری مطابق ۱۳۱۰عیسوی تا ۱۳۲۲عیسوی۔

(۶)ب: غیاث الدین بہادر شاہ ولد شمس الدین فیروز شاہ (حکمراں کل بنگال)۔۔۔۔۔ ۷۲۲ہجری تا ۷۲۳ہجری مطابق ۱۳۲۲عیسوی تا ۱۳۲۳عیسوی۔

(غیاث الدین تغلق، دہلی کی فتح ثانی کا واقعہ)

(۷)ناصرالدین ابراہیم ولد شمس الدین فیروز شاہ (سلطان لکھنوتی)۔۔۔۔۔۔۔ ۷۲۴ہجری تا ۷۲۶ہجری مطابق ۱۳۲۴عیسوی تا ۱۳۲۶عیسوی۔

(۶)ج: غیاث الدین بہادر شاہ (بحال شدہ۔۔۔غالبًا مشرقی بنگال میں، تاہم ابراہیم کی موت کے بعد جب تک کہ اُس نے بغاوت نہیں کی اور نتیجے میں محمد تغلق نے اُسے ذبح نہیں کر دیا، اُس وقت تک اُس نے پورے بنگال میں حکومت کی)۔۔۔۔ ۷۲۵ہجری تا ۷۲۸ہجری مطابق ۱۳۲۵عیسوی تا ۱۳۲۸عیسوی۔

(۸) بہرام (تاتار) خان۔ (مشرقی بنگال کا شاہی کمشنر اور ۹۲۸ھ کے بعد سنارگاؤں کا گورنر [1] ۔۔۔۔ [؟] ۷۲۵ ہجری تا ۷۳۸ ہجری مطابق [؟] ۱۳۲۵ عیسوی تا ۱۳۳۷ عیسوی۔

(۹) قادرخان (گورنر لکھنوتی) ۔۔۔۔۔۔ ۷۲۶ ہجری تا ۷۳۹ ہجری مطابق ۱۳۲۵ عیسوی تا ۱۳۳۸ عیسوی۔

(۱۰) عزالدین اعظم الملک (گورنر ستگاؤں) ۔۔۔ [؟] ۷۲۶ ہجری تا ۷۴۰ ہجری مطابق [؟] ۱۳۲۵ عیسوی تا ۱۳۳۹ عیسوی۔

بنگال کے آزاد سلاطین:

(۱) فخرالدین مبارک شاہ (مشرقی بنگال) ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۷۳۹ ہجری تا ۷۵۰ ہجری مطابق ۱۳۳۸ عیسوی تا ۱۳۴۹ عیسوی۔

(۲) اختیارالدین غازی شاہ (مشرقی بنگال) ۔۔۔۔۔۔۔ ۷۵۰ ہجری تا ۷۵۳ ہجری مطابق ۱۳۴۹ عیسوی تا ۱۳۵۲ عیسوی۔

(۳) علاءالدین علی شاہ (لکھنوتی) ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ [؟] ۷۴۰ ہجری تا ۷۴۶ ہجری مطابق [؟] ۱۳۳۹

1۔ تاریخ کا یہ حساب ہماری سمجھ میں بالکل بھی نہیں آیا۔ ظاہر ہے کہ ۷۲۵ ہجری اور ۹۲۷ ہجری کے درمیان ۲۰۳ رسال کا فاصلہ ہے، اسلئے اگر یہ مان لیا جائے کہ بہرام خان ۷۲۵ ہجری میں مشرقی بنگال کا شاہی کمشنر بنا اور پھر ۹۲۸ ہجری کے بعد سنارگاؤں کا گورنر مقرر ہوا تو بہرام کا بہرحال ۲۰۳ رسال تک زندہ رہنا ضروری ہوگا۔ اچھا! ایسا تو ہو نہیں سکتا کہ وہ پیدا ہوتے ہی کمشنر بن گیا تھا؟ اور حسن ظن کا تقاضا یہ بھی ہے کہ گورنر بننے کے بعد بھی کچھ نہ کچھ دن تو زندہ ہی رہا ہوگا اس لئے کمشنر بننے سے پہلے اور گورنر بننے کے بعد جو عمر بنتی ہے وہ مذکورہ بالا ۲۰۳ رسال پر مستزاد ہوگی۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا بہرام اتنے دنوں تک زندہ تھا؟ اگر تھا اور اتنی لمبی عمر میں جا کر بھی گورنر کے فرائض کو انجام دے رہا تھا تو یہ ایک غیر معمولی بات تھی اور اِسی لئے مؤرخین کو لازمی طور پر چاہئے تھا کہ وہ اِس بات کو ایک مستقل فصل میں کرتے، حالانکہ ہمارے ناقص مطالعہ کی روشنی میں کسی بھی تاریخ نگار نے ایسی کسی بات کو مستقلاً تو کیا؟ ضمناً بھی بیان نہیں کیا ہے۔ اس لئے ہمارا ماننا یہ ہے کہ تاریخ کا یہ حساب صحیح نہیں ہے۔ ممکنہ طور پر یہ بہرام ۷۲۵ ہجری میں شاہی کمشنر بنا اور پھر ۷۲۸ ہجری میں سنارگاؤں کا گورنر کا مقرر کیا گیا، یعنی کمشنر بننے کے تین سال بعد ترقی پا کر وہ ایک خطہ کا گورنر بن گیا۔ (میزان)

عیسوی تا ۱۳۴۵ عیسوی۔

خاندان الیاس شاہ:

(۱)الف: شمس الدین الیاس شاہ (اپنی فرماں روائی کے اولین ۶ ر سال علی شاہ، مغربی بنگال کا حریف رہا۔ ۷۴۰ ہجری تا ۷۵۹ ہجری مطابق ۱۳۳۹ عیسوی تا ۱۳۵۸ عیسوی۔

(۱)ب: اختیار الدین کی موت کے بعد الیاس شاہ پورے بنگال کا حکمراں بن گیا۔۔۔۔ ۷۵۳ ہجری تا ۷۵۹ ہجری مطابق ۱۳۵۲ عیسوی تا ۱۳۵۸ عیسوی۔

(۲) سکندر شاہ اول ولد شمس الدین الیاس شاہ (۷۵۸ ہجری میں سنارگاؤں میں سکے بھی ڈھالے)۔۔ ۷۵۹ ہجری تا ۷۹۲ ہجری مطابق ۱۳۵۸ عیسوی تا ۱۳۹۰ عیسوی۔

(۳) غیاث الدین اعظم شاہ ولد سکندر شاہ۔۔۔۔ ۷۹۲ ہجری تا ۸۱۳ ہجری مطابق ۱۳۹۰ عیسوی تا ۱۴۱۰ عیسوی۔

(۴) سیف الدین ہمزہ شاہ ولد غیاث الدین اعظم شاہ۔۔۔ ۸۱۴ ہجری تا ۸۱۵ ہجری مطابق ۱۴۱۱ عیسوی تا ۱۴۱۲ عیسوی۔

---

(۱) شہاب الدین بایزید شاہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۸۱۵ ہجری تا ۸۱۷ ہجری مطابق ۱۴۱۲ عیسوی تا ۱۴۱۴ عیسوی۔

(۲) علاء الدین فیروز شاہ ولد شہاب الدین بایزید شاہ۔۔۔۔۔ ۸۱۷ ہجری مطابق ۱۴۱۴ عیسوی۔

خاندان راجہ کانس یا گنیش:

(۱)الف: راجہ کانس (بحیثیت بادشاہ گر)۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۸۱۳ ہجری تا ۸۱۷ ہجری مطابق ۱۴۱۰ عیسوی تا ۱۴۱۴ عیسوی۔

(۲)الف: جلال الدین محمد شاہ ولد راجہ کانس۔۔۔۔۔۔۔ ۸۱۸ ہجری تا ۸۱۹ ہجری مطابق ۱۴۱۵ عیسوی تا ۱۴۱۶ عیسوی۔

(۱)ب: راجہ کانس نے اپنے بیٹے کو برطرف کردیا اور خود ''دنوجہ مردانہ دیوا'' کا لقب اختیار کر کے تخت بنگال پر قبضہ جمالیا۔ (سکوں پر ۱۳۳۹ سالِ ساکا، اور ۱۳۴۰ سال ساکا، کی تاریخ درج ہے)۔۔۔ ۸۲۰ ہجری تا ۸۲۱

ہجری مطابق ۱۴۱۷ عیسوی تا ۱۴۱۸ عیسوی۔

(۳) مہیند رادیوا (۱۳۴۰ ساکا) غالبًا ولد راجہ کانس ۔۔۔۔[؟]۸۲۱ ہجری تا ۸۲۲ ہجری مطابق [؟] ۱۴۱۸ عیسوی ۱۴۱۹ عیسوی۔

(۲) ب: جلال الدین محمد شاہ (بحال شدہ) ۔۔۔۔۔۔۔۔ ۸۲۱ ہجری تا ۸۳۵ ہجری مطابق ۱۴۱۸ عیسوی تا ۱۴۳۱ عیسوی۔

(۴) شمس الدین احمد شاہ ولد جلال الدین محمد شاہ ۔۔۔۔ ۸۳۵ ہجری تا ۸۴۶ ہجری مطابق ۱۴۳۱ عیسوی تا ۱۴۴۲ عیسوی۔

خاندان الیاس شاہ دوبارہ اقتدار پر:

(۵) ناصر الدین محمود شاہ اول، الیاس شاہ کی نسل کا ایک فرد ۔۔ ۸۴۶ ہجری تا ۸۶۴ ہجری مطابق ۱۴۴۲ عیسوی تا ۱۴۵۹ عیسوی۔

(۶) رکن الدین باربک شاہ ولد ناصر الدین محمود شاہ ۔۔۔۔۔ ۸۶۴ ہجری تا ۸۷۹ ہجری مطابق ۱۴۵۹ عیسوی تا ۱۴۷۴ عیسوی۔

(۷) شمس الدین یوسف شاہ ولد رکن الدین باربک شاہ ۔۔۔ ۸۷۹ ہجری تا ۸۸۶ ہجری مطابق ۱۴۷۴ عیسوی تا ۱۴۸۱ عیسوی۔

(۸) سکندر شاہ دوم ولد شمس الدین یوسف شاہ ۔۔۔۔۔۔۔ ۸۸۶ ہجری مطابق ۱۴۸۱ عیسوی۔

(۹) جلال الدین فتح شاہ ولد ناصر الدین محمود شاہ اول ۔۔۔۔ ۸۸۶ ہجری تا ۸۹۲ ہجری مطابق ۱۴۸۱ عیسوی تا ۱۴۸۶ عیسوی۔

حبشی سلاطین:

(۱) سلطان شہزادہ باربک ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۸۹۲ ہجری مطابق ۱۴۸۶ عیسوی۔

(۲) سیف الدین فیروز شاہ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۸۹۲ ہجری تا ۸۹۵ ہجری مطابق ۱۴۸۶ عیسوی تا ۱۴۸۹ عیسوی۔

(۳) ناصر الدین محمود شاہ دوم ولد سیف الدین فیروز شاہ ۔۔ ۸۹۵ ہجری تا ۸۹۶ ہجری مطابق ۱۴۸۹ عیسوی تا ۱۴۹۰ عیسوی۔

(۴) شمس الدین مظفر شاہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۸۹۶ھ ہجری تا ۸۹۹ھ ہجری مطابق ۱۴۹۰ء عیسوی تا ۱۴۹۳ء عیسوی۔

خاندان حسین شاہ:

(۱) علاء الدین حسین شاہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۸۹۹ھ ہجری تا ۹۲۵ھ ہجری مطابق ۱۴۹۳ء عیسوی تا ۱۵۱۹ء عیسوی۔

(۲) ناصر الدین نصرت شاہ ولد علاء الدین حسین شاہ۔۔۔ ۹۲۵ھ ہجری تا ۹۳۹ھ ہجری مطابق ۱۵۱۹ء عیسوی تا ۱۵۳۲ء عیسوی۔

(۳) علاء الدین فیروز شاہ دوم ولد ناصر الدین نصرت شاہ۔۔۔۔۔۔ ۹۳۹ھ ہجری مطابق ۱۵۳۲ء عیسوی۔

(۴) غیاث الدین محمود شاہ سوم ولد علاء الدین حسین شاہ۔۔۔ ۹۳۹ھ ہجری تا ۹۴۴ھ ہجری مطابق ۱۵۳۲ء عیسوی تا ۱۵۳۷ء عیسوی۔

(غیاث الدین محمود شاہ سوم نے ۹۳۳ھ ہجری ہی سے نصرت شاہ کے ساتھ مشترک حکومت کی ہے)

ہمایون (مغل بادشاہ)۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۹۴۴ھ ہجری تا ۹۴۶ھ ہجری مطابق ۱۵۳۷ء عیسوی تا ۱۵۳۹ء عیسوی۔

فتح شیر شاہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۹۴۶ھ ہجری مطابق ۱۵۳۹ء عیسوی۔

خاندان محمد سور:

(۱) شمس الدین محمد غازی شاہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۹۶۰ھ ہجری تا ۹۶۲ھ ہجری مطابق ۱۵۵۲ء عیسوی تا ۱۵۵۴ء عیسوی۔

(۲) غیاث الدین بہادر شاہ ولد شمس الدین محمد غازی شاہ۔۔۔ ۹۶۲ھ ہجری تا ۹۶۸ھ ہجری مطابق ۱۵۵۴ء عیسوی تا ۱۵۶۰ء عیسوی۔

(۳) غیاث الدین جلال شاہ ولد شمس الدین محمد غازی شاہ۔۔۔ ۹۶۸ھ ہجری تا ۹۷۱ھ ہجری مطابق ۱۵۶۰ء عیسوی تا ۱۵۶۳ء عیسوی۔

(۴) ولد غیاث الدین جلال شاہ (نام: نامعلوم)۔۔۔۔۔۔۔ ۹۷۱ھ ہجری مطابق ۱۵۶۳ء عیسوی۔

خاندان سلیمان کرارانی:

(۱) حضرت اعلیٰ سلیمان خان کرارانی (حاکم جنوبی بہار، بنگال اور اوڈیشہ)--------- ۹۷۲ھ ہجری تا ۹۸۰ھ ہجری مطابق ۱۵۶۴ء عیسوی تا ۱۵۷۲ء عیسوی۔

(۲) بایزید شاہ ولد سلیمان خان کرارانی---------- ۹۸۰ھ ہجری مطابق ۱۵۷۲ء عیسوی۔

(۳) داؤد شاہ ولد سلیمان خان کرارانی--------- ۹۸۰ھ ہجری تا ۹۸۴ھ ہجری مطابق ۱۵۷۲ء عیسوی تا ۱۵۷۶ء عیسوی۔

اکبر کا حتمی انسلاک-------------------- ۹۸۴ھ ہجری مطابق ۱۵۷۶ء عیسوی۔

مشتملات